قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2017 قیمت ₹15

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

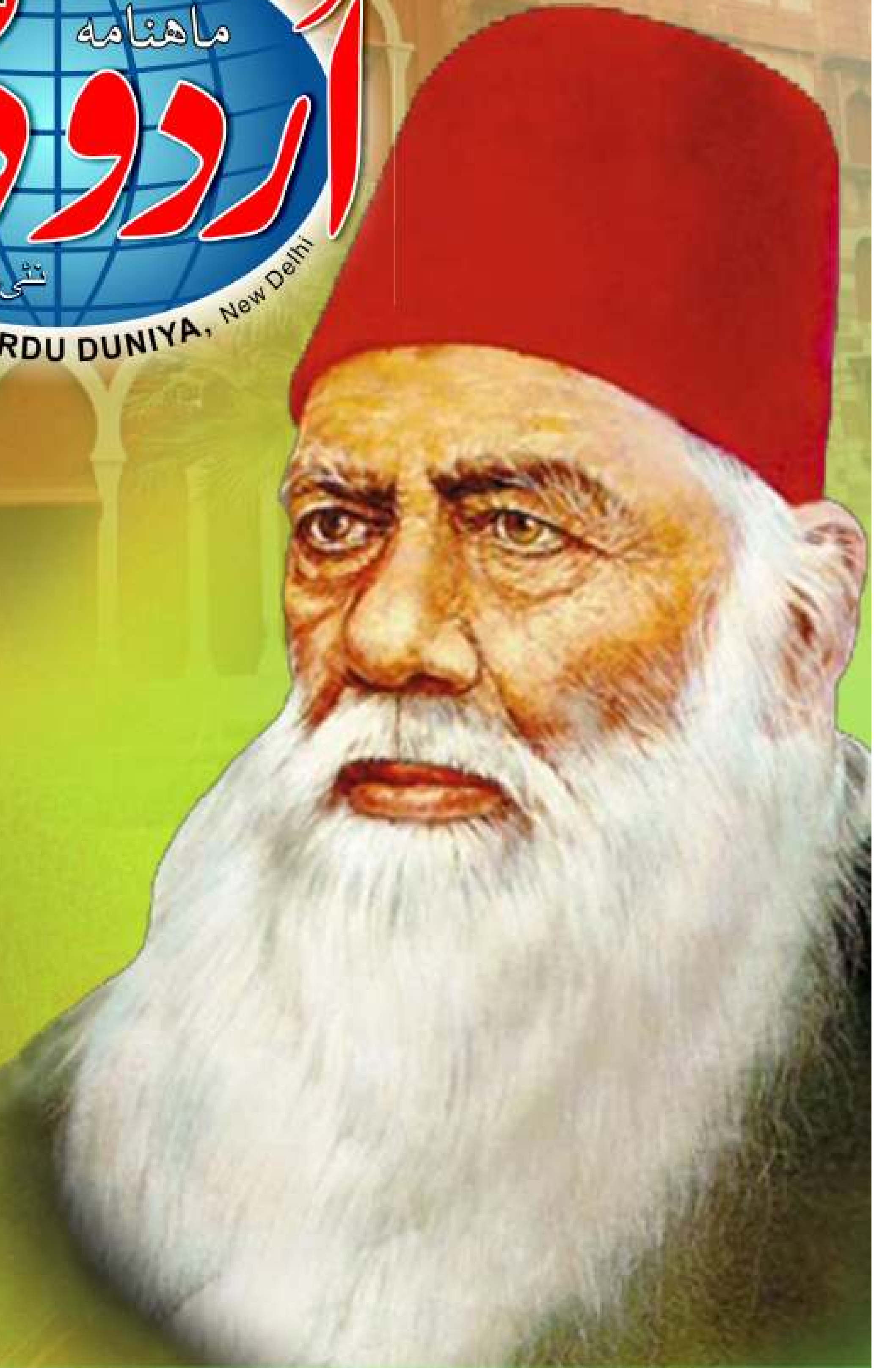

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچّوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

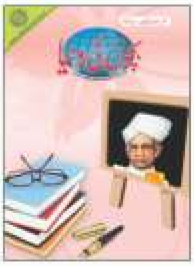

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

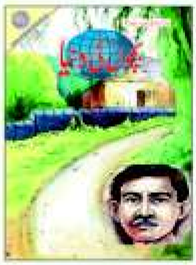

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 19، شمارہ: 10، اکتوبر 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

ادب پڑھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا جارہا ہے: علیم اللہ حالی — فاروق اعظم قاسمی 7

زبان و تعلیم

کیرلہ میں اردو لغت نویسی — ریاض احمد 9

عالمی یونیورسٹی رینکنگ — پی ایف رحمن 12

سرسید کے دو سو سال

گریجویٹ اور تجارت — سرسید احمد خان 19

سرسید اور علی گڑھ کی معنویت — ابراہیم افسر 22

تعلیم نسواں اور سرسید احمد خان — گلشن عبداللہ 25

نقد و نگاہ

روشن خیالی کی تفہیم وتعبیر اور قمر رئیس — سید یحییٰ نشیط 27

انشائیہ: شناخت اور حدود — اسد اللہ 30

حیدرآباد میں اردو افسانہ — رفیعہ سلیم 34

مولوی عبدالحق صفا کے تذکروں کا مختصر جائزہ — محمد عامل خان 37

یادیں باتیں

نثار احمد فاروقی — سید حسنین اختر 40

خاتون خانہ دار: سیدہ فرحت — نزہت مہدی رضوی 43

نگر نگر اردو

اردو کی ادبی وتہذیبی روایت اور الہ آباد — شبنم حمید 45

برہانپور میں اردو کا تابناک ماضی — وسیم افتخار انصاری 48

یاد رفتگاں

ظفر گورکھپوری — اسرار اللہ انصاری 51

خراج عقیدت

عشق دھاگے سے لپٹی نظمیں — شعیب رضا فاطمی 53

عالمی ادب

جین آسٹین: انگریزی کی مایہ ناز ادیبہ — محبوب حسن 55

ایک عرب خاتون کا سفرنامۂ ہند — زرنگار 59

سائنس اور شاعری

کلام غالب میں سائنسی اشارات — محمد اکمل خان 61

پروین شاکر کی شاعری میں سائنسی اصطلاحات — عظیم اللہ ہاشمی 64

نیا آسمان نئے ستارے

الیاس احمد گدی — رضوانہ پروین 67

شہاب نامہ میں ہندوستانی عناصر — شبستاں پروین 70

کمپیوٹر

پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟ 72

کوئز

ادبی کوئز — شیخ عمران 74

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 76

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 87

ہماری بات

اردو زبان وادب کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع رہا ہے۔ دنیا کے بیشتر علوم وفنون ترجمے کے ذریعے اس زبان میں منتقل کیے جاچکے ہیں۔ ماضی میں تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، علم زراعت، فلکیات، ریاضیات اور دیگر سائنسی علوم کی کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ صنعت وحرفت، تجارت اور طب سے متعلق بھی رسائل وجرائد نکلتے رہے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو زبان میں معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ اب جبکہ انٹرنیٹ اور دیگر جدید تکنیکی وسائل کی وجہ سے اطلاعات کی کثرت ہے اور بہت سے نئے علوم وفنون، نظریات اور رجحانات بھی سامنے آرہے ہیں۔ تو اردو زبان کا موضوعی دائرہ پہلے کے مقابلے میں سمٹتا جارہا ہے۔ پہلے مختلف ممالک کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی تاریخ، جغرافیہ اور دیگر سماجی، سیاسی اور اقتصادی علوم کے حوالے سے کتابیں ترتیب دی جاتی تھیں اور آموزش اردو کے لیے مفید اور بہتر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ مگر آج صورت حال بدل گئی ہے۔ بچوں کو اردو سکھانے یا اردو قواعد سے آگاہ کرنے والی کتابیں کم ہیں۔ اس کے وجوہات پر غور کیا جائے تو ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ آج کے زیادہ تر مصنفین ادبی تحریکات، رجحانات اور دیگر مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے بنیادی نوعیت کی کتابیں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ہندوستان کے جو اشاعتی ادارے ہیں وہ بھی اپنے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ جبکہ پہلے کے اشاعتی ادارے اہم اور مفید کتابوں کی اشاعت کو اپنی ترجیحات میں شامل رکھتے تھے۔ ان کا مقصد اردو زبان وادب کی توسیع وترویج تھا۔ ایسے بہت سے اشاعتی ادارے تھے جن کی بیش بہا خدمات رہی ہیں مگر آج کی نسل ان اداروں سے واقف نہیں ہے۔ نول کشور پریس کے بارے میں کچھ لوگوں کو تو پتہ ہے مگر اس کے معاصر اشاعتی اداروں سے آگہی شاید ہی ہو۔ یہ المیہ اس لیے ہے کہ ہم نے مصنفین کی خدمات کا اعتراف تو کیا مگر اشاعتی اداروں کو نظر انداز کردیا۔ اب ضرورت ہے کہ ایسے اشاعتی اداروں کی مکمل اور مفصل تاریخ مرتب کی جائے اور وہاں سے شائع ہونے والی مختلف النوع تصنیفات کے بارے میں نہ صرف لوگوں کو بتایا جائے بلکہ ان اداروں کی اہم اور مفید تصانیف کی اشاعت ثانی کا اہتمام بھی کیا جائے۔ اس طرح ہمارا علمی، ثقافتی، تاریخی، ادبی سرمایہ آج کی نسل تک منتقل ہوگا۔ نئے دور میں ہمیں پرانی کتابوں کی شدید ضرورت ہے کیونکہ ان کتابوں میں ہمارا قیمتی سرمایہ محفوظ ہے اور ان کتابوں کی روشنی میں ہم مستقبل کا سفر بھی طے کرسکتے ہیں۔

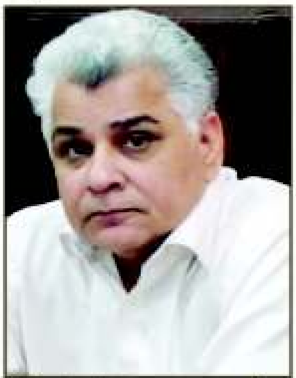

ہندوستان کے بہت سے قدیم کتب خانے ہیں جہاں بہت سے نوادرات اور مخطوطات محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو آج کے عہد میں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان کی تاریخ، لغت، روزمرہ کے حوالے سے بہت سی قیمتی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کی بازیافت کی جائے اور اس کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام کیا جائے تو اس سے نئی نسل کو بہت فائدہ ہوگا۔ آج کی نسل کا معاملہ یہ ہے کہ انھیں نہ تو اچھی رہنمائی مل پاتی ہے اور نہ وہ یہ جان پاتے ہیں کہ کون سی کتابیں ان کے لیے مفید ہیں۔ بہت سے طلبا ایسے ہیں جو اپنے اساتذہ سے عمدہ کتابوں کے انتخاب کے لیے رجوع کرتے ہیں مگر انھیں مایوسی ہاتھ لگتی ہے کہ اساتذہ بھی ایسی کتابوں کی نشاندہی نہیں کرپاتے جن سے ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور زبان وبیان کی باریکیوں سے بھی واقف ہوں۔ ایسی صورت میں اردو اداروں کو معیاری اور کلاسیکی ادب کے علاوہ زبان وبیان سے متعلق کتابوں کی اشاعت پر بھی غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک طلبا معیاری ادب سے واقف نہیں ہوں گے وہ معیاری مضمون لکھنے سے بھی قاصر رہیں گے۔ اس دور کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ طلبا کے پاس کوئی ایسا بہتر ماڈل نہیں ہے جس کو بنیاد بنا کر وہ مضامین تحریر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا کے مضامین میں زبان وبیان کی بہت سی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی بھی موضوع کی کن کن جہتوں کا احاطہ کیا جانا چاہیے اور موضوع سے متعلقہ مواد کی فراہمی کس طرح ممکن ہے یہ بھی جاننا طلبا کے لیے ضروری ہے۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے مواد تک پہنچنے میں آسانی تو ہوگئی ہے مگر اس مواد کا استعمال کس طرح کیا جائے اس سے ہمارے طلبا ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر مضامین پر سرقے یا چربے کا گماں گزرتا ہے۔ اسی لیے اب نہ صرف جامعات کے اساتذہ بلکہ اردو اداروں کو بھی اس پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ طلبا کے لیے کچھ ماڈل مضامین کا انتخاب تیار کیا جانا ضروری ہے۔ تاکہ اس کی روشنی میں طلبا علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین تحریر کرسکیں اور اس طرح نہ صرف زبان وادب کا معیار بلند ہوگا بلکہ قاری کو بھی معتبر اور مفید تخلیقات پڑھنے کو ملیں گی۔ ماضی کے قلم کار ہر مضمون پر بڑی محنت اور ریاضت کرتے تھے۔ مضمون کے مالہ وماعلیہ پر ان کی پوری نگاہ رہتی تھی۔ انھیں مضمون لکھنے میں کئی مہینے اور سال ضرور لگ جاتے تھے مگر اس مسلسل محنت کی وجہ سے ایک ایسی تحریریں وجود میں آتی تھیں کہ پڑھ کر ذہنوں کے دریچے کھل جاتے تھے اور پڑھنے والے کو بھی لکھنے کی تحریک ملتی تھی۔ نئے عہد میں اسی پرانی روش کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالے میں اس قدر مواد ہوتا ہے کہ اچھا خاصا وقت گزر جاتا ہے۔ مضامین دل لگا کر پڑھنے والے ہوتے ہیں۔

ستمبر 2017 کے پیش نظر شمارے میں معین احسن جذبی، یادوں کے دریچے سے از جمال اختر اور انگریزی اور اردو کے معتبر قلم کار محمد عرفان نگینوی مرحوم پر شیخ نگینوی کا انٹرویو خاصے کی چیز ہیں۔

یادرفتگاں ہر رسالے کا دل ہوتا ہے۔ اس مرتبہ اردو شعر و ادب کے تین بہت اہم اور معتبر قلم کار پروین کمار اشک، نیر مسعود اور خواجہ احمد عباس کو یاد کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔

'ہماری بات' (اداریہ) میں آپ کے خیالات سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ ''کسی بھی ملک کی تعمیر اور ترقی میں زبان و ادب کا کردار بہت اہم رہا ہے''۔ اس کی مثال کے طور پر ہم چین، جاپان اور جرمنی کو سامنے رکھتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے آپ کو طبقوں میں بانٹ دیا ہے اس طرح زبان کو بھی کئی حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ کیا ستم ہے کہ مادری زبان بولنے والے بھی اپنی زبان سے نفرت کرتے ہیں۔ اسے چھوت کا درجہ دیتے ہیں اور یہ لوگ ہائی سوسائٹی کے لوگ ہیں اور ملک کی لگام انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

دنیا امید پر قائم ہے شاید کبھی مادری زبان کی قسمت بھی بدل جائے۔ ہم تو دعائیں ہی کر سکتے ہیں۔

آپ کا دلی شکریہ کہ آپ ایسے معیاری اور قابل مطالعہ رسالے سے ہمیں فیض یاب کرتے ہیں۔

سید معراج جامی: پوسٹ بکس نمبر 17667، کراچی 75300

'اردو دنیا' اگست 2017 یوم آزادی کی سوغات لیے موصول ہوا۔ ہندوستان میں آزادی کے لیے ملک کی دیگر زبانوں کے ہمراہ اردو زبان کی جدوجہد بھی اتنی ہی طویل ہے جتنی کہ خود آزادی کی تاریخ۔ نظم و نثر دونوں اصناف سخن میں وطن کی محبت اور عظمت ہر دل کو چھو لینے والی ہے۔ اب یہی ترانۂ ہندی کو لے لیجیے۔ جس کی سادگی،

پاکیزگی، شائستگی، بے ساختگی اور وطن سے محبت انتہائی دلنواز ہے۔ اسی لیے یوم آزادی ہو یا یوم جمہوریہ، پورا ملک دل کی گہرائیوں سے گاتا گنگناتا ہے۔

حالیہ شمارے میں پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور عالم عرب (ص 10) پر بہت خوب مضمون تحریر کیا ہے۔ خدا بخش لائبریری میں قطب شاہی عہد کے قلمی آثار (ص 13) فی الواقعی عمدہ تحقیقی تحریر ہے۔ ص 33 پر ذیلی سرخی 'پنشن اور خودی' میں لفظ خودی کے بجائے کوئی اور مناسب لفظ استعمال کیا جاتا تو بہتر تھا، کیونکہ خودی کا تعلق تو غالباً وحدانیت سے ہے۔ ص 31 پر پیش کردہ مضمون بعنوان اردو زبان و ادب کی ترویج میں سائبر سماج کا حصہ اردو میں سائنس و ٹکنالوجی کی جانب ایک کامیاب جست ہے۔ ص 51 پر روبینہ تبسم صاحبہ نے ایک نادر عنوان تاریخ فرشتہ منتخب کیا ہے۔ ص 73 پر سہ ماہی فکر و تحقیق کا توضیحی اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ بہت پسند آیا۔ ص 75 پر پرسنل کمپیوٹر کے بارے میں دی گئی معلومات لاثانی و لاجواب ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو دنیا میں ادب کے ساتھ ساتھ عملی رجحان میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری: اورنگ آباد، مہاراشٹر

یہ شمارہ لال قلعے، کتب مینار، انڈیا گیٹ وغیرہ کی موزوں تصاویر سے آراستہ پیراستہ دیدہ زیب و جاذب نظر سرورق کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں شہرۂ آفاق شاعر چکبست کے کلام میں حب الوطنی پر مبنی خواجہ عبدالمنتقم صاحب کا مضمون حاصل شمارہ ٹھہرتا ہے۔

عبدالرحمٰن کا سرور کی شاعری میں قومیت و وطنیت کی نشان دہی کرنے والا شاندار مقالہ بھی بلند پایہ و عمدہ نثر کا نمونہ ہے۔ اس میں فقط سرور جہان آبادی کی ذاتی سوانحی حیات کے کوائف کا فقدان ہے۔ اس میں بھی اول الذکر مقالے کی ہی مانند نثر کی شیرینی قابل دید و داد ہے۔

محترمہ سعدیہ پروین کے مضمون میں سنہ 1857 کی اول جنگ آزادی کے تناظر میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بابت معلومات تو بخوبی بہم کی گئی ہیں، لیکن اگر اس بادشاہ پر چلائے گئے مقدمے کی تفصیل اور ان پر ان کے 'غدار' ہونے وغیرہ کے لگائے گئے غلط الزام کے دفاع کے لیے پیش کیے گئے ثبوتوں کی جانب بھی کنائیہ کر دیا جاتا تو گویا 'سونے پر سہاگے' کی ضرب المثل صادق آ جاتی۔

عظیم شاعر ضمیر کاظمی صاحب کے ساتھ جناب اشتیاق سعید کا انٹرویو جتنے معقول سوالات سے لبریز ہے، اتنے ہی موزوں جوابات سے بھی مملو ہے۔ ان کے سوانحی کوائف میں ان کے ایک خاص شعری مجموعے 'ہلکی تازی ٹھنڈی ہوا' کا نام ندارد ہے۔ ان کے مبیّنہ ہی مقبول عام موقر جریدہ 'تریاق' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے کا حوالہ دینا رہ گیا ہے۔ ضمیر صاحب کے اول شعری مجموعے کا نام 'مافی الضمیر' ہے جس کا معنی ہے 'من کی بات'۔ یہ بات بھی بالخصوص ملحوظ خاطر ہے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی بھی اسی عنوان سے متعدد پروگرام تا حال نشر کر کے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

کرشن بھلوک: کوٹھی نمبر 201-A، گلی نمبر 18-A، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

اگست 2017 کا شمارہ ملا۔ اداریے میں ڈاکٹر کریم نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ آزادی کے بعد زیادہ تر نغمے اردو زبان میں ہی ہیں۔ اس زبان کے خمیر میں سیکولرازم ہے۔ اس زبان سے محبت کرنے والے ہر طبقے میں موجود ہیں۔ ضمیر کاظمی سے اشتیاق سعید کی گفتگو اچھی لگی۔ غالب کے تمام شاگردوں میں منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے، تفتہ نے فارسی میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری میں وطن سے متعلق اشعار سب سے پہلے قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔

سرور جہان آبادی کو وطن کی ہر شے سے دلی وابستگی تھی۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کرنے کے بجائے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی نظموں میں جمالیاتی عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

ایم۔ راگھو راؤ: ساؤتھ سول لائن چھندواڑا، مدھیہ پردیش

(3) اب مشاعرہ سننے والا کم اور دیکھنے والا زیادہ ہوتا ہے۔

گروپ بندی کی بات سے میں ضمیر کاظمی صاحب کی بات سے صدفی صد متفق ہوں۔ آج صرف ادب میں ہی نہیں بلکہ ہر شعبہ میں یہ مہلک مرض پھیلا ہوا ہے۔

مولانا آزاد اور عالم عرب میں محمد اسلم اصلاحی نے مولانا کے انقلابی افکار وخیالات کی بنیاد سے لے کر اس پر عمل کرنے تک کو بہتر انداز میں کور کیا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے بارے میں اچھی معلومات ہے۔ ہندی اردو کے ارتقا کے لیے ہندوستانی اکادمی الہ آباد کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ ساجد حسین انصاری نے 'شہریار' کی شاعری اور اسلوب پر تو کافی روشنی ڈالی مگر ان کی فلمی دنیا سے وابستگی کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے کچھ منتخب اشعار پیش کرنا چاہیے تھا۔

خواجہ عبدالمنتقم نے چکبست کے کلام میں حب الوطنی کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کرشن بھاوک جی نے بھی بہت عرق ریزی کے ساتھ 'جھنڈا گیت' کے خالق 'شیام لال گپت' کے حالات زندگی اور سیاست پر روشنی ڈالی۔

سعدیہ پروین نے کم صفحات میں 1857 کی تاریخ رقم کرنے کی اچھی کوشش کی ہیں۔ خان محمد آصف نے اردو زبان وادب اور سائبر سماج کے تعلق سے بہت کارآمد معلومات فراہم کی ہیں۔ ریختہ نے اردو ادب کو نئی نسل تک پہنچانے کا جو ہائی ٹیک طریقہ اپنایا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ اردو دنیا کے مطالعہ کا یہ فائدہ ہے کہ جن شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں کو ہم نے درسی کتابوں میں نہیں پڑھا ان کی اچھی خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔ جیسے شاہد رام نگری، جدوراج بلی عیش سلطانپوری وغیرہ۔

اس کے ساتھ ساتھ تعارفی جائزہ، تنقیدی مطالعہ، ادبی سرگرمیاں، ناولٹ، تبصرہ وتعارف اور قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں کافی دلچسپ ہوتی ہیں۔

نوشاد علی ریاض احمد: کرلا (مغرب)، ممبئی 70

ہر ماہ پابندی سے اردو دنیا موصول ہو رہا ہے۔ ہماری بات میں پروفیسر سید علی کریم صاحب کی تحریر بہت معلوماتی، تجزیاتی اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ ''قلمکار تو بہت ہیں لیکن باشعور قارئین کا قحط ہے۔'' بالکل سچی بات ہے۔ آج کچھ صفحات پڑھ لیے، کچھ روز بعد ورق گردانی کرلی۔ بس!!!! نہ مباحثہ، نہ ردعمل، نہ تبصرہ۔

قارئین سے جو توقعات ہیں وہ ضرور پوری ہونی چاہیے۔ آزادی سے متعلق نظم اور نثر کا سرمایہ ہر زبان کا جمع کرنے اور اس کا تمام زبانوں میں ترجمہ کرانا بہت ہی احسن کام ہے۔

''آج کے مشاعرے تنزلی کا شکار ہیں'' انٹرویو میں اشتیاق سعید صاحب کی ضمیر کاظمی سے گفتگو کافی اہم اور دلچسپ رہی۔ ہر کوئی اپنی اپنی فیلڈ میں سامعین، ناظرین، قارئین کا رونا روتا نظر آتا ہے۔ ضمیر کاظمی صاحب نے بھی کہا کہ ''آج کے سامعین داد دینا نہیں جانتے، بے تکے، بھونڈے اور غیر معیاری اوزان سے گری ہوئی شاعری پر تالیاں پیٹتے ہیں''۔

کبھی آپ نے جاننے کی کوشش کی کہ کیوں ایسا ہو رہا ہے؟

(1) نئی نسل کو نہ ہی بحر، نہ اوزان، نہ ردیف قافیہ سمجھ آتا ہے اور شاید اسکولوں میں اس کو بتانے کی زحمت بھی نہیں کی گئی۔

(2) حالات حاضرہ پر، سیاست پر اور خاص کر کسی غیر اردو داں شاعر نے اردو میں تک بندی کر لی اور قرآن اور اللہ کی بات کر لی تو سمجھو مشاعرہ لوٹ لیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی فخریہ پیش کش

ملک وبیرون ملک کے تخلیق کاروں ومضمون نگاروں سے التماس ہے کہ خواتین عالم کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے والے مضامین، انٹرویوز، افسانے، انشائیے، منتخب اشعار نظمیں، غزلیں اور خواتین کے کارہائے نمایاں پر مبنی رپورٹ وغیرہ ارسال کریں۔ خواتین کے لیے اور خواتین کے ذریعے لکھے گئے مضامین کو ترجیحی بنیاد پر شائع کیا جائے گا۔ مضامین مندرجہ ذیل ای میل پر بھیجیں۔

ایڈیٹر: پروفیسر ارتضیٰ کریم

E-mail:kduniya@ncpul.in

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

فاروق اعظم قاسمی

ادب پڑھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا جارہا ہے: علیم اللہ حالی

فاروق اعظم قاسمی: خاندانی پس منظر؟

پروفیسر علیم اللہ حالی: پس منظر کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور ماضی قریب بھی ہوتا ہے اور بعید بھی۔ پوری تفصیل کے ساتھ ماضی بعید تک پہنچنا نہ ممکن ہے نہ فی الوقت مناسب۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ خاندانی سلسلہ پشت در پشت حضرت سید احمد چرم پوش سے ملتا ہے۔ مختلف کتب انساب کا مطالعہ کیا جائے اور سلسلے کی تحقیق کی جائے تو صحیح نقشہ سامنے آتا ہے۔ ویسے ماضی قریب میں میرے دادا،نہرا سابق ضلع مونگیر میں متمکن رہے اور وہاں سے زمینداری اور کاشتکاری کی دیکھ بھال کے سلسلے میں مشکی پور سابق ضلع، مونگیر (حال ضلع، کھگڑیا) میں منتقل ہوگئے اور اس طرح ہمارے خاندان کی رہائش مشکی پور سے ہی منسوب ہوگئی۔ میرے دادا حاجی، حافظ اور قاری بھی تھے۔ ان کا پورا نام سید عبداللہ حافظ مشکی پوری تھا۔ چونکہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور انھیں غیر معمولی شعری تخلیقی صلاحیت ودیعت تھی اس لیے علاقے میں ایک مستند استاد شاعر کی طرح خاصے مشہور تھے۔ اس عہد میں قریب و دور کے متعدد نومشق شعرا ان کے شاگرد تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ مشکی پور سے پاکستان منتقل ہوگئے۔ ان کی پرورش و پرداخت زمیندارانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ طبیعت میں استغنا اور گوشہ نشینی کی خصوصیت تھیں۔ شاعری کے ذریعے حصول شہرت کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ ایک زمانے میں ان کی ایک نظم 'اللہ ہو' خاصی مشہور ہوئی۔ مذہبی جلسوں میں اور سیرت کی محفلوں میں خوش گلو حضرات اسے پڑھ کر سامعین کو متاثر کرتے تھے۔ اس کا ایک بند کچھ یوں ہے:

پوچھا گل سے جو میں نے کہ اے خوب رو
کس کی رنگیں اداؤں سے رنگیں ہے تو
ہنس کے بولا کہ اے عاشق رنگ و بو
اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اسی طرح ان کی متعدد منظومات اور غزل کے اشعار ایک زمانے میں لوگوں میں مشہور تھے۔ توکل، بے نیازی اور استغنا کے باوجود انھیں اس بات کا احساس تھا کہ شعروادب میں ان کا جو مقام ہونا چاہیے وہ نہیں بن پایا۔ ان کے اس شعر سے ان کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

شیراز کا میں ہوتا تو ہوتی مری بھی قدر
قسمت کو کیا کروں کہ ہوں حافظ بہار کا

مجھے افسوس ہے کہ دادا جان کی صحبت مجھے بہت کم نصیب ہوئی۔ میرے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں بھاگلپور میں رہتے تھے اس لیے دادا جان سے ملنے کے مواقع کم ملتے تھے۔ اتنا یاد ہے کہ جب ہم مشکی پور آتے یا دادا جان بھاگلپور تشریف لاتے تو وہ اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے۔ 'حکایات شیریں' نام کی کتاب اکثر ان کے سامنے پڑھ کر زبان کو درست کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہمارے بچپن میں وہ بھائی، بہنوں کی طرف سے بچوں کی نظمیں لکھ کر ہمیں دے دیا کرتے تھے اور ہم سب بھائی، بہن ان کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے۔ غرض جو بھی وقت ان کی صحبت کا ملا اسے غنیمت شمار کرتا ہوں۔

ف ا ق: ابتدائی تعلیم؟

علیم اللہ حالی: ابتدائی تعلیم تو کچھ دادا جان کے ذریعے اور بہت حد تک والدین کے ذریعے ہوئی۔ اس کے بعد پورنیہ سٹی، مڈل اسکول میں داخلہ ہوا۔ پورنیہ ضلع اسکول سے میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوکر پورنیہ کالج سے آئی۔ اے اور بی۔ اے آنرس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ باقاعدہ ابتدائی تعلیم پورنیہ سٹی مڈل اسکول سے ہوئی اور وہاں سید عباس علی وفا ملک پوری اردو کے استاذ تھے۔ ان کی صحبت اور شفقت نے میرے فطری وادبی ذوق کی تربیت کی۔ وفا ملک پوری عالم دین بھی تھے اور اچھے شاعر بھی تھے گویا یوں کہنا چاہیے کہ اس ابتدائی تعلیم کے دور میں ہی میرے شعری ذوق کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

ف ا ق: پسندیدہ موضوعات وکتابیں؟

علیم اللہ حالی: میری پہلی پسند شاعری ہے۔ شعور سنبھالتے ہی قدیم اور ہم عصر شعرا کے کلام ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھتا رہا۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب کا زمانہ گزار کر ڈھلان کی طرف مائل ہوچکی تھی۔ ادبی منظرنامہ تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا۔ ترقی پسند شعرا جو تخلیقی توانائی کے حامل تھے اس دور میں خاصے مقبول تھے۔ غرض رومانی و انقلابی شاعری کا چسکا لگا رہا، لیکن ترقی پسند تحریک کے مقابلے حلقہ ارباب ذوق کے اثرات بھی واضح ہوچکے تھے۔ اس لیے میرے ذوق کی پرورش ایک امتزاجی دور میں ہوئی۔ مجاز، سردار جعفری، جوش، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری اور اس نوع کے دوسرے شعرا سے ہوتے ہوئے ن م راشد، میراجی، یوسف ظفر، شفیق فاطمہ شعریٰ اور پھر اختر الایمان اور خلیب الرحمٰن سبھوں کو سمیٹنے کی کوشش شعوری یا غیر شعوری طور پر ہوتی رہی۔ چنانچہ ابتدائی دور میں تخلیقی سطح پر ایک ملی جلی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مزاج کا انداز ہی اس تنوع کے درمیان میری اپنی شخصیت کی تشکیل بھی ہوتی رہی۔

ف ا ق: اپنے علمی وادبی سفر میں موثر شخصیت یا شخصیات؟

علیم اللہ حالی: ایک لمبے سفر میں باری باری سے مختلف شخصیات نے اپنے اثرات ڈالے۔ ایک وقت تھا جب اختر شیرانی اور اس نوع کے شعرا زیادہ اچھے لگتے تھے۔ پھر مجاز اور جوش پسندیدہ ترین تخلیق کار متاثر کرتے رہے۔ ایک زمانے میں شفیق فاطمہ شعریٰ اور اختر الایمان حاوی رہے۔ پھر اقبال، غالب اور میر میرے شعری مزاج کو متاثر کرتے رہے۔

ف ا ق: آپ کا آبائی وطن مشکی پور، جائے پیدائش بھاگل پور، بچپن نوجوانی کے لمحات پورنیہ میں گزارے، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے پٹنہ میں قیام پذیر رہے پھر ملازمت کی ایک طویل مدت گیا میں بسر کی اور اب آپ پھر سے پٹنہ میں رہائش پذیر ہیں۔ اب اگر ایک مورخ ادب کی

جغرافیائی تاریخ لکھے تو آپ کو کس خطے میں رکھے؟

علیم اللہ حالی: آپ نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بہت ساری معلومات اکٹھا کرلی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ کے لیے مجھے پٹنہ آنا پڑا۔ یہیں سے ایم۔ اے مکمل کیا۔ ملازمت باقاعدہ طور پر پہلے گیا میں ہوئی پھر یونیورسٹی سروس میں آنے کے بعد گیا کالج پہنچا۔ پھر پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں خدمات انجام دیتا رہا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مستقل گردش میں زندگی گزاری۔ اپنے آبائی وطن مشکی پور میں رہنے اور وہاں کی مرکزیت حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب ایسی صورت میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ لامکانی میرا مقدر بن چکا ہے۔ اس کے نقصانات بھی محسوس کرتا ہوں لیکن یہ احساس تقویت پہنچاتا ہے کہ:

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

ف ا ق: آپ کے دادا حافظ مشکی پوری اقبال وجگر جیسے عظیم شاعر کے ہم عصر رہے ہیں، ان کے کلام کے مطالعے سے بھی ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، لیکن ملکی سطح پر ان کو جو مقام ملنا چاہیے وہ نہیں ملا، اس کے اسباب وعوامل کیا رہے؟

علیم اللہ حالی: بات کو مختصر کرتے ہوئے میں دادا جان حافظ مشکی پوری کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ:

شیراز کا میں ہوتا تو ہوتی مری بھی قدر
قسمت کو کیا کروں کہ ہوں حافظ بہار کا

بلاشبہ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے، لیکن صرف یہ کہنا کہ بہار کے فنکار ہونے کی وجہ سے ان کی قرار واقعی پذیرائی نہ ہوسکی۔ میرا خیال ہے صدفی صد صحیح نہیں۔ اہم وجہ یہ ہے کہ دادا جان فطرتاً گوشہ گیر اور عزلت پسند تھے۔ شاگردوں کی نیازمندی، حلقہ بگوشی اور اطاعت کو ہی توصیف وتحسین کی معراج سمجھتے تھے۔ انھیں نہ اس بات کی ہوس تھی کہ بڑے حلقے میں متعارف ہوں اور نہ وہ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ بہار کی شہرت محدود رہ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

ف ا ق: آپ کے آبائی وطن مشکی پور اور حافظ مشکی پوری کا آپ کی شاعری پر کس قدر اثر رہا؟

علیم اللہ حالی: کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ دادا جان کا زمانہ کچھ اور تھا اس کے بعد حالات بدلے۔ طرز سخن میں تبدیلی آئی۔ نئے مسائل و موضوعات سامنے آئے۔ نئی ادبی تحریک نے بعد والوں کو متاثر کیا۔ فنکار تو اپنے عصر اور عہد کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس دور سے آج کا مقابلہ کرنا غلط ہے۔

ف ا ق: شاعری، تنقید، تحقیق اور صحافت میں سے کس میدان میں آپ خود کو ممتاز ونمایاں دیکھتے ہیں؟

علیم اللہ حالی: یہ فیصلہ میں خود نہیں کرسکتا۔ یہ کام تو شعر وادب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ شاعری میری پہلی محبت ہے اور تنقید دوسرا مشغلہ۔ اب یہ قارئین کے ذوق اور فیصلے کا معاملہ ہے کہ وہ مجھے کس شعبے میں زیادہ گوارا کر سکتے ہیں۔

مختصر خاکہ

نام : سید علیم اللہ حالی، **تخلص :** حالی، **والد :** سید احمد
دادا : ابوالصالح سید عبداللہ حافظ مشکی پوری
آبائی وطن : مشکی پور، کھگڑیا
جائے پیدائش : بھاگل پور
تاریخ پیدائش : 18 جون 1941
تعلیم : ایم اے، اردو (پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ) پی ایچ ڈی (مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا)
قابل ذکر اساتذہ : علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، کلام حیدری وغیرہ
ادبی صحافت : ماہنامہ 'صبح نو' پورنیہ پھر پٹنہ، ہفت روزہ 'نمود' گیا، ہفت روزہ 'حق شناس'، ماہنامہ 'سہیل' گیا، بودھ دھرتی گیا اور اب پٹنہ سے ایک سہ ماہی رسالہ 'انتخاب' کی ادارت فرما رہے ہیں۔
تصنیفات: شاعری: سفر جلتے دنوں کا (1978)، نخل جنوں (1989)، لفظ، آواز، صورت گری (2000)، عکس خواب کلیات (2015)۔ مضامین: احتساب (1981)، اعتبار (1986)، شناخیں (شذرات) فرد وفن (2005)، بیاں اپنا (تبصرے)
مونوگراف: پرویز شاہدی (2000)، سریر کابری (2007)،
سفرنامہ: ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ پاکستان، 1994)
مستقل پتا: 208, Abu Fakhruddin Plaza
Langartoli, Patna 800004

ف ا ق: آپ کے ادبی دنیا میں آنے کے پس پردہ کون سی چیز محرک ثابت ہوئی؟

علیم اللہ حالی: فطری ذوق

ف ا ق: ادب اور مذہب دو متضاد چیزوں کا نام ہے؟

علیم اللہ حالی: اس جملے سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب سے متعلق نثری اور شعری ادب کا ایک وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی شاعری اور مذہبی ادب بلاشبہ عام آفاقی اور ہمہ گیر ادب کا ایک حصہ ہے۔ ان دونوں میں تضاد کی صورت نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔

ف ا ق: آج کل ادیب بننے کے لیے صلح کل ضروری ہے؟

علیم اللہ حالی: پتہ نہیں اس سوال کے پس پردہ آپ کا ذہن کس طرح کام کررہا ہے۔ اس جملے کی معنویت کی صراحت ضروری ہے۔

ف ا ق: اس وقت یہ گونج سنائی دیتی ہے کہ نئی نسل میں کوئی حالی وشبلی اور اقبال پیدا نہیں ہورہے ہیں۔ کیا اس کی ذمے دار خود نئی نسل ہے یا خود غرض اور لالچی ادب مافیا؟

علیم اللہ حالی: آپ کا سوال مختلف طبقات پر الزام لگا رہا ہے۔ فنکار، اساتذہ، ادبی اداروں کے ارباب حل وعقد سب کہیں نہ کہیں سے نشانے کی زد میں آرہے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج ماقبل کے اکابر قلم کار اور فن کار سامنے نہیں آرہے ہیں، لیکن اس صورت حال کی ذمے داری کسی ایک طبقے پر نہیں دی جاسکتی۔ اس صورت حال اور زوال علم و ادب کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آرٹ بحیثیت مجموعی سائنس اور ٹکنالوجی کی زد میں آگیا ہے۔ دنیا کی متعدد زبانیں مررہی ہیں۔ جو موجود ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی جہت سے کمزور ہورہی ہیں۔ نئے ذرائع ابلاغ نے زبان اور تحریری ادب کو نقصان پہنچایا ہے اس کا تخمینہ لگایا جائے تو بہت افسوسناک صورت حال نظر آتی ہے؟

ف ا ق: تبصرہ محض مدح یا انتقام یا کسی اور چیز کا نام ہے؟

علیم اللہ حالی: تبصرہ نہ مدح ہے نہ انتقام۔ یہ تنقید کی ایک چھوٹی شکل ہے اور تنقید کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قاری کو فن پارے اور فنکار سے قریب کرے۔ تبصرہ تفہیم فن کا ایک کامیاب وسیلہ ہے۔

ف ا ق: ادبی رسائل کے اجرا کا مقصد؟

علیم اللہ حالی: ادب پڑھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے کوئی ادبی رسالہ تجارت اور منفعت کے لیے شائع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اپنے ذوق اور اپنے جیسے ادب کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ خالص ادبی رسائل کے علاوہ آج ایسے جریدے بھی شائع ہورہے ہیں جن میں متفرق اور ثانوی ذوق کی تسکین کے سامان موجود رہتے ہیں۔ اس لیے مختلف رسائل کے قارئین کا حلقہ الگ الگ ہے۔

ف ا ق: اردو کی نئی نسل کے نام آپ کا کوئی پیغام؟

علیم اللہ حالی: نئی نسل کے افراد میں اردو سے محبت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اپنے طور پر یہ نسل شعر وادب کی تخلیق بھی کررہی ہے۔ مالی تعاون حاصل ہوتا ہے تو کتابیں بھی چھپوا لیتی ہے۔ ان کتابوں پر انعامات بھی مل جاتے ہیں، لیکن اس نئی نسل پر دوہری ذمے داری ہے۔ تخلیق وتحریر کے ساتھ ساتھ اس نسل نے اگر اردو زبان کی بقا وترویج کے لیے مخلصانہ اقدام نہ کیے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نسل کا کام ادھورا ہے۔

■

Farooque Azam Qasmi
160, Periyar Hostel, JNU
New Delhi - 110067

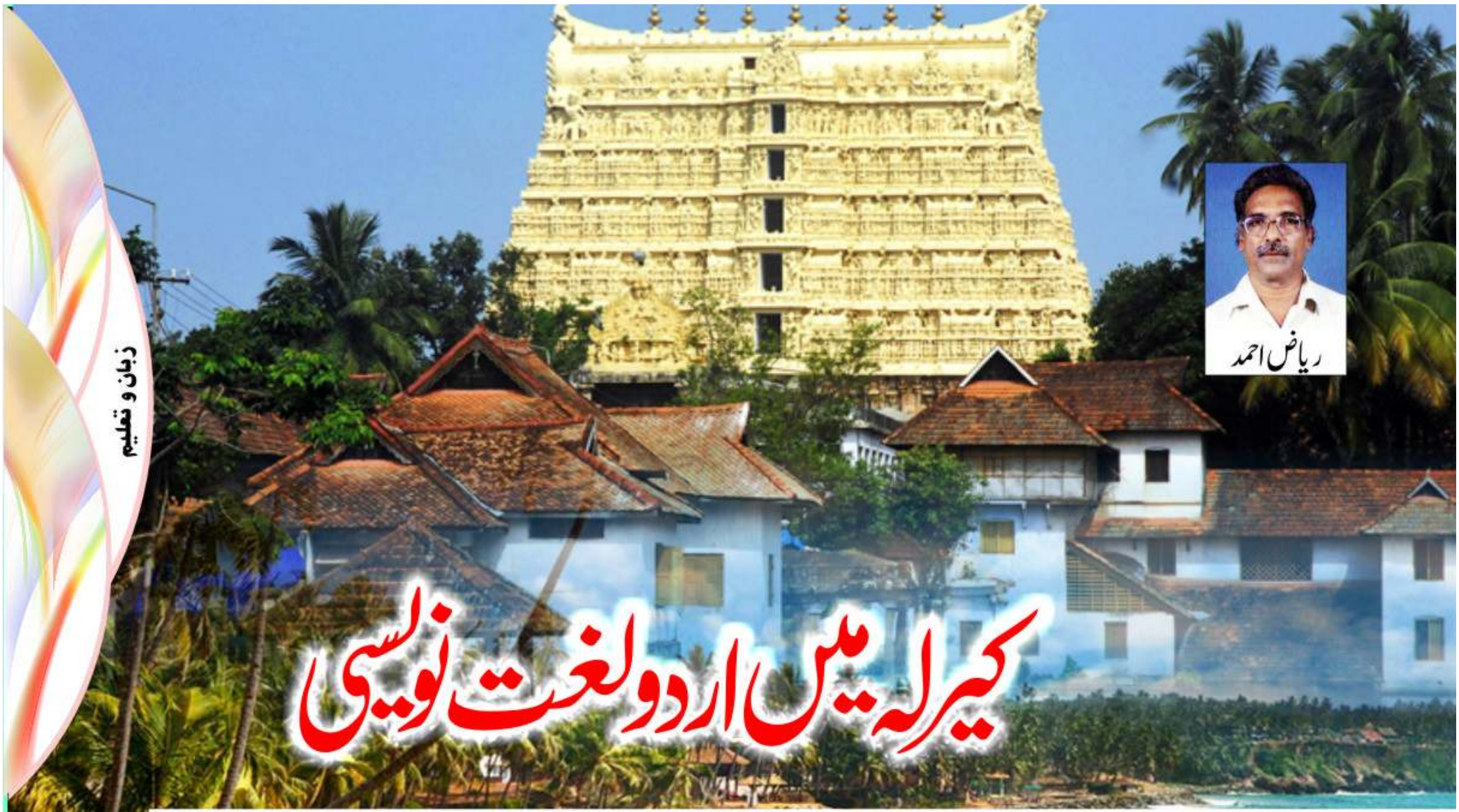

ریاض احمد

کیرلہ میں اردو لغت نویسی

ہندوستان کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہاں زبانوں اور بولیوں کی کثرت ہے، جس میں چند بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں تو چند باہر سے آئی ہیں۔ کچھ زبانوں کے لیے حروف ہیں، تو کچھ بے حروف ہیں اور صرف بول چال کے لیے ہیں۔ کچھ زبانیں چندریاستوں میں یا مخصوص علاقوں تک محدود ہیں۔ کچھ زبانیں مردہ ہیں، آج کل استعمال میں بھی نہیں۔ لیکن اردو کا معاملہ ان سب زبانوں سے الگ ہے کیونکہ اس شیریں زبان نے ہندوستان میں جنم لیااور یہیں پرورش پائی۔ دربار سے نکل کرمعمولی لوگوں تک کی زبان بنی اورآہستہ آہستہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیامیں پھیل گئی۔

کیرلہ میں اردو لغت نویسی کا پس منظر

کیرلہ میں گو کہ اردو زبان بہت دیر سے پہنچی لیکن جس طرح شمال میں اس زبان کا استقبال ہوا، اسی طرح یہاں کے لوگوں نے نئی زبان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پہلے پہل یہ زبان دکنی کی صورت میں یہاں رائج ہوئی جو تجارت کی غرض سے بہمنی سلطان محمد گوان، میسور کے سلطان حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو سلطان کے افسران اورلشکر کے ساتھ آئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہاں کے راجاؤں اورسلطان کے، جب حیدرآباد کے نظام، مدراس کے آرکاٹ نواب، بیجاپور اور دیگر سلطانوں سے تجارتی تعلقات استوار ہوئے تو اردو کی ضرورت اوراہمیت محسوس کی گئی۔ چنانچہ حاکموں اور لوگوں کی توجہ اردو زبان کی طرف مائل ہوتی گئی۔ چند علاقوں میں نظام کی مالی مدد سے اردو مدرسے اور کمیٹیاں قائم ہوئیں جو آگے چل کر زبان کا مرکز بن گئیں۔ جب زبان کے قدم جمنے لگے اور اردو زبان کی اہمیت وافادیت کے بارے میں کیرل کے لوگوں میں چرچا ہوا۔ اردو سیکھنے اور سکھانے کا عمل تیز ہوا تو اردو زبان میں لغت کی ضرورت و اہمیت بھی محسوس ہونے لگی۔

پہلی اردو ملیالم لغت کو منظر عام پر آئے قریب سو سال ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد مسلسل اردو ملیالم لغات آئیں تو آگے چل کر ملیالم اردو لغت بھی کیرل کے لوگوں کے ہاتھ آنے لگی جو اردو زبان کی نشو ونما کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے لگی۔

عبداللہ مولوی صاحب نے 1940 سے 1960 تک یعنی بیس سال کی جانفشانی کے بعد، ایک بہترین لغت تیار کی جو کیرل کی پہلی اردو-عربی ملیالم لغت ہے۔ (ملیالم عربی سے مراد وہ ملیالم زبان ہے جس کا رسم الخط عربی ہے) انھوں نے احمد کو پا ثالیاتی سے اردو اور عربی سیکھنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے عربی میں سند حاصل کی۔ اس دوران عبداللہ صاحب نے کانگریس کے لیڈر محمد عبدالرحمٰن مرحوم کے ساتھ جنگ آزادی میں شرکت بھی کی۔ آزادی کے بعد چند سال چرخے کے تاجر بنے۔ اس کے بعد اڈونہ یتیم خانہ کے مدرسے میں عربی استاد کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے۔ 1961 میں ملازمت سے فارغ ہوکر انھوں نے تجارت شروع کی، مگر اردو سے ان کا رشتہ قائم رہا۔ انھوں نے لوگوں کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے ایک لغت تیار کرنا چاہا۔ سنہ 1940 سے بیس سال لگا تار کوشش سے ایک لغت تیار ہوئی۔ بزرگوں کے مطابق عبداللہ مولوی مرحوم کے ہم عصر جیسے کے ایم۔ مولوی۔ انئین کٹی اور عبدالمجید کے علاوہ ان کے والد مرحوم پی۔ کے۔ کویا کٹی صاحب نے بھی لغت کی ترتیب دینے اور تیار کرنے میں تعاون دیا تھا۔ لغت تیار کرنے کے بعد مولوی صاحب نے مرکزی ساہتیہ اکادمی، دہلی کے سامنے لغت چھاپنے کے لیے درخواست کی مگر لغت کو فروخت کرنے اور چھاپنے میں مشکلات پیش آنے کے اندیشے سے منظوری نہیں ملی۔ لغت کی اشاعت کے لیے 500 کی رقم ریاست کیرلہ کی ساہتیہ اکادمی نے عطا کی تھی مگر اس رقم سے شائع کرنا مشکل ہوا اور چھاپنے کا ارادہ چھوڑ دینا پڑا اور سنہ 1963 اپریل میں عبداللہ مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

جب ملیالم میں ایک مکمل اور کامیاب لغت کی کمی محسوس ہوئی تو ریاست کا اردو داں حلقہ عبداللہ مولوی مرحوم کی لغت کی طرف متوجہ ہوا، جس میں قریب پچاس ہزار سے زیادہ الفاظ ہیں اور اس کو چھاپنے کی کوشش ہوئی۔ اس کے لیے چند اردو دانوں نے مل کر 2010 میں نیشنل مینواسکرپٹ مشن دلّی کے ذریعے اس کو شائع کرنے کی کوشش کی مگر چند تکنیکی مسئلے کے باعث اشاعت سے انکار کردیا گیا لیکن پھر عربی ملیالم کا مسئلہ سامنے آیا تو فیصلہ ہوا کہ عربی ملیالم سے بہتر اردو کا معنی سیدھا ملیالم میں ہی تیار کرنا مفید ہوگا۔ اس کی ذمے داری عبداللہ

مولوی کے پوتے پی۔ پی۔ خالق صاحب نے لے لی اور اس کے مالی اخراجات کا بھی ذمے لیا۔ اس لغت کو اردو دنیا سے واقف کرانے کے لیے خالق صاحب نے گورنمنٹ برنن کالج کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ای۔ محمد کو تدوین کی ذمے داری سونپی۔ پرفیسر ای۔ محمد کی رائے ہے کہ اگر یہ لغت زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آگئی تو اردو کے فیروز اللغات سے بھی اس کی اہمیت زیادہ ہوگی اور اس کی ضخامت فیروز اللغات سے کم نہیں ہوگی۔

ولہ پٹنم مرحوم کے والدین آمنہ اور رمضان تھے۔ سنہ 1912 فروری میں ولہ پٹنم میں پیدا ہوئے۔ 1921 میں تحریک خلافت سے متعلق کنور میں شروع ہوئے اسکول میں داخل ہوئے اور وہاں سے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ اردو سیکھنے کی غرض سے وہ تلچری آئے اور عثمان سیدی سے زبان سیکھی۔ اس کے بعد شمالی ہند کے علما و ادبا جیسے احمد نقوی صاحب اور مولوی مقبول صاحب جو یہاں پر اردو زبان کی خدمت کررہے تھے ان کے شاگرد بنے اور اردو فارسی میں گہرا علم حاصل کیا۔ اس کے بعد ولہ پٹنم عبداللہ صاحب نے کیرل کے مختلف علاقوں میں اردو سیکھنے کے لیے مدرسے اور کمیٹیاں قائم کیں اور اردو کے ٹیچر کی حیثیت سے معروف رہے۔ معاش کے لیے وہ 'چندریکہ' اور 'الامین' جیسے اخباروں میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سنہ 1982 مارچ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ولہ پٹنم عبداللہ مرحوم نے کالی کٹ میں رہنے کے دوران ایک مکمل اردو- ملیالم لغت تیار کی جس کو 'سلطان اللغات' کا نام دیا گیا۔

علما و ادبا کے گروپ یا ادارے کا کام انھوں نے اکیلے دس سال کی محنت سے مکمل کیا جو پچاس ہزار سے زیادہ اردو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ان کے تجربے اور مختلف زبانوں میں مہارت نے کامیاب لغت تیار کرنے میں ان کی مدد کی۔ اردو کا تلفظ صحیح طور پر مطالعہ کرنے کے لیے انھوں نے ملیالم کا سہارا لیا ہے۔ سلطان اللغات میں پرندوں، جانوروں اور مچھلیوں کے نام کے ساتھ ہزاروں ٹکنالوجی سے متعلق الفاظ کے ملیالم معنی درج ہیں لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے عبیداللہ صاحب مرحوم کی طرح ولہ پٹنم عبداللہ مرحوم بھی سلطان اللغات شائع نہ کرسکے لیکن اس کو کیرل کا پہلا اردو-ملیالم لغت کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہی سب سے پہلے تیار ہونے والی اردو-ملیالم لغت ہے۔

سلطان اللغات تالیف کے علاوہ انھوں نے ملیالیوں کو اردو سکھانے اور سمجھانے کے لیے اردو استاد نامی ایک کتاب بھی تیار کی جس میں ہر ایک دن ایک سبق پڑھانے کا طریقہ تھا۔ اس طرح تیس دن میں تیس سبق پورا کرنے سے ہر کوئی اردو میں بات چیت کرنے اور لکھنے پڑھنے کے قابل ہوجاتا تھا۔ عبداللہ صاحب چندریکہ اور الامین جیسے اخباروں میں اردو کالم مسلسل لکھتے تھے جس میں ملیالم کے ذریعے اردو پڑھانے کی مشق ہوتی تھی۔ ایسا رویہ اختیار کرنے سے عبداللہ صاحب کو 'سلطان اللغات اور اردو استاد' تیار کرنے میں کافی کامیابی ملی۔ اس کے سوا انھوں نے مرزا غالب کی حیات، زندگی، مولانا آزاد پر تعارفی مضامین لکھے اور علامہ اقبال کی نظم کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

محمد شیم صاحب ضلع کا سرگوڈ کے چیناڈ نامی ایک قریہ میں جولائی 1945 میں پیدا ہوئے۔ عالیہ عربک کالج کی نگرانی میں جو اسکول تھا وہاں سے بنیادی تعلیم کے ساتھ عربی اور اردو زبان میں مہارت حاصل کی۔ وی۔ ایل عبدالقادر (عمرآباد)، ابوبکر ندوی (دارالعلوم) اور محمد طائی مولوی کی نگرانی میں اردو زبان و ادب میں درک حاصل کیا۔ عمرآباد سے اردو ہائیر کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ سعودی عرب گئے اور وہاں ریاض کے جامعۃ الامام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی میں ساڑھے چار سال کی تعلیم حاصل کرکے کامیابی کے ساتھ بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد محمد شیم صاحب نے اپنے گاؤں کے گورنمنٹ یوپی اسکول میں ملازمت پائی۔

محمد شیم صاحب نے 'عمری' تخلص اختیار کیا۔ انھوں نے بہت ساری دینی کتابیں ملیالم میں لکھیں۔ اور چند عربی کتابیں ملیالم میں ترجمہ بھی کی ہیں۔ ان کی پہلی ادبی کوشش اردو میں ہی رہی۔ اس وقت جب کہ وہ 28 سال کے تھے اور غیر اردو علاقے میں نامساعد حالات تھے۔ اپنا پہلا قدم اردو ادب کی خدمت میں جمایا۔ اردو زبان کے چاہنے والوں کی مانگ پوری کرنے کے لیے 1974 میں ایک مختصر لغت 'شیم اللغات' کے نام سے تیار کی تو اردو دانوں کی طرف سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی اور ایک وسیع اور ضخیم لغت تیار کرنے کے لیے چاروں طرف سے تقاضا ہوا۔ عمری صاحب نے نامناسب حالات میں بغیر کسی مالی امداد کے اس زمانے کے اساتذہ اور دوستوں کی حوصلہ افزائی سے پانچ سال کی مدت میں شیم اللغات نامی ایک مکمل اور کامیاب لغت جو 620 صفحات پر مشتمل ہے، تیار کی۔ اس بڑی لغت کی اشاعت کالی کٹ کے الہدیٰ بک اسٹال نے کی۔ انھوں نے اس لغت میں قریب ستر ہزار سے زیادہ اردو الفاظ کے ملیالم معنی درج کیے ہیں۔ کیرل کی اردو زبان کی تاریخ میں شیم اللغات سب سے بہترین اور وسیع ترین اور کامل لغت ہے۔ جو آج کل بازار میں دستیاب ہے۔ عمری صاحب نے ملیالم میں اردو زبان کی تاریخ پر ایک کتاب تیار کی جس کا نام 'اردو سہتیہ چریترم' (History of urdu Literature) رکھا گیا۔ مگر شائع کرنے والوں نے کتاب کی مانگ کم ہونے کے اندیشے سے نہیں چھاپا۔

شیم اللغات میں عمری صاحب نے ایک لغت کے تمام مطلوبہ امور کو اس کے فنی تقاضے کے ساتھ پورا کیا۔ چنانچہ کسی اردو لفظ کا معنی شیم اللغات میں تلاش کرنا چاہیں تو توقع ہے کہ ہمیں مایوسی نہیں ہوگی۔ اس وجہ سے عمری صاحب کے لغت کو ہر اعتبار سے ایک کامیاب لغت کہا جاسکتا ہے۔

ملیالم اردو لغت محمد اسجد حسین القاسمی صاحب نے بھی تیار کیا تھا۔ محمد اسجد 12 مارچ 1973 کو بہار ضلع کے بھاگلپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بنیادی تعلیم اپنے والد غلام محمد قاسمی صاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد بہار کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا امتحان پاس کرنے کے علاوہ مولوی فاضل کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے

علما و ادبا کے گروپ یا ادارے کا کام انھوں نے اکیلے دس سال کی محنت سے مکمل کیا جو پچاس ہزار سے زیادہ اردو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ان کے تجربے اور مختلف زبانوں میں مہارت نے کامیاب لغت تیار کرنے میں ان کی مدد کی۔ اردو کا تلفظ صحیح طور پر مطالعہ کرنے کے لیے انھوں نے ملیالم کا سہارا لیا ہے۔ سلطان اللغات میں پرندوں، جانوروں اور مچھلیوں کے نام کے ساتھ ہزاروں ٹکنالوجی سے متعلق الفاظ کے ملیالم معنی درج ہیں لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے عبیداللہ صاحب مرحوم کی طرح ولہ پٹنم عبداللہ مرحوم بھی سلطان اللغات شائع نہ کرسکے لیکن اس کو کیرل کا پہلا اردو-ملیالم لغت کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہی سب سے پہلے تیار ہونے والی اردو-ملیالم لغت ہے۔

پاس کیا۔ مارچ 1993 سے کالی کٹ کے قریب مشہور و معروف کڈمیری رحمانیہ عربک کالج میں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے اور شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے 17 سال تک کام کرتے رہے۔ امجد صاحب نے یہاں کے قیام کے دوران اردو میں کئی کتابیں لکھی۔ جیسے 'ہماری زبان کا قاعدہ' ہماری زبان حصہ اوّل اور دوم، اردو ریڈر، اصلاحی اردو قواعد اور منظومات لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادیب، فاضل کے طلبا کے لیے گائڈ بھی تیار کی۔

جب قاسمی صاحب کی کتابوں کی مانگ بہت زیادہ ہوئی تو انھوں نے محسوس کیا کہ اردو سیکھنے والے طلبا اور اساتذہ کے لیے ملیالم کا اردو لغت تیار کرنا بہت ضروری ہے۔ پانچ سال کی محنت سے انھوں نے اردو ملیالم لغت تیار کی جس کا نام 'معارف اللغات' رکھا۔ اشرفی بک سینٹر ترورنگاڈی نے اس لغت کی ہزار کاپیاں شائع کیں جو بڑی مفید ثابت ہوئی۔

اس لغت میں عام فہم ملیالم الفاظ کے اردو معنی کے علاوہ لغت کے دوسرے حصے میں اردو کا ملیالم معنی بھی درج کیا ہے۔ کل ایک ہزار صفحات میں پھیلی ہوئی 'معارف اللغات' کی تکمیل میں امجد صاحب کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ایک غیر ملیالی ہونے کی وجہ سے ملیالم زبان کے مختلف استعمال، معنی، بامحل الفاظ اور زبان کے تہذیبی اختلاف نے پریشان کردیا تھا لیکن انھوں نے یہاں کے ملیالی طلبہ اور عربک کالج کے شعبہ ملیالم سے تعلق رکھنے والے حضرات کی مدد سے اپنی مشکلات کا حل دریافت کرنے میں کامیابی پائی۔

لغت تیار کرنے میں عبدالرحمٰن کے فرزند محمد علی وی۔ کے کی خدمت بہت شاندار اور مقبول ترین ہے۔ انھوں نے اپنی بنیادی تعلیم بلافقانی سے حاصل کرنے کے بعد اردو سیکھی۔ وہ اپنے پیدائشی قریہ ولہ پٹم سے اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تلچری آتے رہے جو اردو کا مرکز تھا اور انجمن اردو کالج میں اردو لوور (Lower) اور ہائیر (Higher) کی سند ملنے کے بعد 1973 میں اسکول میں اردو استاد کی حیثیت سے عارضی طور پر ملازمت اختیار کی۔ 1976 میں ان کو کنورسٹی ہائی اسکول میں مستقل ملازمت ملی اور وہیں سے 33 سالہ ملازمت کے بعد ریٹائر ہوگئے۔ جامعہ میسور سے 1983 میں اردو میں ایم۔ اے کی سند اور 2002 میں کالی کٹ یونیورسٹی سے عربک میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ محمد علی بلافقانی تخلص استعمال کرتے ہیں اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انصار اردو کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ جہاں ادیب فاضل کے طلبا کے سوا ملک اور غیر ملک میں نوکری کے امیدواروں کو اردو سکھانے کا ذمہ بھی بلافقانی صاحب نے لے لیا ہے۔

محمد علی بلافقانی نے اردو سیکھنے والوں اور استادوں کی ضرورت کے پیش نظر 1981 اور 2000 کے دوران مختلف چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، جن میں 1981 میں شائع ہونے والی 'اردو شبداولی' ایک لغت ہے جو ٹی وی (TV) پر عام طور پر بولے جانے والے الفاظ کی تفہیم و تشریح پر

مشتمل ہے۔ بلافقانی نے اردو میں بات چیت کی غرض سے 'اردو بول چال' نامی کتاب تیار کی جو 1983 میں منظر عام پر آئی۔

بلافقانی کا ایک بڑا کام اردو ملیالم لغت کی تیاری ہے۔ انھوں نے 'نسیم اللغات' کے نام سے ایک لغت تیار کی جو 1985 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی، جس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔ انھوں نے بغیر استاد کی مدد کے اپنے طور پر اردو زبان سیکھنے کے خواہاں لوگوں کے لیے 'اردو استاذ' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

بلافقانی کی سب سے مقبول کاوش 'انیس اللغات' نامی ان کی ملیالم اردو لغت ہے، جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ 2000 میں یہ لغت چھپ کر منظر عام پر آئی۔ بلافقانی کو پہلی بار ایک سہ لسانی (اردو۔ملیالم۔انگریزی) لغت تیار کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ لغت 'لغت شان' کے نام سے 2010 میں چھپ کر منظر عام پہ آئی۔ بلافقانی نے لغات اور اپنی دیگر کتابیں بڑی تحقیق و جستجو اور محنت سے لکھی ہیں۔ ان کی کتابوں کو کیرل میں اردو سیکھنے والے طلبہ اور شائقین میں قبول عام حاصل ہوا۔

لغت نویسی کا ایک بڑا اور مہتمم بالشان کام کالی کٹ کے 'فاروق کالج' میں ہورہا ہے۔ اردو سے ملیالم میں لغت نویسی کا کام تو بہت ہوا لیکن ملیالم سے اردو لغت نویسی کا کام ہنوز تشنہ ہے۔ کوئی بھی ملیالم اردو لغت دس ہزار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل نہیں۔ اس لیے فاروق کالج کے شعبۂ اردو نے یو جی سی (UGC) کے تعاون سے ایک ضخیم لغت کی تیاری کا منصوبہ بنایا۔ یو جی سی سے منظوری ملنے کے بعد پروجیکٹ پر کام بھی شروع کردیا گیا ہے۔ اس پروجیکٹ کے روح رواں شعبۂ اردو کے سابق پروفیسر آر، ای ریاض احمد ہیں۔ انھوں نے اس پروجیکٹ کی تکمیل کی ذمے داری لی ہے۔ موجودہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد سلیم پلشری کو نگران اور ایس۔ حیدر علی کو پروجیکٹ فیلو (Project Fellow) مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر محمد سلیم اور حیدر علی صاحبان ایک ٹیم کی صورت میں اس پروجیکٹ کی تکمیل میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔ ہزاروں اردو شائقین اس لغت کے منتظر اور اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے دعا گو ہیں۔

یہ ضخیم لغت کوئی ڈیڑھ لاکھ الفاظ کے ذخیرے پر مشتمل ہوگی۔ اس میں ملیالم کے خالص دراویڈی الفاظ کے علاوہ عربی، سندھی، ڈچ اور انگریزی جیسی زبانوں کے الفاظ کے، مترادف اردو الفاظ فراہم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ملیالم کی بول چال، روزمرہ اور محاورے کا اردو مترادف پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیرل کے لوگ اردو زبان سے صدیوں سے رشتہ رکھتے ہیں۔ وہ اس زبان کی شیرینی اور لطافت سے محظوظ ہوتے رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کی گہرائیوں میں اترنے اور اس زبان کی فنی واقفیت کا رجحان بڑھا تو لغت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ آج کوئی دس ہزار کے قریب اردو سکھانے والے اساتذہ ہیں جن کو لغت کی ضرورت ہر آن محسوس ہوتی ہے۔ اب کیرل کی صورت حال کافی مثبت بہتری آچکی ہے۔ یہاں اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ اردو کتابوں اور اردو لغت کا چلن یہاں بڑھتا جارہا ہے۔ پہلے صورت حال یہ تھی کہ بک سیلر حضرات اردو کی کتاب لینے کو تیار نہیں ہوتے تھے لیکن ماحول میں تبدیلی آچکی ہے۔ اردو کتابوں کی مانگ پہلے سے بڑھ چکی ہے خاص طور سے لغت کی مانگ زیادہ ہے۔

■

Dr. R.E. Reyaz Ahmad
'Tharif', Kayyath Road
Tellicherry - 670101 (Kerala)

پی ایف رحمان

عالمی یونی ورسٹی رینکنگ (World University Ranking)
طریقۂ کار اور یونی ورسٹیوں کا منظر نامہ

تعلیم کی اہمیت وافادیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور معیاری و افادی تعلیم ہر فرد کی ضرورت بن گئی ہے۔ یہ اس لیے بھی ہوا ہے کہ نالج اکونومی(Knowledge Economy) نظریہ نے عالمی ترقی کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ چونکہ تعلیم کا سب سے اہم سرچشمہ یونی ورسٹیاں ہیں، اس لیے آج معیاری یونی ورسٹیوں کی پہچان اور ان میں تعلیم حاصل کرنا ہر شخص کا خواب بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر کئی ایجنسیاں ہیں جو دنیا کی ٹاپ یونی ورسٹیوں کی نشاندہی کرتی ہیں تا کہ خواہش مند امیدوار معیاری تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ ایجنسیاں مختلف پیمانوں اور طریقۂ کار پر یونی ورسٹیوں کو جانچتی ہیں اور انہیں عالمی، براعظم، برکس، ایشیائی اور ملکی سطح پر رینکنگ دیتی ہیں۔

ایجنسیوں کے ذریعہ دی جانے والی اس رینکنگ میں تمام یونی ورسٹیاں بہتر سے بہتر رینک حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ انہیں اولیت حاصل ہو۔ دراصل عالمی سطح پر نظر ڈالیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج پوری دنیا ایک مارکیٹ بن گئی ہے اور مارکیٹنگ کے ذریعہ مشہور و معروف اور کامیاب ہونا مقبول ترین 'منتر'۔ پوسٹ ایل پی جی (Liberalization, Privatization, Globalization) اور خاص کر پچھلے کچھ عرصے پر غور کریں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ معاشی ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ عالمی سطح پر نہ صرف مہارت، ٹیکنالوجی اور نئی نئی معلومات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں جاری ہیں بلکہ عالمی سطح کے ٹاپ اداروں میں بھی مخصوص سطح پر ایکسیلنسی کی بنیاد پر ایک دوسرے سے سبقت کرکے عالمی اداروں کی فہرست میں اولیت حاصل کرنے کی کوششیں تیز ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح کی یونی ورسٹیاں معیار کو بہتر بنانے کے لیے مناسب اقدامات کررہی ہیں جیسے اساتذہ اور پالیسی سازوں کو قابل قدر معلومات فراہم کرنا تا کہ معیار کو بہتر بنایا جاسکے، متعلقہ طلبا کو ملکی اور عالمی سطح پر معیاری اداروں کی نشاندہی کرنا تا کہ طلبا بہتر پلیس مینٹ کے اداروں کو اپنا سکیں۔ اس طرح یونی ورسٹیاں بہتر سے بہتر رینکنگ حاصل کرنے میں سرگرداں ہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے یونی ورسٹی رینکنگ کی اہمیت عالمی سطح پر کافی تیزی سے بڑھی ہے۔ یوں ہی عالمی رینکنگ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور ممکن ہے کہ اس تعداد میں مزید اضافہ ہو (Marginson, 2007)۔ اس یونی ورسٹی رینکنگ سسٹم پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سالانہ یونی ورسٹی رینکنگ سیزن ہر سال تعلیمی سیشن شروع ہونے سے قبل دنیا کے تمام ممالک میں شروع ہوتا ہے تا کہ یونی ورسٹی کے خواہش مند طلبا کو بہتر سے بہتر اداروں کی معلومات ہو سکے (Altbach, 2011)۔ ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ ایجنسیوں کو ان کے مقاصد اور طریقۂ کار کی بنیاد پر مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (Rauhvargers, 2011)

1۔ ٹاپ یونیورسٹیوں کی لیگ ٹیبل تیار کرنے کے مقصد سے رینکنگ:

شنگھائی اکیڈمک رینکنگ ورلڈ یونی ورسٹیز (ARWU) نے 2003 میں سب سے پہلے یونی ورسٹیوں کی رینکنگ شروع کی، پھر ٹائمس ہائر ایجوکیشن (THE) نے 2004 سے 2009 کے درمیان کواکریلی سائمنڈس کے تعاون سے (THE-QS)، اور 2010 کے بعد تھامسن راوٹر کے تعاون سے (THE-TR) عالمی یونی ورسٹیوں کی رینکنگ کی، کیوایس ورلڈ یونی ورسٹی رینگ (QS) نے 2010 سے اور رشین رائٹر رینکنگ وغیرہ نے بھی رینکنگ کی شروعات کی۔

2۔ تحقیق کی کارکردگی کی بنیاد پر یونیورسٹی رینکنگ - لیگ ٹیبل کے ساتھ یا اس کے بغیر:

لیڈین رینکنگ، نیدرلینڈز، تائیوان ہائر ایجوکیشن اکریڈیشن ایویلیویشن کونسل (HEEACT) یونی ورسٹی رینکنگ، دی ای یو اسسمنٹ آف یونی ورسٹی بیسڈ ریسرچ (AUBR)، یونی ورسٹی رینکنگ بائی اکیڈمک پرفارمینس (URAP)، ترکی

3۔ مخصوص پیمانوں کے مدنظر یونیورسٹی رینکنگ:

جرمن سینٹر آف ہائر ایجوکیشن ڈیولپمنٹ (CHE)، دی ای یو یوملٹی رینکنگ، سینٹر فار ورلڈ یونی ورسٹی رینکنگ (سعودی عربیہ)، U21 (آسٹریلیا)۔

4۔ اصل لرنگ نتائج پر مبنی بینچ مارک یونیورسٹیز۔اسسمنٹ آف ہائرایجوکیشن لرنگ آؤٹ کمس (AHELO)،فرانس

5۔ ویب سائٹ پر سب سے زیادہ دیکھی جانے والی یونی ورسٹیوں کے اعتبار سے رینکنگ:-Webometrics،اسپین

مذکورہ بالا یونی ورسٹی رینکنگ دینے والی تمام ایجنسیوں پر نظر ڈالی جائے تو اے آر ڈبلیو یو(ARWU)، کیو ایس۔ڈبلیو یو آر(QS-WUR) اور دی(THE) ایسی ایجنسیاں ہیں جنھیں عالمی طور پر ترجیح ملتی ہے اور اکیڈمک شخصیات،تنقید نگار،طلبا اور پالیسی ساز انھیں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اسی لیے اس مقالہ میں عالمی سطح پر یونی ورسٹیوں کو رینکنگ دینے والی انہیں تین ایجنسیوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ کے پیمانے:

عالمی سطح پر مشہور و معروف رینکنگ دینے والی مذکورہ بالا تینوں ایجنسیاں کسی بھی ادارے کے معیار کو جانچنے یا مشاہدہ کرنے کے لیے نظری یعنی دیکھی جانے والی اور غیر نظری یعنی دکھائی نہ دینے والی دونوں باتوں پر توجہ دیتی ہیں۔یہ بات سچ ہے کہ نظری چیزوں جیسے عمارت اور دیگر سہولیات کا موازنہ کرنا غیر نظری چیزوں کے مقابل آسان ہے۔کیونکہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم جیسی غیر نظری چیزوں کو پرکھنا مشکل امر ہے۔ذیل میں رینکنگ ایجنسیوں کے مشترکہ پیمانے پیش کیے گئے ہیں جو حقیقی(Factual) اور تصوراتی(perception) دونوں آلہ (Tools) پر مشتمل ہیں۔پیمانے اس طرح ہیں:(1) ٹیچنگ،لرنگ اور ریسرچ(Citation)،(2) بیرون ممالک سے طلبا اور اساتذہ کی موجودگی تاکہ ادارے میں تنوع پیدا کرکے ادارے کو معیاری بنایا جاسکے،(3) تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت یا پلیس منٹ کے اعتبار سے ادارے کی اہمیت اور(4) تعلیمی و انڈسٹریل تعلقات۔البتہ رینکنگ دینے والی یہ تمام ایجنسیاں وقت بوقت ادارے کے اسٹیک ہولڈرس کے مطالبے یا ضرورت کے مطابق اپنے پیمانے تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ان پیمانوں پر ایک ٹیبل پیش ہے۔

ٹیبل 1-ٹاپ تھری ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ ایجنسیوں کی طرف سے دی جانے والی عالمی، برکس اور ایشیائی سطح کی رینکنگ کے پیمانے،طریقہ کار اور فیصد کے اعتبار سے ان کی اہمیت

ARWU	QS-WUR parameters			THE-WUR Parameters		
Parameters	Global	BRICS	Asia	Global	BRICS	Asia
Quality of Education (Alumni of an institution winning Nobel Prizes and Fields Medals)-10%	Academic reputation (40%)	Academic reputation - 30%	Academic reputation (30%)	Teaching (the learning environment) - 30%	Teaching (the learning environment) - 30%	Teaching (the learning environment) - 25%
Quality of Faculty(Staff of an institutionwinning Nobel Prizes andFields Medals -20%+ Highly cited researchers in 21 broad subject categories-20%)	Employer reputation (10%)	Employer reputation - 20%	Employer reputation (20%)	Research (volume, income and reputation)- 30%	Research (volume, income and reputation)- 30%	Research (volume, income and reputation)- 30%
Research Output (Papers published in Nature and Science- 20% + Papers indexed in ScienceCitation Index-expanded and Social Science CitationIndex- 20%)	Student-tofaculty ratio (20%)	Faculty/stu dent ratio - 20%	Faculty/student ratio (15%)	Citations (research influence)- 30%	Citations (research influence)- 20%	Citations (research influence)- 30%
Per Capita Performance - 10%	Citations per faculty (20%)	Staff with a PhD -10%	Citations per paper (10%) and papers per faculty (10%)	International outlook (staff, students and research)- 7.5%	International outlook(staff, students and research)- 10%	International outlook(staff, students and research)- 7.5%
-	Internation al faculty ratio (5%)	Papers per faculty - 10%	Staff with a PhD (5%)	Industry income (knowledge transfer)- 2.5%	Industry income (knowledge transfer)- 10%	Industry income (knowledge transfer)- 7.5%
-	Internation al student ratio (5%)	Citations per paper - 5%	Proportion of international faculty (2.5%) and proportion of international students (2.5%)	-	-	-

	-	International faculty-2.5%	Proportion of inbound exchange students(2.5%) and proportion of outbound exchange students (2.5%)	-	-	
-	-	International students - 2.5%	-	-	-	-

QS-WUR، THE-WUR ایجنسیوں کے پیمانے عالمی، برکس ممالک(Brazil, Russia, India, China & South Africa)اور ایشیائی ممالک کے لیے الگ الگ ہیں۔QS-WUR نے 2013 سے یونی ورسٹیوں کو ان کی کارکردگی کی بنیاد پر ایک سے پانچ اسٹار رینکنگ دینے کی بھی شروعات کی ہے۔

اے آر ڈبلیو یو تحقیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی معیار اور یونی ورسٹی کے اسٹیک ہولڈرس کے فی کس پرفارمنس کو پیش نظر رکھتے ہوئے رینکنگ دیتی ہے۔اس طرح دیکھیں تو اے آر ڈبلیو یو(ARWU) کے پیمانے ان یونی ورسٹیوں کو زیادہ ترجیح دیتی ہے جن کی اہم سائنسی خدمات ہیں اور ان کے تحقیقی مقالے انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔کیو ایس ڈبلیو یو آر(QSWUR) کے رینکنگ دینے کے طریقہ کار پر نظر ڈالی جائے تو یہ ادارہ اکیڈمک ریپوٹیشن پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔اس کے علاوہ استاد اور شاگرد کے تناسب اور سائٹیشن(Citation) کو بھی ترجیح دیتا ہے۔مزید براں اس کے نزدیک ملازمین کا ریپوٹیشن اور بیرونی طلبا و اساتذہ کا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ٹائمس گروپ(Times group) سب سے زیادہ تحقیقی سرگرمیوں اور ان کے مفید نتائج کو مد نظر رکھتا ہے۔البتہ تدریس اور انٹرنیشنل اساتذہ و طلبا کی موجودگی کو بھی اہمیت دیتا ہے۔اس طرح ورلڈ یونی ورسٹی رینکنگ سسٹم پر سرسری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رینکنگ میں ریسرچ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے(Altbach, 2011) جبکہ ٹیچنگ اور لرننگ پر کم۔ٹیچنگ اور لرننگ پر کم توجہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا جائزہ لینا مشکل امر ہے۔

سبھی براعظم کے یونی ورسٹیوں کی رینکنگ کا منظر نامہ جاننے کے لیے مندرجہ ذیل ٹیبل ملاحظہ کریں۔

ٹیبل 2. 2016/2017 کی رینکنگ میں براعظموں کی یونی ورسٹیوں کی نمائندگی (ٹاپ 200 اور 400 کی فہرست میں شامل یونی ورسٹیاں)

Agencies	**ARWU 200**	**ARWU 400**	**QS 200**	**QS 400**	**THE 200**	**THE 400**
North America	78 (39%)	136 (34%)	82 (41%)	93 (23.3%)	71 (35.5%)	126 (31.5%)
South America	2 (1%)	6 (1.5%)	6 (3%)	13 (3.2%)	0	1 (0.2%)
Europe	82 (41%)	158 (39.5%	88 (44%)	179 (44.8%)	99 (44.5%	199 (49.8%)
Asia	29 (14.5%)	73 (18.3%)	12 (6%)	83 (20.7%)	19 (9.5%)	45 (11.2%)
Pacific	9 (4.5%)	25 (6.2%)	11 (5.5%)	28 (7%)	9 (4.5%)	27 (6.8%)
Africa	0	2 (0.5%)	1 (0.5%)	4 (1%)	2 (1%)	2 (0.5%

مذکورہ بالا ٹیبل سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپی یونی ورسٹیاں ٹاپ 200 یا 400 میں سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔یورپ کے بعد شمالی امریکی یونی ورسٹیوں کی کارکردگی بہتر ہے۔اس کے بعد ایشیا کا نمبر آتا ہے جبکہ اچھی کارکردگی میں افریقی اور جنوبی امریکی یونی ورسٹیاں کافی پیچھے نظر آتی ہیں۔

دنیا کی ٹاپ رینکنگ یونی ورسٹیاں:

ذیل میں مختلف ٹیبل کے ذریعہ عالمی، برکس، ایشیائی اور ملکی سطح پر ٹاپ یونی ورسٹیوں کی رینکنگ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مندرجہ ذیل ٹیبل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے دو سالوں میں دنیا کی سب سے بڑی رینکنگ دینے والی تین اہم ایجنسیوں کے معیار پر کونسی یونیورسٹیاں کھری اتری ہیں۔

ٹیبل 3. پچھلے دو سالوں میں دنیا کی ٹاپ ٹین رینکنگ یونی ورسٹیوں کی فہرست

	ARWU-15	**ARWU-16**	**QS-WUR-16**	**QS-WUR-17**	**THE-16**	**THE-17**
1.	Harvard University	Harvard University	Massachusetts Institute of Technology	Massachusetts Institute of Technology	California Institute of Technology	University of Oxford

2.	StanfordUniversity	StanfordUniversity	Harvard University	StanfordUniversity	University of Oxford	California Institute of Technology
3.	Massachusetts Institute of Technology	University of CaliforniaBerkeley	University of Cambridge	Harvard University	StanfordUniversity	StanfordUniversity
4.	University of CaliforniaBerkeley	University of Cambridge	Stanford University	University of Cambridge	University of Cambridge	University of Cambridge
5.	University of Cambridge	Massachusetts Institute of Technology	California Institute of Technology	California Institute of Technology	Massachusetts Institute of Technology	Massachusetts Institute of Technology
6.	Princeton University	Princeton University	University of Oxford	University of Oxford	Harvard University	HarvardUniversity
7.	California Institute of Technology	University of Oxford	University College London	University College London	Princeton University	PrincetonUniversity
8.	Columbia University	California Institute of Technology	Imperial College London	ETH Zurich - Swiss Federal Institute of Technology	Imperial College London	Imperial College London
9.	University of Chicago	Columbia University	ETH Zurich - Swiss Federal Institute of Technology	Imperial College London	ETH Zurich – Swiss Federal Institute of Technology	ETH Zurich – Swiss Federal Institute of Technology
10	University of Oxford	University of Chicago	University of Chicago	University of Chicago	University of Chicago	University of California

نوٹ:اے ارڈبلیو یو نے2017 کی فہرست ابھی جاری نہیں کی ہے۔

مذکورہ بالا ٹیبل پر نظر ڈالیں تو ہارورڈ، اسٹین فورڈ، ایم آئی ٹی، آکسفورڈ، کیمبرج، پرنس ٹرن، کیلی فورنیا یونی ورسٹی ایسی چند یونی ورسٹیاں ہیں جو سبھی ایجنسیوں کے پیانوں پر کھری اترتی ہوئی ٹاپ ٹین کی فہرست میں لگا تار اولیت حاصل کی ہیں۔ان یونی ورسٹیوں پر غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل یہ وہ تمام یونی ورسٹیاں ہیں جو ایک لمبے عرصے سے قائم ہیں اوران کا سالانہ بجٹ کئی بلین ڈالر ہے۔مزید یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام یونی ورسٹیاں ریسرچ پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہیں اور ریسرچ کے ذریعہ نہایت ہی اہم اور کار آمد ریزلٹ دیتی ہیں۔ان یونی ورسٹیوں کے ریسرچ پیپر انگریزی ریسرچ جرنل میں شائع ہوتے ہیں جن کے سائٹیشن اور ایچ وامپیکٹ فیکٹر زیادہ ہوتے ہیں۔ساتھ ہی ان تمام یونی ورسٹیوں کی پلیس منٹ ریکارڈ سب سے بہتر ہے۔ان میں زیادہ تر یونی ورسٹیاں شمالی امریکہ اور یوروپ سے ہیں۔

برکس ممالک کی یونی ورسٹیوں کی رینکنگ:

ٹیبل 4.پچھلے دوسالوں میں برکس(BRICS) یعنی برازیل، روس، انڈیا، چین اور ساؤتھ افریقہ کی دس اولین رینکنگ یونی ورسٹیوں کی فہرست

Position	QS-WUR		THE-WUR	
	2015	2016	2016	2017
1.	Tsinghua University, China	Tsinghua University,China	Peking University, China	Peking University,China
2.	Peking University, China	Peking University,China	Tsinghua University, China	Tsinghua University,China
3.	Fudan University, China	Fudan University,China	Lomonosov Moscow State University, Russia	Lomonosov Moscow State University, Russia
4.	Lomonosov Moscow State University, Russia	University of Science and Technology ofChina	University of Cape Town, South Africa	University of Cape Town, South Africa
5.	Indian Institute of Science, India	Shanghai Jiao Tong University, China	National Taiwan University, China	University of Scienceand Technology ofChina,China
6.	Shanghai Jiao Tong University, China	Indian Institute ofScience, India	University of the Witwatersrand, SouthAfrica	Fudan University, China
7.	University of Science and Technology of China	Lomonosov MoscowState University,Russia	University of Science and Technology of China	Shanghai Jiao Tong University, China
8.	Nanjing University, China	Nanjing University, China	Zhejiang University, China	University of the Witwatersrand, SouthAfrica
9.	Universidade de São Paulo, Brazil	Zhejiang University,China	University of São Paulo, Brazil	Zhejiang University,China

10.	Beijing Normal University, China	Universidade de São Paulo, Brazil	Shanghai Jiao Tong University, China	National Taiwan University, (Taiwan) China

THE-WUR, QS-WUR نے 2013 میں برکس ممالک کے یونیورسٹیوں کو رینکنگ دینے کی شروعات کی۔ مندرجہ بالا ٹیبل میں پچھلے دو سال کے ٹاپ ٹین یونیورسٹیوں کی رینکنگ دیکھی جا سکتی ہے۔ ٹیبل سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برکس کی ٹاپ یونیورسٹیاں زیادہ تر چین سے تعلق رکھتی ہیں۔

عالمی یونیورسٹی رینکنگ میں ایشیائی یونیورسٹیوں کی صورت حال:

ٹیبل 5: عالمی یونیورسٹی رینکنگ میں پچھلے دو سالوں کے ایشیائی ٹاپ یونیورسٹیوں کی فہرست:

S.No.	ARWU-2015	ARWU-2016	QS-WUR-2016	QS-WUR-2017	THE 2016	THE 2017
1.	The University of Tokyo, Japan (21)	The University of Tokyo, Japan (20)	National University of Singapore (12)	National University of Singapore (12)	Peking University, China (42)	National University of Singapore (24)
2.	Kyoto University (26)	Kyoto University (32)	Nanyang Technological University, Singapore (13)	Nanyang Technological University, Singapore (13)	University of Tokyo, Japan (43)	Peking University, China (29)
3.	The Hebrew University of Jerusalem (67)	Tsinghua University (58)	Tsinghua University (25)	Tsinghua University, China (24)	University of Hong Kong (44)	Tsinghua University, China (35)
4.	Nagoya University, Japan (77)	Technion-Israel Institute of Technology (69)	The Hong Kong University of Science and Technology (28)	The University of Hong Kong (27)	Tsinghua University, China (47)	University of Tokyo (39)
5.	Technion-Israel Institute of Technology (77)	Peking University, China (71)	The University of Hong Kong (30)	The University of Tokyo (34)	Nanyang Technological University, Singapore (55)	University of Hong Kong (43)
6.	Osaka University, Japan (85)	Nagoya University, Japan (72)	Seoul National University, S.Korea(36)	Seoul National University (35)	Hong Kong University of Science and Technology (59)	Hong Kong University of Science and Technology (49)
7.	National University of Singapore (101-150)	National University of Singapore (83)	Kyoto University, Japan (38)	The Hong Kong University of Science and Technology (36)	Seoul National University (85)	Nanyang Technological University, Singapore (54)
8.	Peking University, China (101-150)	The Hebrew University of Jerusalem (87)	The University of Tokyo, Japan (39)	Kyoto University, Japan (37)	Kyoto University, Japan (88)	Seoul National University (72)
9.	Shanghai Jiao Tong University, China(101-150)	Osaka University (96)	Peking University, China (41)	Peking University, China (39)	Pohang University of Science and Technology, South Korea (116)	Chinese University of Hong Kong (76)
10.	Tohoku University, Japan (101-150)	Fudan University, China (101-150)	KAIST - Korea Advanced Institute of Science & Technology (43)	Fudan University, China (41)	Chinese University of Hong Kong (138)	Korea Advanced Institute of Science and Technology (89)

مندرجہ بالا ٹیبل میں ٹاپ ٹین ایشیائی یونی ورسٹیوں کا نام دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بریکیٹ میں ورلڈ یونی ورسٹی رینکنگ میں ان کی پوزیشن بتائی گئی ہے۔ اس ٹیبل سے پتہ چلتا ہے کہ ٹوکیو، سنگاپور، پیکنگ، کیوٹو، این ٹی یو، تسنگھا ایسی یونی ورسٹیاں ہیں جو لگاتار اولین رہی ہیں اور یہ یونیورسٹیاں ٹاپ رینکنگ ایجنسیوں کے معیار پر کھرا اترنے کی وجہ سے اولین فہرست میں 5 جگہ بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ ٹیبل سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹاپ رینکنگ ایشیائی یونی ورسٹیوں میں سے زیادہ تر یونی ورسٹیاں جاپان، سنگاپور، ہانگ کانگ، ساؤتھ کوریا اور چین سے تعلق رکھتی ہیں۔

عالمی یونی ورسٹی رینکنگ میں ہندوستان کی صورت حال:

آزادی کے بعد ہندوستان میں اعلیٰ، تکنیکی اور پروفیشنل یونی ورسٹیوں اور کالجوں کا قیام تیزی سے ہوا۔ جس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی کے وقت

یونی ورسٹیوں کی تعداد صرف بیس تھی جبکہ آج آٹھ سو کے قریب ہے۔ تکنیکی میدان میں آئی آئی ٹیز کے قیام نے نہ صرف عالمی شہرت ومقبولیت حاصل کی بلکہ ٹاپ رینکنگ ایجنسیوں نے انہیں ہندوستان کے اولین اداروں کی فہرست میں رکھا۔ مندرجہ ذیل ٹیبل سے عالمی سطح پر ہندوستانی یونی ورسٹیوں اور اداروں کی رینکنگ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ٹیبل 6-عالمی رینکنگ میں ہندوستانی یونیورسٹیاں اور ادارے:

ARWU		QS-WUR		THE-WUR	
2015	2016	2016	2017	2016	2017
IndianInstitute of Science,Bengaluru (301-400	IndianInstitute of Science,Bengaluru (301-400)	Indian Institute of Science, Bengaluru (147)	Indian Institute of Science, Bengaluru (152)	Indian Institute of Science, Bengaluru(251-300)	Indian Institute ofScience, Bengaluru(201-250)
-	-	Indian Institute of Technology Delhi (179)	Indian Institute of Technology Delhi (185)	Indian Institute of Technology Bombay (351-400)	Indian Institute of Technology Bombay (351-400)
-	-	Indian Institute of Technology Bombay (202)	Indian Institute of Technology Bombay (219)	Indian Institute of Technology Delhi (401-500)	Indian Institute of Technology Delhi (401-500)
-	-	Indian Institute of Technology Madras (254)	Indian Institute of Technology Madras (249)	Indian Institute of Technology Kharagpur(401-500)	Indian Institute of Technology Kanpur (401-500)
-	-	Indian Institute of Technology Kanpur (271)	Indian Institute of Technology Kanpur (302)	Indian Institute of Technology, Madras (401-500)	Indian Institute of Technology Madras (401-500)
-	-	Indian Institute of Technology, Kharagpur (286)	Indian Institute of Technology, Kharagpur(313)	Indian Institute of Technology, Guwahati (501-600)	Indian Institute of Technology Kharagpur (501-600)
-	-	Indian Institute of Technology Roorkee (391)	Indian Institute of Technology Roorkee (399)	Indian Institute of Technology, Kanpur (501-600)	Indian Institute of Technology Roorkee (501-600)
-	-	Indian Institute of Technology Guwahati (451-460)	Indian Institute of Technology Guwahati (481-490)	Indian Institute of Technology, Roorkee (501-600)	Jadavpur University (501-600)
-	-	University of Delhi (481-490)	University of Delhi (501-550)	Jadavpur University (501-600)	Aligarh Muslim University (601-800)
-	-	Benaras Hindu University (701+)	University of Calcutta(651-700)	Punjab University (501-600)	Birla Institute ofTechnology and Science,Pilani(601-800)

مذکورہ بالا ٹیبل سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر 2016 اور 2017 کے درمیان ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ میں کس سطح پر ہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور صرف ایک ایسا ادارہ جو لگاتار سبھی ایجنسیوں کے نزدیک اولین ہندوستانی ادارہ کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔ حالانکہ ورلڈ یونی ورسٹی رینکنگ کے مطابق دیکھا جائے تو وہ صرف 147 سے 400 کے درمیان رینک حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔ ہندوستان کے حالیہ تمام آئی آئی ٹیز 200 سے 400 کی فہرست میں شامل ہیں جبکہ دہلی، ممبئی، پونے اور کلکتہ یونی ورسٹی جیسی کئی قدیم یونیورسٹیاں 400 تک کی رینکنگ میں شامل ہونے میں ناکام رہی ہیں۔

ہندوستانی رینکنگ ایجنسیوں کے ذریعہ دی گئی یونیورسٹی رینکنگ:

حالیہ کچھ دنوں سے انڈیا ٹوڈے نے بھی ہندوستانی یونی ورسٹیوں کو اپنی طے شدہ پیمانوں پر رینکنگ دینے کی شروعات کی تھی۔ اسی طرح دوسری کئی اداروں نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ 2016 میں ہندوستانی حکومت یونی ورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کو رینکنگ دینے کے لیے این آئی آر ایف (NIRF-نیشنل انسٹی ٹیوشنل رینکنگ فریم ورک) کی شروعات کی ہے جو ہر سال یونی ورسٹیوں کی رینکنگ کرے گا۔ اس ادارے پر تفصیلی گفتگو دیگر تحقیقی مقالہ میں پیش کرنے کوشش کریں گے۔

ماحصل:

رینکنگ ایجنسیوں، رینکنگ کے طریقہ کار اور یونی ورسٹیوں کے منظرنامہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس

نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ورلڈ یونی ورسٹی رینکنگ میں سب سے زیادہ سائنس پر زور دیا گیا ہے، ساتھ ہی اساتذہ، ریسرچرس اور طلبا کے ان سائنسی نتائج کو مدنظر رکھا گیا ہے جن کی بنیاد پر انڈسٹریل تعلقات بنا کر زیادہ سے زیادہ نوکری کے مواقع حاصل کیے جاسکیں اور تکنیکی ترقی ہوسکے۔ موجودہ عالمی یونی ورسٹی رینکنگ میں ریسرچرس، ریسرچ پبلی کیشنز، سائٹیشن، اپلائڈ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر بھی یونی ورسٹیوں کو ترجیحات ملتی ہیں۔ ان سب کے باوجود مختلف اوقات پر اکیڈمی شخصیات نے اس طریقہ کار پر تنقید کی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ کار میں آرٹس، ہیومینٹیز، سوشل سائنس جیسے علوم سے بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اس لیے اس کو سائنس، میڈیسین اور تکنالوجی پر مبنی رینکنگ کہی جاسکتی ہے، نہ کہ ایک ایسی رینکنگ جس میں تمام کورسز اور مضامین کا خیال کیا گیا ہو۔ حالانکہ یونی ورسٹی کا مطلب ہی ہوتا ہے کہ اس میں تمام کورسیز اور مضامین کا خیال رکھا جائے (Tilak, 2013)

عالمی رینکنگ اور ایشیائی رینکنگ یونی ورسٹیوں کو دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام یونی ورسٹیاں اعلیٰ آمدنی والے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں سے بھی اعلیٰ رینکنگ کی اکثر یونی ورسٹیاں انگریزی بولنے والے ممالک کی ہیں۔ جس بات کی تصدیق Millot, 2013 بھی کرتی ہے۔ دنیا کے کچھ ایسے بھی ممالک ہیں جہاں کی یونی ورسٹیاں ٹاپ یونی رسٹی رینکنگ میں کافی پیچھے ہیں۔ دراصل یہ وہ ممالک ہیں جہاں گراس انرولمنٹ ریشیو 20 فیصد سے کم ہے اور بچے اسکولی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کی طرف جانے والے بہت کم ہیں۔ ایسے ممالک اپنے گراس انرولمنٹ ریشیو (GER) کو درست کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیقی سرگرمیوں میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے ٹاپ یونی ورسٹی رینکنگ میں ان کا نام پیچھے ہے۔

ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو اعلیٰ تعلیم کو معیاری بنانے کے لیے حکام اور ایجنسیوں کی طرف سے اٹھائے گئے حالیہ چند اہم اقدامات (یو جی سی۔ ایم ایچ آر ڈی کا دسواں، گیارہواں اور بارہواں پلان) کافی اہمیت رکھتے ہیں، اور ان کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم میں مزید بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کے لیے بہترین تنخواہ، کارکردگی کی بنیاد پر پروموشن، خصوصی مالی تعاون کے ذریعہ یونی ورسٹی اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی، ریسرچ پروجیکٹ اور سفر کے لیے گرانٹ اور عالمی معیار کی یونی ورسٹیاں بنانے کے لیے دوسرے اہم اقدامات۔ ان کی بنیاد پر امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستانی یونی ورسٹیاں بہتر رینکنگ حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں گی۔

آج ہندوستان جہاں ایک طرف تعلیمی امور کو فروغ دینے کی وسیع پیمانے پر کوشش کر رہا ہے وہیں دوسری طرف عالمی مقابلے میں شامل ہونے کی خاطر معیاری تعلیم مہیا کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ ترقی پذیر سوسائٹی میں تعلیم ترقی کا اہم ذریعہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اس لیے یہاں تعلیم کے لیے ایک ایسی پالیسی کی ضرورت ہے کہ جو داخلی اور عالمی دونوں سطح پر ملک کو آگے بڑھا سکے۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کو بھی فروغ ملے جیسا کہ ملک کا مطالبہ ہے، اور معیاری تعلیم بھی دے تاکہ عالمی مقابلے میں شامل ہونا ممکن ہوسکے۔ اب وقت کی ضرورت ہے کہ ہندوستان بین الاقوامی چیلنجوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سماجی وثقافتی ضروریات کا بھی مناسب خیال رکھے۔

1. Altbach, P.G. (2011). Ranking Season is Here. International Higher Education. No. 62
2. Altbach, P.G. (2011). The State of Rankings.www.insidehighered.com
3. Marginson, S. (2007). Rankings: Marketing Mana or Menace? The Big Picture.16th Annual New Zealand International Education Conference, 8-10 August 2007Christchurch, New Zealand. Retrieved 11Jan 2011 from: http://www.cshe.unimelb.edu.au/people/ staff_pages/Marginson/KeyMar8-10Aug07.pdf
4. Millot, B. (2013). University Ranking and Tertiary Education System Banchmarking-Divergant Methodologies, Convergent Results? Journal of Educational Planning and Administration. Vol. XXVII (2)
5. QS world university rankings http://www.topuniversities.com/university-rankings
6. Rauhvargers, A. (2011). Global University rankings and their impact: EUA Report on rankings 2011. Brussels: European University Association
7. Shanghai Ranking Consultancy- http://www.shanghairanking.com/
8. Tilak, J.B.G. (2013) Review of Edited Book University Rankings: Theoretical Basis, Methodology and Impacts on Global Higher Education, Springer: London.(2011) in Journal of Educational Planning and Administration. Vol. XXVII (2)
9. Times Higher Education-http://www.timeshighereducation.co.uk/world-universityrankings/

P.F. Rahaman

Head, Department of Zoology, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad -500032 (Telangana)

Mob.:94 90105324, Email.: rahmanf1965@gmail.com

سرسید احمد خاں

گریجویٹ اور تجارت

یہ امر بلاشبہ غور طلب ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص اسٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے واسطے کیا بہتر ہوگا۔

اوّل تو ہم جو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں بی اے ڈگری تک تعلیم پانے کو جو اعلیٰ اسٹینڈرڈ تعلیم کا سمجھا گیا ہے محض غلط ہے۔ بی اے اسٹینڈرڈ کی تعلیم کو معمولی عام درجہ کی تعلیم کا اسٹینڈرڈ سمجھنا چاہیے کہ بغیر وہاں تک تعلیم پائے کوئی شخص دنیا کے معمولی کاروبار کے بھی لائق نہیں ہوتا۔

اس میں بھی کچھ شک نہیں ہے کہ سرکاری نوکریاں بغیر انگریزی تعلیم کے نہیں مل سکتیں۔ اس وقت جو اسٹینڈرڈ انگریزی تعلیم کا گورنمنٹ نے سرکاری عام نوکریوں کے لیے قرار دے رکھا ہے وہ نہایت ادنیٰ درجہ کا ہے۔ جس دن گورنمنٹ اس اسٹینڈرڈ کو بی اے ڈگری تک اور کم سے کم ایف اے کی ڈگری تک بڑھا دے گی اس وقت ملک کو، گورنمنٹ کو، ہماری قوم کو نہایت فائدہ ہوگا۔ چند روز ان کو مشکل پڑے گی مگر وہ مشکل ہی انجام کار ان کو نہایت مفید ہوگی۔

جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں اور روز بروز اس تعلیم کو ترقی ہوتی جاوے گی اس کے ساتھ وہ بہ خوبی اور بہ یقین کامل جانتے ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ ان سب لوگوں کو دے سکے جو انگریزی میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہاں بے شک یہ بات ضرور ہے کہ ہر ایک انگریزی خواں سرکاری عہدوں کی تمنا رکھتا ہے اور ایسا ہونا ایک نیچرل امر ہے۔

لندن میں اگر کوئی سرکاری عہدہ خالی ہوتا ہے تو اس سے زیادہ اس کے امیدوار موجود ہوتے ہیں جتنے کہ خالی عہدہ کے لیے ہندوستان میں امیدوار ہوتے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہر ایک انگریزی خواں اپنا حق سمجھتا ہے کہ گورنمنٹ اس کو کوئی عہدہ دے محض غلطی ہے کیونکہ خود انگریزی خواں یہ یقین جانتے ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر عہدے نہیں ہیں جو ہر ایک انگریزی خواں کو دے سکے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ گورنمنٹ نے یہ تصور کیا ہے کہ ہر ایک انگریزی داں سرکاری نوکریوں کا گورنمنٹ سے خواستگار ہوتا ہے اور جب گورنمنٹ نہیں دے سکتی تو ایک قسم کی ناراضی پھیلتی ہے اس لیے گورنمنٹ یہ چاہتی ہے کہ امتحانات میں سختی کی جاوے تا کہ کثرت سے لوگ انگریزی تعلیم میں داخل نہ ہو سکیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے اور گورنمنٹ کا کبھی ایسا منشا نہیں ہو سکتا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت میں ہرج ڈالے۔

لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ادنیٰ درجہ کی تعلیم کے شائع ہونے کی طرف دار ہے مگر اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی طرف دار نہیں ہے۔ ہم کو اس میں بھی شبہ ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعض حکام کی ایسی رائے تھی مگر بعد بحث و مباحثہ کے جو پالیسی کہ گورنمنٹ نے اختیار کی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں ہے۔

اگر گورنمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ خواستگاران ملازمت کی اعداد کم ہو جائے تو اس کے لیے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اسٹینڈرڈ ملازمت کو ایف اے یا بی اے تک بڑھا دے۔ اس کے سبب خواستگاران ملازمت کی تعداد از خود کم ہو جائے گی اور ملک میں تعلیم زیادہ پھیلے گی نہ یہ کہ ایسی تدبیر اختیار کرے جس سے ملک میں اشاعت تعلیم کو نقصان پہنچے۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے اب تک کافی رواج نہیں پایا ہے۔ یہ بحث بے فائدہ ہے کہ یہ کس کا قصور ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت امر واقع کیا ہے اور جب تک مسلمانوں میں کافی سے بھی زیادہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم رائج نہ ہوگی اس وقت تک کوئی معتد بہ فائدہ دنیاوی اور بعض حالتوں میں دینی بھی حاصل نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں بی اے ڈگری پائے ہوؤں کی تعداد اس قدر کثرت سے ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص زمین پر سے ڈھیلا اٹھاوے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔

مگر اسی کے ساتھ مجھ کو یہ بھی کہنا لازم ہے کہ علاوہ اس کے جو اور نقص مسلمانوں میں ہیں وہ بھی اس تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ رفع ہونے لازم ہیں۔ ہم اپنی تمام قوم کو

مردہ دلی کی حالت میں پاتے ہیں، اعلیٰ اور ادنیٰ غریب اور امیر سب کو دیکھتے ہیں کہ ان میں بشاشی کا نشان تک نہیں ہے۔ سب کے دل مردہ اور چہروں پر مردنی چھائی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سستی اور کاہلی، پست ہمتی اور مایوسی گویا ان کے خمیر میں پڑگئی ہے اور اس سبب سے کسی کام کی جرأت اور ہمت اور اولوالعزمی ان میں نہیں رہی اور قومی ترقی کی فیلنگ ان میں سے معدوم ہوگئی ہے۔ یہ نقص صرف تعلیم سے رفع نہیں ہوسکتا بلکہ اس چیز سے رفع ہوسکتا ہے جس کو ہم تربیت کے لفظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور ہم کو یقین کامل ہے کہ جب تک مسلمانوں کی یک جائی تعلیم اور یک جائی سکونت کا نہ بطور خیرات خوروں کے بلکہ بطور اشراف باغیرت لوگوں کے انتظام نہ ہوگا اس وقت تک یہ نقص رفع نہیں ہوسکے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ بعض مدبران سلطنت انگریزی کی یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم نہ دی جاوے اور بعض کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پچھلوں کی رائے غالب آئی اور گورنمنٹ نے یہی پالیسی اختیار کی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی جاوے اور اسی بنا پر ہندوستان میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مگر اس بات کا تجربہ باقی تھا کہ اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہوگا اچھا یا برا۔ اب تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ اچھا نتیجہ نہیں ہوا۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بیجا آزادی اور ناواجب خودسری پیدا ہوگئی، جابجا گورنمنٹ کی مذمت ہر ایک کی زبان پر جاری ہوگئی، گورنمنٹ سے ان حقوق کے دعوے دار ہوئے جو گورنمنٹ ان کو نہیں دے سکتی۔ پس جب تجربہ سے ایسا خراب نتیجہ اس تعلیم کا حاصل ہوا تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں سختی امتحانات یا اضافہ فیس تعلیم سے یا لوگوں کو مشرقی تعلیم یا بے سود ٹیکنیکل ایجوکیشنل پر توجہ دلا کر اعلیٰ درجہ کی تعلیم کو گھٹانا ضرور تھا۔ اگرچہ مسلمان ان لوگوں کے ساتھ جو اس طوفان بے تمیزی میں پڑے تھے بالفعل شامل نہیں ہوئے مگر جب وہ بھی اس درجہ تعلیم پر پہنچ جاویں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوجائیں گے جیسے کہ اب بھی محض تعلیم یافتہ مسلمان اعلانیہ یا خفیہ ان کے شریک ہیں۔

مگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ہمارے یہاں جو حالت جہالت اور بے تعلیمی کی بالفعل مسلمانوں کی ہے جو نہ ملکی انتظام سے واقف ہیں اور نہ اپنی حالت آئندہ کو سمجھ سکتے ہیں، اس کے سبب سے زیادہ تر اندیشہ تھا کہ وہ بھی اس طوفان بے تمیزی میں طوفان زدہ لوگوں کے

”

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے اب تک کافی رواج نہیں پایا ہے۔ یہ بحث بے فائدہ ہے کہ یہ کس کا قصور ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت امر واقع کیا ہے اور جب تک مسلمانوں میں کافی سے بھی زیادہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم رائج نہ ہوگی اس وقت تک کوئی معتد بہ فائدہ دنیاوی اور بعض حالتوں میں دینی بھی حاصل نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں بی اے ڈگری پائے ہوؤں کی تعداد اس قدر کثرت سے ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص زمین پر سے ڈھیلا اٹھاوے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔

“

ساتھ شریک ہوجائیں گے لیکن جب ان میں اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ کثرت سے ہوجائیں گے اور اپنے ملک کی حالت کو دیکھیں گے جس میں مختلف قومیں بستی ہیں اور جن کی اغراض اور سوشل حالت مختلف ہے اور اپنی قوم کی آئندہ حالت کو سوچیں گے تو ممکن نہیں ہے کہ اس طوفان بے تمیزی میں شامل ہوں۔

اس وقت جو چند تعلیم یافتہ مسلمان اس طوفان بے تمیزی میں شامل ہوگئے ہیں (وکیل یا بیرسٹر) انھوں نے اپنے ذاتی فائدہ پر نظر کی ہے اور اپنے ذاتی فائدہ پر ملکی اور قومی فائدہ کو قربان کردیا ہے۔ ایک یا دو ایسے بھی ہیں جو دل سے اور سچائی سے ان طوفان زدہ لوگوں کے ساتھ شریک ہیں مگر ان کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو فاروق شیخ تھا اور شیعہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ گو مجھے اپنے باپ دادا پر تبرا کرنا پڑے گا مگر میں تو شیعہ ہی ہوں گا۔

اس قدر بیان کرنے پر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص اسٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے واسطے کیا بہتر ہوگا اس کے جواب میں ایک دانا دہقان نے جو اپنے نوجوان بیٹے کو جواب دیا تھا وہی جواب دینا مناسب ہے۔

ایک دہقان کے بیٹے نے بہت اضطراب سے اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے۔ جب تالاب بھر جاوے گا تو پانی کہاں جاوے گا۔ اس کے باپ نے کہا کہ بیٹا اندیشہ مت کر، جب تالاب بھروے گا تو پانی اپنے نکاس کا آپ رستہ نکال لے گا یہی حال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے۔ ابھی ان کی ایسی قلت ہے کہ وہ کوئی راستہ آئندہ زندگی کے واسطے نکال نہیں سکتے۔ ہاں جب کثرت سے ہوں گے تو کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیں گے، رستوں کی کمی نہیں ہے مگر ابھی تک تالاب بھرا نہیں ہے۔

ہندوستان بہت وسیع ملک ہے۔ اس میں جان و مال کا امن ہے، تجارت کے لیے بہت کچھ وسعت ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر مسلمان نوجوان لائق اور صفات حمیدہ سے معمور اور ان عادات و افعال سے بری ہوجاویں جو تجارت کے منافی ہیں تو اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھاسکیں۔

میمن، بوہرے، خوجے، پنجابی سب مسلمان ہیں اور تجارت سے ایسے فائدے اٹھاتے ہیں کہ سرکاری نوکریوں کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے نہ اس کی پروا کرتے ہیں مگر تجارت دو قسم کی ہے۔ ایک سویلائزڈ اور ایک اَن سویلائزڈ۔ ان سویلائزڈ تجارت سے ہماری مراد شخصی سے ہے جو کوئی شخص اپنا ذاتی روپیہ لگا کے تجارت کرے گو اس کو کیسی ہی ترقی ہوجاوے اور کتنا ہی بڑا کارخانہ اس کا پھیل جاوے وہ اَن سویلائزڈ تجارت ہی کہلائے گی کیونکہ اس سے خاص اسی شخص کو فائدہ ہے نہ ملک اور قوم کو اور نہ اس قسم کی تجارت کو بہت زیادہ وسعت ہوسکتی ہے بلکہ وہ چند ذی مقدر اشخاص میں محدود رہتی ہے۔

سویلائزڈ تجارت وہ ہے جس میں قوم کے مختلف سرمایہ کے لوگ شریک ہوں اور ہر ایک کو بقدر اس کے سرمایہ کے منافع پہنچے۔ اس قسم کی تجارت ملک کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی ہے اور رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہوسکتی ہے کہ کوئی شخصی تجارت کرنے والا، گو وہ کیسا ہی دولت مند ہو، اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

مسلمانوں میں جو لوگ دولت مند ہیں وہ تجارت کی طرف مائل نہیں ہیں اور نہ ان کو ضرورت ہے کہ تجارت کے ذریعہ سے کچھ روپیہ پیدا کریں۔ ضرورت ہے ان مسلمانوں کو جو قلیل سرمایہ رکھتے ہیں اور جب تک کہ کثرت سے لوگ آپس میں شریک نہ ہوں اس وقت تک کوئی کام تجارت کا جاری نہیں کرسکتے۔

اس طرح پر لوگوں کا تجارت میں شریک ہونا متعدد امور پر منحصر ہے۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ ان شرکا میں پوری پوری اونسٹی اور ایمانداری موجود ہو اور ان کی تمام ہمت نہایت ایمان داری سے اس بات میں معروف ہو کہ اس کارخانہ تجارت کو ترقی اور فائدہ مندی حاصل ہو۔ مجھ کو میرے دوست معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ مسلمانوں میں یہ صفت بہت ہی شاذ و نادر ہے اور ایک کو

دوسرے پر طمانیت نہیں ہے اور اسی سبب سے اس قسم کا کوئی کام وہ جاری نہیں کر سکتے۔

دوم- تجارت کے کام کے لیے مستعدی اور وقت کی پابندی اور اپنی ڈیوٹی کا پورا کرنا سب سے زیادہ مقدم چیز ہے۔ میں اکثر مسلمانوں کو ان فرائض کے پورا کرنے میں قاصر پاتا ہوں۔

سوم- تجارت صرف گھر بیٹھے بیٹھے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے سفر کرنا اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا بھی لازمی اور ضروری ہے۔ اس بات میں بھی مسلمانوں کو نہایت کاہل اور سست پاتا ہوں۔

چہارم- تجارت میں ایک بہت بڑا کام ایجنسی کا ہے یعنی کسی ملک سے کوئی چیز خرید کر کے لانا اور کسی چیز کو کسی ملک میں لے جا کر بیچنا اور اس بات کا یقین کہ جس چیز کے خریدنے یا بیچنے کی وہ قیمت بتلاتا ہے وہ بالکل صحیح اور سچی ہے اور کچھ دغا اور فریب اس میں نہیں ہے، اس ایجنٹ کی ایمانداری پر منحصر ہے۔ اکثر تجارت پیشہ مجھ سے بیان کرتے ہیں کہ ایجنٹ کا ہاتھ آنا تجارت میں سب سے مشکل کام ہے اور اس لیے ہم اپنے بیٹے بھائیوں کو ایسے کاموں کے لیے متعین کرتے ہیں۔ وہ شخصی تجارت میں ایسا کر سکتے ہیں مگر جس تجارت کی میں مسلمان نوجوانوں کے لیے سفارش کرتا ہوں وہ شخصی تجارت نہیں ہے اور اس لیے ان کو ایسا ایمان دار ایجنٹ ملنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ صفت میں ان نوجوانوں میں جنھوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے اور نیز عمدہ اصول پر ان کی تربیت بھی ہوئی ہے اور قومی فیلنگ ان میں پیدا ہوگئی ہے، بہ نسبت ان کے جو

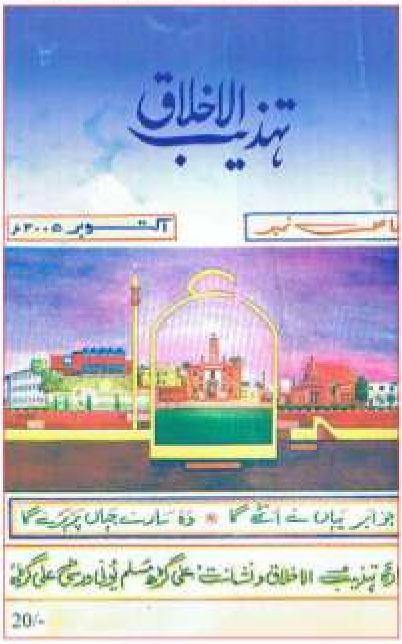

انگریزی خواں نہیں ہیں، زیادہ پاتا ہوں۔

اس مقام پر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے صرف قومی ہمدردی سے بغرض اعانت اپنے غریب قومی بھائیوں کے دو سوسائٹیاں قائم کی ہیں ایک کا نام فری بورڈنگ ہاؤس سوسائٹی ہے اور ایک کا نام القرض ہے اور اس کے ممبر مختلف طرح پر اس کام کے لیے چندے جمع کرتے ہیں اور اس خوبی اور ایمان داری سے اس کام کو انجام دیتے ہیں جس سے توقع ہو سکتی ہے کہ مستعدی اور ایمانداری اور قومی ہمدردی ان کے خمیر میں پڑ گئی ہے اور اس نمونہ پر میں یقین کرتا ہوں کہ جب ہمارے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ سویلائزڈ تجارت میں شریک ہوں گے تو نہایت خوبی اور ایمان داری سے کام انجام دیں گے۔

تجارت کی بہت سی شاخیں کھلی ہوئی ہیں اور میں ان انگریزی خواں طالب علموں کو جو خاص اسٹینڈرڈ تک یعنی بی اے کی ڈگری تک پہنچ گئے ہیں، صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنے تئیں سویلائزڈ یعنی متفقہ تجارت میں مشغول کریں۔ اس سے بہتر ان کے لیے کوئی بات نہیں اور جب ایسے تعلیم یافتہ کثرت سے ہو جائیں گے تو خواہ مخواہ ان کو یہی کام کرنا پڑے گا مگر اس کام کے کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو اور ہم کو خدا سے امید ہے کہ ہمارے کالج سے ایسے نوجوان تعلیم یافتہ نکلیں گے جو اس قسم کے کاموں میں نہایت خوبی اور مستعدی اور ایمانداری سے مصروف ہوں گے۔ اس وقت چونکہ تعلیم یافتہ قلیل ہیں اس لیے اس قسم کے کام نہیں کر سکتے اور یہ مجبوری نوکریوں کی تلاش میں ہیں۔ بنگالی اور ہندو اس قسم کے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور ملک کو اور قوم کو میوچل فیملی پنشن فنڈ کا کارخانہ بھی قائم کیا ہے، نوکریوں کی تلاش میں بھی ہیں، مگر اس اصلی ترقی سے بھی غافل نہیں ہیں۔

ہمارے عزیز دوست مولوی سید ممتاز علی نے جو متعدد سرکاری نوکریاں کر چکے ہیں، ملازمت سرکاری سے ہاتھ اٹھایا ہے اور دیو بند میں سوت کی تجارت کا کارخانہ کھولا ہے۔ اگرچہ وہ بھی ان سویلائزڈ یعنی شخصی کام ہے، مگر ہم سنتے ہیں کہ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں اور بہ نسبت ملازمت کے نہایت خوش حال ہیں۔

یہ بھی ہم کو معلوم ہوا ہے کہ دو نوجوان انگریزی خواں گریجویٹ نے مکھن بنانے کا کام سیکھا اور چاہا کہ مکھن کا کارخانہ جاری کریں۔ ان کے بزرگوں نے کہا کہ مکھنیے کہلاؤ گے اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر یہ بیہودہ خیالات

> **”تجارت کی بہت سی شاخیں کھلی ہوئی ہیں اور میں ان انگریزی خواں طالب علموں کو جو خاص اسٹینڈرڈ تک یعنی بی اے کی ڈگری تک پہنچ گئے ہیں، صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنے تئیں سویلائزڈ یعنی متفقہ تجارت میں مشغول کریں۔ اس سے بہتر ان کے لیے کوئی بات نہیں اور جب ایسے تعلیم یافتہ کثرت سے ہوجائیں گے تو خواہ مخواہ ان کو یہی کام کرنا پڑے گا مگر اس کام کے کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو اور ہم کو خدا سے امید ہے کہ ہمارے کالج سے ایسے نوجوان تعلیم یافتہ نکلیں گے جو اس قسم کے کاموں میں نہایت خوبی اور مستعدی اور ایمانداری سے مصروف ہوں گے۔“**

چند روز کے مہمان ہیں اور بہت جلد جاتے رہیں گے۔

ہم نے خود اپنے ایک حقیقی بھانجے کے لیے جو کسی قدر دواؤں اور دواسازی سے واقف تھا، عطاری کی دکان کرنا پسند کیا ہے۔ چنانچہ وہ دکان کرتا ہے اور کافی فائدہ اس سے اٹھاتا ہے۔

بنگالیوں نے لائف انشورنش سوسائٹی اور میوچل فیملی پنشن فنڈ قائم کیا ہے جس سے قوم کو فائدہ ہے۔ ہم سنتے ہیں کہ کایستھوں نے بھی خاص اپنی قوم کے لیے میوچل فیملی فنڈ قائم کیا ہے۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہوا ہے کہ حکیم فضل الدین صاحب نے پنجاب میں بھی مسلمانوں کے لیے ایسا ہی فنڈ قائم کیا ہے مگر ہم کو اس کا کچھ زیادہ حال معلوم نہیں۔ پس ہم اپنے نوجوان تعلیم یافتہ گریجویٹوں کو صلاح دیتے ہیں کہ اوّل وہ بی اے تک کی ڈگری حاصل کریں اور اسی کے ساتھ وہ صفتیں بھی اپنے میں پیدا کریں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور اس تجارت میں جس کا ہم نے سویلائزڈ تجارت نام رکھا ہے مشغول ہوں۔ اس سے بہتر کوئی طریقہ ان کی اور قوم کی اور ملک کی بھلائی کا نہیں ہے۔

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم، نمبر 4 (دور سوم) بابت یکم محرم الحرام 1313ھ)

■

ماخذ: سہ ماہی 'فکر و نظر'، مارچ 2017، جلد: 54، شمارہ: 1، ایڈیٹر: ڈاکٹر راحت ابرار)

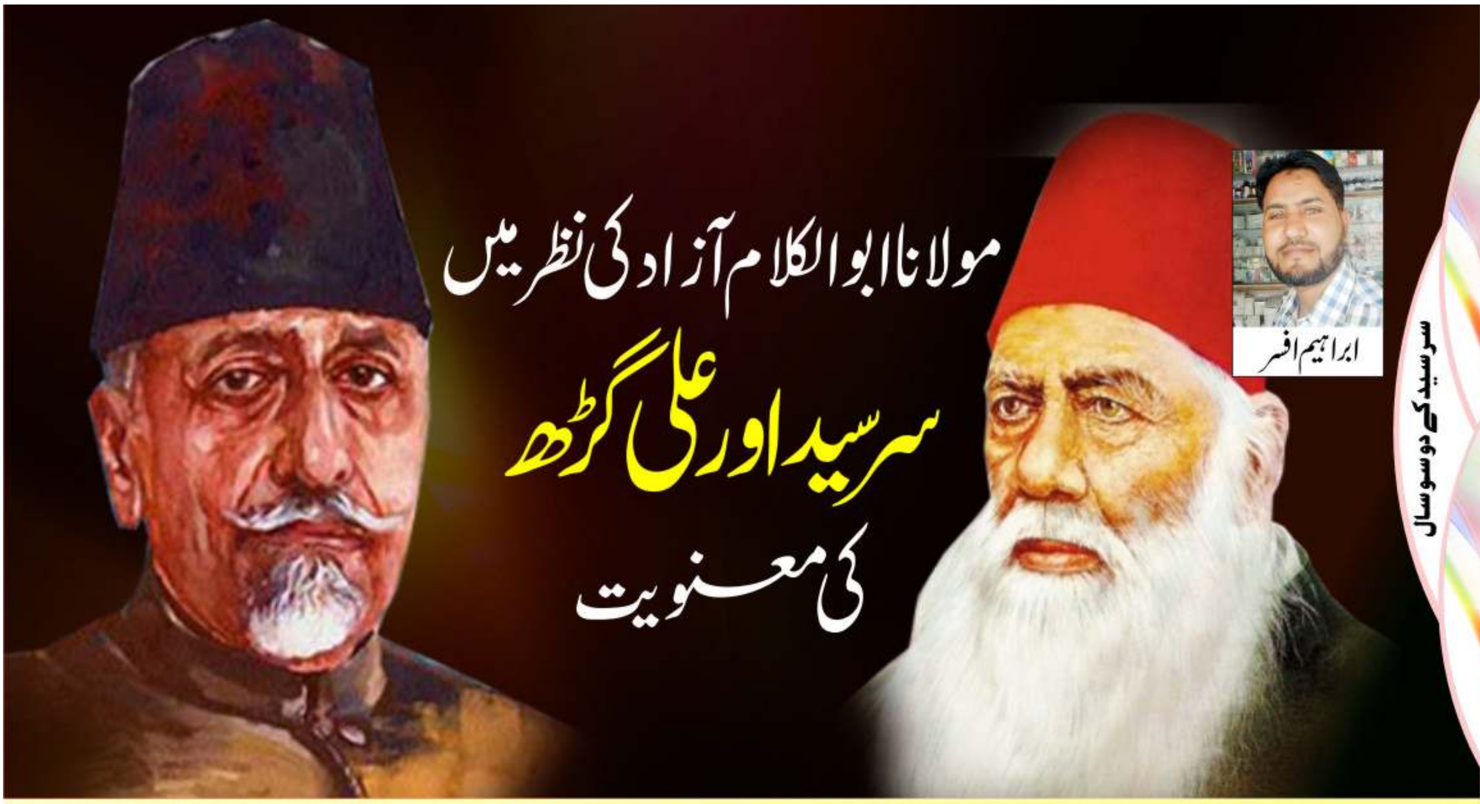

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں سرسید اور علی گڑھ کی معنویت

ابراہیم افسر

سر سید احمد خاں (1817-1898)، سر محمد اقبال (1877-1936) اور مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) ان تینوں مصلحین و مفکرین حضرات نے اپنے زورِ قلم سے نہ صرف اُردو ادب کو فروغ دیا بلکہ اپنے نظریات و خیالات سے غفلت میں ڈوبی ہوئی مسلم قوم کو بیدار کرنے کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی لازمی ہے کہ ''سر سید احمد خاں کے بعد تعلیمی اور سیاسی محاذ پر اگر کسی نے ان کی پیروی یا تتبع کیا تو ان میں ایک نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی اپنا فرض نبھاتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کو سچا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے، مرکزی لائبریری کا نام بھی' مولانا آزاد لائبریری' رکھا۔ اس لائبریری کا سنگِ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے 12/نومبر 1956 کو رکھا تھا۔ اس کا باقاعدہ افتتاح پنڈت نہرو نے ہی 6/اکتوبر 1960 کو کیا لیکن میرا مقصد یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات اور تفکرات کے بارے میں کوئی تعریف و توصیف کرنے کا نہیں بلکہ مولانا آزاد کی نظر میں سر سید احمد خاں اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی معنویت، اہمیت و افادیت کو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں 20/فروری 1949 کو دیے گئے کانووکیشن سالانہ خطبے کی روشنی میں، اجاگر اور واضح کرنا ہے۔ یہ خطبہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دورِ حاضر میں طلبا کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

یہاں یہ تحریر کر دوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد سر سید احمد خاں کی وفات سے دس برس قبل اس دُنیا میں آئے۔ جب انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو سر سید احمد خاں اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے لگائے ہوئے تعلیمی پودے (مدرسۃ العلوم۔ ایم اے او کالج، 24 مئی 1875) نے پورے ملک میں تعلیم کے میدان میں تناور درخت بن کر اپنی خاص پہچان بنالی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کالج میں اُس وقت کے زیادہ تر امرا و نوابین کے صاحب زادوں کے علاوہ دور دراز سے تعلیمی شوق اور ذوق رکھنے والے طلبا بھی اس میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ بہتر نظم و نسق کی وجہ سے اس ادارے کو 1920 میں مسلم یونی ورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ جو اس ادارے کی مقبولیت میں ایک میل کا پتھر ثابت ہوا۔ آج یہ ادارہ ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک میں بھی اپنی اعلا تعلیمات کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے صدارتی خطبے میں افلاطون کے اس تاریخی واقعے کی جانب طلبا کی توجہ مبذول کرائی جس میں اس نے اپنی درس گاہ کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لکھ رکھا تھا کہ ''جو شخص جیا میٹری نہیں جانتا، اس کے لیے یہاں جگہ نہیں ہے''۔ انھوں نے طلبا سے یہ کہا کہ اس عظیم ادارے کا کتبہ یہ ہونا چاہیے کہ ''جو لوگ جیا میٹری جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے، سب کے لیے یہاں جگہ موجود ہے''۔ یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد کے آفاقی خیالات۔ انھیں نظریات نے انھیں طلبا میں معروف و مقبول بنایا۔

مولانا آزاد ابتدا میں سر سید احمد خاں کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ خاص کر مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کے سر سید احمد خاں کے مشورے پر انھوں نے سخت نکتہ چینی کی۔ سر سید احمد خاں کے سیاسی نظریات پر انھوں نے اپنے اخبار الہلال میں خوب لکھا۔ اس بات کا خلاصہ انھوں نے تب کیا جب انھیں 20/فروری 1949 کو بہ حیثیت مرکزی وزیرِ تعلیم سالانہ کانووکیشن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے خاص طور پر مسلمانوں کے سیاسی شعور اور دورِ حاضر کے حالات کا بہ خوبی اور سنجیدگی اور متانت سے جائزہ لیا اور علی گڑھ سے اپنے روحانی رشتے کو یاد کیا۔ اس خطبے میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سر سید احمد خاں اور مسلم قوم ایک دوسرے کے لیے کیسے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ یہ خطبہ دراصل ماضی، حال اور مستقبل کی یادوں کا آئینہ تھا۔ انھوں نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''آپ کے وائس چانسلر صاحب نے جب یونی ورسٹی کی جانب سے ازراہِ عنایت مجھے دعوت دی کہ اس سالانہ تقریب میں شریک ہوں اور مجلس سے خطاب کروں، قدرتی طور پر میرے ذہن میں بعض گزرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ مجھے بے اختیار یاد آ گیا کہ آج سے 36/برس پہلے میرا سابقہ علی گڑھ سے کن حالات میں ہوا تھا اور اس نے علی گڑھ کے اندر اور علی گڑھ سے باہر کیا اثرات و نتائج پیدا کیے تھے؟

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلمان بہ حیثیت جماعت کے ملک کی تمام سیاسی سرگرمیوں سے صرف الگ ہی نہیں تھے بل کہ سیاسی بیداری کے مطالبہ کے مخالف تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس 27/برس سے ملک

میں قائم تھی اور اپنی زندگی کی تمام ابتدائی منزلوں سے گزر چکی تھی، بجز خال خال افراد کے سوا مسلمانوں کا اس میں حصہ نہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام قائم ہو چکا تھا لیکن وہ بھی اس لیے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سیاسی سرگرمی پیدا کرے بلکہ اس لیے کہ سیاسی سرگرمیوں سے انھیں باز رکھے۔ اُس دور کے مسلمانوں کی سیاست محض ایک منفی سیاست تھی جو ہر مثبت اثر سے اپنے آپ کو بچانا چاہتی تھی، اور جس کی صحیح تعبیر یا سیاست کے تعطّل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ یہی سیاسی تعطّل تھا، جسے اُس وقت کی بول چال میں ''مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے اس سیاسی تعطّل کے لیے اگر چہ مختلف اسباب جمع ہو گئے تھے لیکن اس کی سب سے بڑی ذمے داری مرحوم سرسید احمد خاں کی سیاسی رہ نمائی پر تھی، جو اس تعلیمی ادارے کے بانی اول تھے۔ انھوں نے 1886 میں مسلمانانِ ہند کو نہ صرف کانگریس سے علاحدہ رہنے کا مشورہ دیا، بلکہ سیاسی حقوق کے تمام مطالبوں کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔

'' 1912 میں جب میں نے الہلال جاری کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے کی دعوت دی، تو میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ سرسید مرحوم کی اس سیاسی رہ نمائی پر بلا رُو رعایت نکتہ چینی کروں، اور جو لوگ اُس رہنمائی کے علم بردار تھے، اُن سے تصادم میں آؤں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی گڑھ کے حلقے میں مجھے سرسید مرحوم اور ان کے پیروؤں کا مخالف تصور کیا گیا، اور خیال کیا گیا کہ میں نہ صرف یہاں کی سیاسی رہنمائی کا مخالف ہوں بلکہ سرے سے مخالف اس تعلیمی ادارہ کا ہوں۔ میں نے یہاں 'مخالف' کا لفظ استعمال کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جو لفظ میرے لیے یہاں زیادہ موزوں سمجھا گیا تھا، وہ ''مخالف'' نہیں تھا ''دشمن'' تھا!

(مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، صفحہ 300 تا 301، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2002)

مولانا ابوالکلام آزاد کو بھلے ہی سرسید کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہ ہو لیکن سرسید کے تعلیمی افکار سے انھیں والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ اس وجہ سے مولانا آزاد کو اس یونی ورسٹی کے طالب علموں میں ہندوستان کا مستقبل روشن نظر آتا تھا۔ ہندوستان کی آزادی میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے کردار کو انھوں نے بہ خوبی اپنی تحریروں اور تقریروں میں واضح کیا۔ ساتھ ہی وہ سرسید کی تصنیفات

میں سر سید مرحوم کا مخالف نہ تھا .میں ان کے مداحوں میں تھا مگر یہ مداحی مجھے اس سے باز نہیں رکھتی تھی کہ اپنے سمجھ بوجھ کے مطابق ان کی کوتاھیوں اور غلطیوں کا بھی اعتراف کروں.آج بھی جبکہ 36/برس کی مدت اُس دور پر گزر چکی ھے اور اس عرصے کی پوری داستان ھمارے قبضے سے نکل کر تاریخ کے قبضے میں داخل ھو چکی ھے ,میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ھوں تو مجھے اپنی کوئی رائے بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کی تبدیلی کا خواھش مند ھوں۔

وتخلیقات سے فیض یاب بھی ہوئے اور ان کی تخلیقات کا اثر ان کی ذاتی زندگی پر ہوا۔ مذہبی معاملات میں مولانا آزاد سرسید سے بے حد متاثر تھے۔ وہ سرسید کو اپنا مذہبی رہنما تسلیم کرتے تھے۔ اس بات کا اکثر انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ مولانا آزاد، سرسید کی نثر کے بھی دل دادہ تھے۔ خاص کر تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے مضامین نے ان کی نثری آب یاری میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لیکن بعد میں مولانا آزاد نے سرسید کے اسلوب سے جدا اپنی نئی راہ نکالی اور ایک ایسے طرزِ تحریر سے اُردو دنیا کو رو برو کرایا جس کے موجد ہونے کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔

مولانا آزاد اور سرسید کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مصلحین میں تعلیم نسواں کے معاملے میں بھی اختلاف رہا ہے۔ اس معاملے میں سرسید کی رائے یہ تھی کہ اگر گھر کے مرد حضرات پڑھ لکھ جائیں گے تو گھر کی عورتیں خود بہ خود تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ لیکن مولانا آزاد کا موقف اس کے برعکس تھا۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ ان کے نزدیک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں امتیاز رکھنا ایک گناہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے پہلے وزیرِ تعلیم بننے کے بعد انھوں نے ہندوستان کی تعلیمی پالیسی بناتے وقت اس موقف کو مدِ نظر رکھا اور 'تعلیم سب کے لیے' پر خاص توجہ دی۔

مولانا آزاد، سرسید کے بنائے ہوئے کالج سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ مولانا، علی گڑھ کالج کے حمایتی نہیں ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مولانا آزاد کے سرسید سے سیاسی اختلاف تو جگ ظاہر تھے لیکن وہ اس عظیم ادارے کی معنویت، عظمت کے معترف تھے۔ اپنے کانووکیشن کے خطبے میں طلبا اور اساتذہ کے سامنے انھوں نے اس امر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اپنے جذبات اور احساسات کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ سرسید ان کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی رہنما تھے۔ انیسویں صدی کے اس عظیم مصلح کی عزت اور عظمت مولانا آزاد کی نگاہ میں کیا تھی، اس اقتباس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''میں سرسید مرحوم کا مخالف نہ تھا۔ میں ان کے مداحوں میں تھا مگر یہ مداحی مجھے اس سے باز نہیں رکھتی تھی کہ اپنے سمجھ بوجھ کے مطابق ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا بھی اعتراف کروں۔ آج بھی جبکہ 36/برس کی مدت اُس دور پر گزر چکی ہے اور اس عرصے کی پوری داستان ہمارے قبضے سے نکل کر تاریخ کے قبضے میں داخل ہو چکی ہے، میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کوئی رائے بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کی تبدیلی کا خواہش مند ہوں۔ میرے سامنے بہ یک وقت دونوں باتیں آ رہی ہیں اور مجھے بہ یک وقت ان دونوں کو تسلیم کر لینے میں کوئی دُشواری محسوس نہیں ہوتی۔ میں سرسید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ وہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے اور انھوں نے ملک کے لیے شان دار اصلاحی اور تعلیمی خدمتیں انجام دیں۔ چھتیس برس پہلے میں نے ان کی سیاسی رہنمائی سے اختلاف کیا تھا۔ آج میں یہاں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ان کی شان دار اصلاحی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔''

(مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، ص 302، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت 2002)

سرسید نے تعلیم اور مذہب دونوں کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور اپنے خوابوں کو مدرسۃ العلوم کی شکل میں شرمندۂ تعبیر بھی کیا۔ جس کے اثرات ہمیں آج ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے نہ صرف اپنے کالج میں ہندو مسلم اتحاد کا درس دیا تھا بلکہ اپنے ہندو دوستوں کو انھوں نے کالج میں بلا کر تقاریر بھی کرائیں۔ ان میں ایک بڑا نام ہندوستان کی جنگِ آزادی کے قد آور قومی سطح کے رہنما سریندر ناتھ بنرجی کا ہے۔ سریندر ناتھ بنرجی کو جب انگریز حکومت نے زبردستی جیل خانے میں ڈال دیا تھا تو، ان کی ضمانت کا انتظام و انصرام سرسید احمد خاں نے ہی کیا تھا۔ یہاں تک کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد طلبا کے سامنے علی گڑھ کالج میں سریندر ناتھ بنرجی کا نہ صرف خیر مقدم کیا گیا بلکہ ایک جلسے کا انعقاد بھی کیا گیا۔ سرسید احمد خاں کے

بنائے ہوئے کالج کے دروازے سبھی مذاہب کے طلبا کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو جسم کی دو خوب صورت آنکھوں سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن کچھ شرپسند عناصر نے سرسید کے نظریات کو ہندو قوم و مذہب کے خلاف قرار دیا لیکن مولانا آزاد نے سرسید کی قومی یک جہتی اور یگانگت کی تشریح کو نئے تناظر میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ سرسید ہندو اور مسلم قوم کے باہمی اتحاد و اتفاق کے حق میں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطبے میں ان تمام باتوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگر چہ سرسید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جس سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یک جہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوب صورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادر ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔''

(مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، صفحہ 304، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت 2002)

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ جب یہ عظیم ادارہ قائم کیا گیا تو اس میں مسلم طلبا کے ساتھ ہندو طلبا کی بھی اچھی خاصی تعداد کا اندراج تھا۔ یہ اس بات کا مسلم ثبوت ہے کہ اس ادارے سے ملک کے تمام طبقات فیض یاب ہو رہے تھے اور موجودہ دور میں بھی ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں طلبا اور اساتذہ کے سامنے اُردو رسم الخط کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا۔ کیونکہ اُس وقت ہندوستان سے اُردو کو باہر کرنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ (کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اُردو کو فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط اپنا لینا چاہیے) انھوں نے اس معاملے میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے کردار کی بھر پور تعریف و ستائش کی۔ انھوں نے اپنی بات کو واضح اور مدلل بناتے ہوئے کہا کہ ''آج دور آ گیا ہے کہ ہندو اُردو سیکھیں اور مسلمان ہندی زبان سے گہری واقفیت حاصل کریں۔'' انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ موجودہ دور میں ملک کے بیش تر حصوں سے بہت سارے رسائل و جرائد ہندی اور اُردو زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد گاندھی جی کے اس نظریے کے بھی حامی تھے کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان 'ہندوستانی' ہو۔ مولانا آزاد کے مطابق یہ قومی زبان 'ہندوستانی لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرے گی۔ اس ضمن میں انھیں علی گڑھ کے طلبا اور نوجوانوں سے بہت امیدیں تھیں۔ کیونکہ یہ طلبا ملک کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خطبے کا آخری حصہ جو کہ یونی ورسٹی کے طلبا کے نام موسوم ہے بڑا ہی ولولہ خیز اور انقلابی ہے۔ وہ ایسے نوجوانوں سے خطاب کر رہے تھے جنھوں نے اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا۔ مولانا کے مطابق ایسے طالب علموں پر دُہری ذمے داری تھی۔ ایک تو یہ کہ جب وہ اس عظیم درس گاہ میں داخل ہوئے تھے تو ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم تھا اور آج جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو رہے ہیں تو ملک آزاد ہو چکا ہے۔ پہلے ان طلبا کے سامنے ملک کو آزاد کرانے کا مشن تھا، ان کی فکر بھی محدود تھی۔ لیکن ملک کے آزاد ہونے کے بعد اب ان کے سامنے ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے کا مشن اور ہدف ہے۔ طلبا کا یہی کردار ہندستانی عوام کی زندگیوں میں مثبت نتائج کا ضامن ہے۔ وہ اپنے خطبے کے ذریعے طلبا اور نو جوانوں سے ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں ان کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی طلبا کو اس بات کی بھی یقین دہانی کرا رہے تھے کہ اگر تم اپنے اندر قابلیت رکھتے ہو تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ تمھارے سامنے ترقی اور کامیابی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور روشن مستقبل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ مولانا آزاد کے ولولہ انگیز خطبے کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کے باشندے ہو، جس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقے کے مطابق نشو و نما دے گی۔ ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی ترقیوں کے موقع پیدا کر دیتی ہے۔ اس میں مذہب، نسل، ذات اور فرقہ کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہو کہ تمھارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھل جائیں۔ سیاست، انتظام حکومت، تجارت، صنعت و حرفت، مختلف قسم کے پیشے، کوئی دروازہ ایسا نہ ہو جو تم پر بند ہو، میں تمھیں پوری ذمہ داری کے ساتھ یقین دلاؤں گا کہ آج کوئی دروازہ بھی تم پر بند نہیں ہے۔ ملک کی زندگی کا ہر دروازہ کھلا ہے۔ بہ شرط یہ کہ تم قابلیت کی پختگی، محنت کی سرگرمی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ قدم بڑھا سکو۔ کل تک ہمارا تعلیمی نصب العین بہت پست اور محدود تھا۔ اس یونی ورسٹی کے سند یافتہ اپنی اُمیدوں کا اس سے زیادہ بلند ہدف نہیں رکھتے تھے کہ کوئی بڑی یا چھوٹی سرکاری ملازمت حاصل ہو جائے لیکن اب ضروری ہے کہ قومی آزادی کی فضا تمھاری ہمتوں کو زیادہ اولو العزم، اور تمھارے ولولوں کو زیادہ وسیع کر دے۔ تمھیں اب پُرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈھنا ہے۔ تمھاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہو گئیں اور تمھاری جولانیوں کے لیے اب پُرانے میدان تنگ ہو گئے تم نے سعی و عمل کے جو پُرانے پیمانے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے، وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمھیں نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمھیں نئے بٹوں سے سعی و عمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمھیں اب زندگی کی جد و جہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اُٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درس گاہ سے حاصل کی ہے ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمھارے ملک کی نئی رفعت طلبیوں کا ساتھ دے سکیں۔ میرا دماغ اس بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں رکھتا کہ اگر تم نے وقت کی ترقی پسند قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کر لی جو تمھاری غیر مذہبی جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے، تو تمھارے وطن کی کوئی بلندی بھی ایسی نہیں ہوگی جہاں تک تمھارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہیں ہوگی جو تمھارا استقبال نہ کرے۔''

(مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، صفحہ 311 تا 312، انجمن ترقی اُردو (ہند) اشاعت 2002)

مولانا ابوالکلام کے دیے ہوئے اس خطبے کو 68 سال مکمل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی معنویت، افادیت و اہمیت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس خطبے کو ہر وہ طالب علم پڑھے جو مسلم یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ خطبہ صرف ایک تقریر نہیں ہے بلکہ یہ طلبا کے سامنے سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن کی روداد اور عکاسی ہے۔ یہ خطبہ مولانا آزاد کی زبانی نثر کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

■

Ibraheem Afsar
Ward No.1, Mehpa Chouraha, Nagar Panchayat
Siwal Khas Distt.: Meerut - 250501 (UP)
Mob.: 9897012528
E-mail.: ibraheem.siwal@gmail.com

تعلیم نسواں
سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک

گلشن عبداللہ

ناکام بغاوت کے بعد سرسید احمد خان (17 اکتوبر 1817، 27 مارچ 1898) کواس بات کا شدید احساس ہوا کہ مسلمان اس وقت جس پستی اور تباہ حالی میں مبتلا ہیں۔ انھیں اس دلدل سے نکالنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔یعنی ان کی ذاتی جدوجہد اور یہ تب ہی ممکن ہے، جب یہ لوگ مؤثر ڈھنگ سے جدید تعلیم حاصل کر لیں گے۔سرسید انگریزی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر کے زیادہ قائل تھے۔ اس وجہ سے ان کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہوئی۔ یہاں تک کہ کُفر کا فتویٰ بھی جاری کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود سرسید نے اپنا مشن جاری رکھا۔ ان کے خلوص اور ان کی نیت کو چند دانشوروں نے سمجھ کر ان کا ساتھ دے دیا اور اس طرح سائنٹفک سوسائٹی (1864 غازی پور) اور دیگر مختلف تعلیمی و فلاحی اداروں کے ساتھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد پڑی اس کالج نے 1920 میں دنیا کی ایک اہم مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ سرسید نے جب تعلیمی تحریک شروع کی۔ تو ان کے سامنے بہت سارے مسائل درپیش تھے۔ ایک طرف انگریز مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں بغاوت کے ذمے دار زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ دوسری طرف مسلمان افلاس کے مارے تھے۔ اس طرح انھیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مجبوریوں کے پیش نظر تحریک کے آغاز میں عورتوں کا مسئلہ ابھی نہیں چھیڑا گیا تھا، لیکن دو قدم آگے بڑھ کر ہی وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سوچنے لگے۔ انگریز مصلح خاتون میری کی شہرت کا حال سرسید احمد خان نے بھی سُنا تھا اور وہ اُن سے ملنے کے لیے بڑے مشتاق تھے۔ پھر خوش قسمتی سے لندن جاتے وقت (1869) حُسن اتفاق سے سرسید کی ملاقات جہاز میں سفر کے دوران ان سے ہوئی تو اس ملاقات کو فائدہ بخش پا کر اُنھوں نے اپنے سفر نامہ لندن میں لکھا:

''میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہوئی گو وہ کسی طرح ہو نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے، تو وہ خود کامیاب ہوگی... بہر حال میں خُدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپینٹر کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہے۔ روشن ضمیری حاصل کریں'' (سفر نامہ لندن مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی)

(بحوالہ سرسید احمد خان اور ان کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2006، ص 356)

اس طرح کے حالات میں جب کچھ سدھار آ گیا تو سرسید جہاں بھی گئے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی اُٹھالیا۔ پنجاب میں انھوں نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں، جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں، جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو... تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے''

(سرسید کا سفر نامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس 1884، ص 103) (ایضاً، ص 356)

اسی طرح لاہور میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس (1888) میں بھی لندن کے گرلز اسکولز کی بات کرتے ہوئے کہا: ''میں نے لنڈن میں اپنے دوستوں کی مہربانی سے ایسے زنانہ مدرسوں کو جہاں اشراف لڑکیاں پڑھتی اور رہتی ہیں دیکھا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت عمدگی اور طمانیت اور تعلیم و تربیت کی ان مدرسوں میں ہے۔ ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی سیکڑوں برس درکار ہیں۔ (سرسید کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین کشمیری بازار لاہور 1890 ص 66) (ایضاً، ص 356)

سرسید کو بعض حضرات نے تعلیم نسواں کا مخالف بھی قرار دیا ہے جبکہ سرسید تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں عورتوں کے لیے مضامین شائع کیے۔ سائنٹفک سوسائٹی لکچر سیریز کے تحت عقد بیوگان اور تعداد ازدواج کے حوالے سے لیکچر دیے۔ انگلینڈ میں جب وہاں کی پڑھی لکھی عورتوں کو دیکھا، تو انھیں یہاں کی عورتیں یاد آئیں اور پھر لکھا:

''یورپی عورتوں کو یہ سن کر ہندوستانی عورتیں عموماً ناخواندہ ہوتی ہیں ویسا ہی صدمہ ہوگا جیسے کہ کسی ہندوستانی کو بازار میں ننگی عورت کو چلتے پھرتے دیکھ کر ہوتا ہے''۔

(تہذیب الاخلاق، جلد 35، شمارہ 10، اکتوبر 2016، مدیر صغیر افراہیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص 204)

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انھوں نے تہذیب الاخلاق میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق مضامین لکھے۔ ڈاکٹر قدسیہ انجم کا ماننا ہے کہ سرسید نے عمدہ تہذیب پیدا کرنے کے لیے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے 29 نکات بیان کیے ہیں۔ وہ مزید لکھتی ہیں:

''عورتوں کی تعلیم سے متعلق سرسید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ لڑکیوں کو معاشرے ادب، تہذیب سیکھنی چاہیے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے لیے قابل استانیوں کا انتظام کروایا جائے جو انھیں اپنے گھروں میں محفوظ تعلیم دے سکیں۔ یا پھر یہ کہ لڑکیوں کے لیے ایسے اسکول کھولے جائیں جہاں اشراف اپنی لڑکیوں کو اس اعتماد کے ساتھ بھیج سکیں کہ وہاں ان کے لیے پردے کا معقول و مناسب انتظام ہوگا'' (ایضاً، ص 205)

دھیرے دھیرے مسلم عورتوں کی اعلا تعلیم کے سلسلے میں سرسید تحریک کے تحت بہت سارے مباحثے بھی قائم کیے گئے۔ یہاں تک کہ زنانہ مکتب کھولنے کی بھی پیش کش کی گئی۔ ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاسوں میں عورتوں کی تعلیم کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ خواجہ غلام الثقلین ان دنوں بی اے میں زیر تعلیم تھے اور ایک بار سرسید نے انھیں گلے لگا کر کہا:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں تعلیم نسوان کا مخالف ہوں، ان کو بتا دو کہ بات غلط ہے۔'' (ایضاً، ص 205)

سرسید نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اخلاق میں نیکی اور رحم پیدا کرو۔ اپنی اولاد کی

بہتر پرورش کرو، اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ۔''

(ایضاً، ص 206)

سرسید نے تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ہنرمندی پر بھی زور دیا اور وہ علم میں عمل کا ہونا بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ کردار سازی پر بھی یقین رکھتے تھے۔ سرسید کے ساتھیوں میں خواجہ غلام الثقلین، سید کرامت حسین اور ممتاز علی نے تعلیم نسواں کو فروغ دیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد نذیر احمد اور حالی نے تعلم نسواں کے لیے اہم رول ادا کیا۔

سرسید کے رفقا بھی اس کوشش میں لگے رہے کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں چند موثر اقدامات کیے جائیں۔ ڈراما انارکلی کے خالق سید امتیاز علی تاج کے والد سید ممتاز علی سرسید کے ایک خاص دوست تھے۔ لاہور میں ان کا ذاتی اشاعتی گھر تھا اور وہ مختلف فلاحی کام کرتے تھے۔ انھوں نے عورتوں کے لیے ایک رسالہ نکالا، جس کا نام 'تہذیب نسواں' تھا۔ ان کے دیگر رفقا میں غلام الثقلین اور کرامت حسین بھی مختلف تعلیمی کانفرنسوں میں عورتوں کی تعلیم کی تحریک و تائید پیش کرتے تھے۔ علی گڑھ سے (1896) باضابطہ طور پر اب عورتوں کی تعلیم کی تحریک شروع ہوگئی اور اس کام میں مولوی کرامت حسین، نواب محسن الملک، آفتاب احمد خان، سلطان احمد خان، حاجی اسمٰعیل خان، مولوی بہادر، سید امیر علی، غلام الثقلین جیسے دانشور پیش پیش رہے۔ تعلیم نسواں کا دائرہ پھیلتا گیا۔ مختلف کمیٹیاں بنائی گئی۔ ہر صوبے میں گرلز اسکول کھولے گئے۔ ان کا نصاب باضابطہ طور پر تیار کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ و دیگر رسالوں میں تعلیم نسواں کے بارے میں مضامین بھی چھپنے لگے۔ (یہاں جگہ جگہ افراد اور تاریخوں کے سلسلے میں ثریا حسین کی کتاب 'سرسید احمد خان اور ان کا عہد'، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2006 سے استفادہ کیا گیا)

سرسید کے انتقال کے بعد ان کے ساتھیوں اور شاگردوں نے ان کے مشن میں ہر سمت میں نئی جان پیدا کر دی۔ اس حوالے سے سب سے اہم نام شیخ عبداللہ (1874-1965) کا آتا ہے۔ وہ مشہور ترقی پسند ادیبہ ڈاکٹر رشید جہاں (1905-1952) کے والد تھے۔ اور ان کا اصل نام تھا کرداس تھا۔ جو سرسید کے زیر اثر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا اصل وطن ضلع پونچھ ریاست جموں و کشمیر تھا۔ علی گڑھ میں اعلا تعلیم حاصل کر کے وہیں وکالت کرنے لگے۔ ساتھ ہی تعلیم نسواں کی تحریک چلا کر گرلز اسکول کی بنیاد ڈالی۔ جو آج کل وہاں وومنز کالج کی حالت میں موجود ہے۔ انھیں پاپا میاں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حالی نے اپنی مشہور نظم 'چپ کی داد' میں ان کی طرف اشارہ کیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ان کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے:

''شیخ عبداللہ کی شخصیت حقیقت میں سرسید کے کمالات کا پرتو اور ان کی تحریک کا تتمہ تھی۔ وہی عزم، وہی خلوص، وہی دلسوزی، وہی دلنوازی۔ انھوں نے نہ صرف سرسید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا اور اس کی بنیادیں استوار کیں۔ بلکہ قومی فلاح و بہبود سماجی اصلاح و تربیت کا ایک نیا اور وسیع میدان پیدا کر لیا۔'' (سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے: پروفیسر خلیق احمد نظامی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1993، ص 251، نئی دنیا 28-22 نومبر 2012، ص 9)

انھیں طالب علمی کے زمانے میں ہی ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت 'شعبہ عورتوں کی تعلیم' کا سکریٹری سرسید نے مقرر کیا۔ دسمبر 1902 میں دہلی میں سر آغا خان کی صدارت میں جو تعلیمی کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی، اس میں شیخ عبداللہ کو تعلیم نسواں کے لیے معتمد مقرر کیا گیا۔ اس طرح ان کی رہنمائی میں یہ تحریک زیادہ فعال ثابت ہوئی۔ دسمبر 1903 میں ممبئی میں 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' منعقد کی گئی، اس میں چلمن کی پیچھے بیٹھ کر عورتوں نے بھی شرکت کر کے اپنے اپنے مسائل اور تجاویز پیش کیے۔ جولائی 1904 میں شیخ عبداللہ نے علی گڑھ سے ہی عورتوں کے لیے ایک رسالہ 'خاتون' کے نام سے جاری کیا۔ اس کا مقصد عورتوں میں تعلیم کا رواج تھا اور یہ کام اس رسالے نے 1914 تک بحسن خوبی انجام دیا۔

اس رسالے میں بڑے بڑے مرد قلم کاروں کے ساتھ ساتھ خواتین قلم کاروں کی نگارشات بھی شائع ہوئی تھی۔ ان میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں۔

محمدی بیگم (ممتاز علی کی بیوی) بنت نذر الباقر (نذر سجاد یعنی سجاد حیدر یلدرم کی بیوی اور قرۃ العین حیدر کی ماں) نفیس دلہن (بیگم حبیب الرحمٰن خان شیروانی) ز۔ خ۔ ش (بنت نواب مزمل اللہ خان) وغیرہ۔

1904 کا اجلاس لکھنو میں منعقد ہوا۔ اس میں جسٹس شاہ دین اور تھیوڈور ماریسن نے عورتوں کی تعلیم پر سخت زور دیا۔ 1905 میں علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ایک یادگار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار موافقین اور مخالفین کو کھل کر بولنے کا موقع دیا گیا۔ دوسری اہم بات اس کانفرنس میں یہ سامنے آئی کہ یہاں صدر محفل خلیفہ محمد حسین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پردے میں لڑکیوں کو اسکول بھیجا جائے۔ لڑکیوں کے لیے بورڈنگ ہاؤس ہو اور ان کی نگرانی کے لیے خالص عورتیں ہی ہوں اور وہاں باضابطہ طور پر کھیل کود کا بھی انتظام ہو۔ تو اس طرح اس کانفرنس میں ان کی باتوں پر سبھی لوگوں نے اتفاق کیا۔

شیخ عبداللہ کی کوششوں سے لیفٹیننٹ گورنر یوپی سے مل کر 19 اکتوبر 1906 کو اُستانی اختری بیگم کی نگرانی میں علی گڑھ میں پہلا گرلز اسکول قائم کیا گیا۔ یہ اسکول ترقی کے زینے طے کرتا گیا۔ 1908 میں اس کے لیے چودہ بیگہ زمین خریدی گئی اور 7 نومبر 1911 کو اس کی سنگ بنیاد لیڈی پورٹر (لیفٹیننٹ گورنر کی بیوی) نے بہت سارے ہندو اور مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں کی موجودگی میں ڈالی۔ اس شاندار تقریب میں تعلیم نسواں اور عورتوں سے متعلق مختلف مسائل پر بھی گفت شنید کی گئی۔ آگے چل کر Family Education Society اور 1913 میں پہلی Muslim Ladies Confrence عمل میں لائی گئی۔ اس طرح نواب بھوپال سلطان جہاں بیگم، نفیس دلہن، زہرہ فیضی، محمودہ بیگم جیسی باوقار اور روشن خیال عورتیں ان پروگراموں میں دور دور سے آ کر شرکت کر کے عورتوں کے مختلف مسائل پر غور و خوض کرتی رہیں۔

1914 میں مسلمان لڑکیوں کے لیے پہلا بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا، جہاں اپنی لڑکیوں کو رکھنے سے لوگ پہلے پہل بہت کتراتے تھے، لیکن جب شیخ عبداللہ نے اپنی تین لڑکیوں کو اس میں رکھا۔ تو نو لڑکیوں سے شروع کر کے اس بورڈنگ ہاؤس میں اضافہ ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے علی گڑھ سے باہر بھی لڑکیاں آنے لگیں اور اس طرح 1919 میں یہ اسکول بن کر یوپی بورڈ سے ملحق ہو گیا۔ 1029 میں یہ انٹر میڈیٹ کالج ہو گیا اور 1930 میں اس کا الحاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا گیا۔ 1933 میں بی اے کلاسوں کی تجویز پیش ہوئی اور اس طرح یہ کالج آگے بڑھتا گیا۔

ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے 1949 میں اس کا معائنہ کر کے اس کے لیے اسپیشل گرانٹ فراہم کی، تو اس طرح آج یہ کالج ہندوستان میں ایک اہم تعلیمی ادارہ مانا جاتا ہے اور یہاں PG کورسوں کے ساتھ ساتھ بہت سارے ٹیکنکل کورسز بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم نسواں کا دائرہ صرف وومنس کالج تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ پوری یونیورسٹی میں طلباء کے ساتھ ساتھ طالبات کی کثیر تعداد ہر سال رہتی ہے۔ اسی لیے سپریم کورٹ کی ایڈووکیٹ رعنا پروین صدیقی صاحبہ کا کہنا ہے کہ ''اے ایم یو سے دختران ملت کی ایک بڑی تعداد ہر سال اعلا تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اعلا تعلیم یافتہ ایک ماں کی آنکھوں میں اپنے بچے کو علم کے اخلاق تک پہنچانے کا ہی خواب ہوگا۔ اب دختران ملت بھی سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں۔ (نئی دنیا، دہلی 28-22 اکتوبر 2012، ص 9)

■

Gulshan Abduallah
R/o: Darauladab, Farashgund, Soibugh
Budgam Kashmir - 191111 (J&K)

روشن خیالی کی تفہیم وتعبیر اور قمر رئیس

سید یحییٰ نشیط

روشن خیالی بالعموم قدامت پرستی کی نقیض اور بنیاد پرستی کی متبائن سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات اسے دور اندیشی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ وسیع النظری اور آزاد مشربی بھی اس کے متبادل معنی میں مستعمل تراکیب ہیں۔ یہی وہ داعیہ ہے جس نے انسان کو اقصائے عالم سے روشناس کرایا۔ یہی وہ انسانی فطرت ہے جس کے بدوں نئے آفاق تلاشنا، نئی جہات کو ڈھونڈنا اور خوب سے خوب تر کی جستجو کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طبع انسانی میں یہ داعیہ پیدا ہونے کے عوامل میں اولاً انسان کے اندرون سے ابھرنے والا وہ اضطراب ہے جو اسے ہرنئی اور مفید چیز کی طرف مائل کرتا ہے۔ ثانیاً انسان کا وہ ادراک اور فہم ہے جو جذبات کو متحرک کرتا ہے اور ثالثاً انسان کی اپنی قوتِ فیصلہ ہے جو اس کے ذوق وشوق کے تابع رہتی ہے۔ ان کے علاوہ آدمی کی اپنی عصری حسیت، جس کی کسوٹی پر وہ مستقبل کے منفعت بخش لمحات کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آدمی کا شعور ووجدان اور رجحان ومیلان نیز قوتِ ارادہ میں استحکام، یہ امور بھی داعیہ پیدا کرنے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ ان تمام عوامل وامور سے متمتع ہونے کے باوصف روایتوں کے امین بعض قدامت پرستوں کے یہاں 'روشن خیالی' (اصطلاحاً) شجرِ ممنوعہ ہے۔ ان کا جمود انھیں بنیاد پرستی کے حصار سے باہر نکلنے کی قوت فراہم نہیں کرتا، اس لیے اپنی محدود دنیا ہی کو وہ کل کائنات سمجھ کر مطمئن رہتے ہیں۔ اس کے برعکس روشن خیال لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سماجی روایتوں اور رسومات واعتقادات سے اٹھ کر افاداتِ عامہ کے لیے 'کچھ اور' کی جستجو کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان کی اپنی ذات کا مفاد کارفرما نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کی نفع رسانی کے لیے یہ اقدام کرگزرتے ہیں۔ تاریخ انسانیت اور بشریات کے ابواب شاہد ہیں کہ انسان کی اس روشن خیالی کی وجہ سے کاروانِ بشریت کو نئی راہیں ملیں۔ ترقی کی جہات سے آشنائی ہوئی۔ وقت کے دھارے میں پروان چڑھتے ہوئے انسانی احتیاجات کو رفع کرنے کے لیے آدمی کو نئے وتیرے آزمانے پڑے۔ تلاشِ معاش کی خاطر شکار کی صعوبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے زراعت کے پیشے کو اختیار کرنا، آدمی کی اپنی فراست سے نئے اسباب وعلل تلاش کرنے کی اولین مثال ہے۔ عمرانیات اور علم مدن کے سیکڑوں صفحات انسان کی اس روشن خیالی کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ چاہے وہ غار سے محلوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں تک رہائش کا معاملہ ہو یا جنگل کے گھنے درختوں کے جھرمٹ میں کھیلے جانے والے کھیلوں سے لے کر آج کے اسٹڈیم کے کھیلوں تک تفریحی ترقی ہو، پیپل کے سائے کے نیچے کی پنچایتوں سے لے کر آج کی پارلیمنٹوں تک کی سیاسی ترقیات ہوں، پگڈنڈیوں کے پیدل سفر سے لے کر سپر سونک ہوائی جہازوں کے اسفار ہوں، تمام انسانی تمدنی ترقیات کے پسِ پشت بس اس کے جذبۂ تفحص وتفتیش کے زیرِاثر کام کرنے والی روشن خیالی ہے۔

روشن خیالی کا ایک پہلو حسن تدبر بھی ہے۔ آزاد ذہنوں میں یہ مرتکز ہوتا رہتا ہے۔ یہ غور وفکر کی عملی صورت ہے۔ یہ عملی تدبیر کو بہ احسن طریقے سے انجام دینے کا وصف ہے۔ اس میں روباہی، مکر وفریب، چال بازی جیسے اوصافِ رزیلہ کا شمار نہیں ہوتا یعنی جو مکر وفریب کے ذریعے عوام الناس کو نقصان پہنچاتا ہے وہ 'روشن خیال' نہیں ہوسکتا اور مکر وفریب کا اس کا یہ عمل حسن تدبر میں شمار نہیں ہوسکتا۔

ابھی تک جو تذکرہ ہوتا رہا ہے وہ 'روشن خیالی' کے لغوی معنی کے ضمن میں تھا۔ لیکن اردو میں اس کے اصطلاحی معنی مغربی ادب کے 'Libralism' سے مستعار ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے ایک اور لفظ Enlightenment بھی مستعمل ہے۔ فرانس میں روشن خیالی کی تحریک مذہب کے جبر کے خلاف حریت پسندی کے تحت وجود میں آئی۔ اس تحریک کے آغاز کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ڈیکارٹ کے مشہور قول ''میں سوچتا ہوں، اس لیے کہ میں ہوں''، سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ بعض بوکیچو (Boccaccic) (م 1375) کے نشاط پرور افکار کو (Enlightenment) کی ابتداء اور نشاۃ ثانیہ کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ بوکیچو نے آدمی کی زندگی کے متعلق 'اذیتِ پیہم' کے کلیسائی تصور کے برعکس 'نشاطِ حیات' کا نسخہ لوگوں کے سامنے رکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ 'حیاتِ انسانی حسرتوں کا جنجال نہیں ساری اور مسرتوں کا خزینہ ہے۔' بوکیچو نے اپنے خیالات کی تشہیر کے لیے Decameron نام کی کتاب بھی لکھی۔ اس میں الف لیلہ کی طرز پر سو کہانیاں لکھی گئی تھیں، جس کی نشاطیت نے اسے بعد میں Human Comedy کے نام سے مشہور کردیا اور دانتے کی 'طربیہ خداوندی' کی طرح اسے 'طربیہ انسان' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ بہرحال روشن خیالی کی یہ تحریک کلیسائی مذہب کے سخت اصولوں میں نرمی پیدا کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی یعنی 'آزادی ذات' کو منوانے کے لیے یہ جدو جہد تھی۔

میدان ادب میں اس کا مظاہرہ برسوں ہوتا رہا اور آج بھی روشن خیالی کے لیے دامنِ ادب تنگ نہیں ہے۔

مغرب کی طرح مشرقی ادب میں بھی روشن خیالی کی وجہ سے روایتوں کا انہدام ہوا۔ قدیم ادبی قدروں سے ادبا وشعرا منحرف ہوئے اور ادب کی نئی جہات اور نئی سمتوں سے آشنائی ہوئی۔ اس ضمن میں اموی دور کے مشہور عربی اباحی شاعر عمر بن ابی ربیعہ کا نام لیا جاسکتا ہے جس نے اپنی روشن خیالی سے عربی غزل کی روایتی قدروں کو موڑ کر غزل میں ایک سحر آگیں انقلاب پیدا کیا۔ عمر کی روشن خیالی کا یہ اثر ہوا کہ صنف غزل عربی کی تمام اصناف میں مقبول ومحبوب ہوئی۔ عمر بن ابی ربیعہ کی روشن خیالی کا ثبوت ڈاکٹر طٰہٰ حسین یوں پیش کرتے ہیں:

''وہ (عمر بن ابی ربیعہ) عورت کے لیے بھی اسی طرح آزادی کا قائل تھا جس طرح مرد کے لیے۔ وہ چاہتا

تھا کہ عورت بھی اپنے حسن و جمال اور اپنی کشش و پرکاری پر اسی طرح فخر کرے، جس طرح مرد اپنی بہادری اور طاقت پر کرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ انسانی برادری عورت کی عادات واطوار اور اندازِ گفتار سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہو، جس طرح وہ مرد کی عادات و اطوار سے لطف لیتی ہے۔''

(بحوالہ: عربی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، دہلی 1989 جلد سوم ص 263)

عربی شاعری کی طرح عربی نثر کو بھی روشن خیالی نے بام عروج پر پہنچایا۔ قدما میں جاحظ، ابن ندیم وغیرہ کی روشن خیالی سے نثری موضوعات اور نثری اصناف میں تجربات ہوئے۔ یہ سلسلہ طہٰ حسین تک پہنچتا ہے۔ ان کی روشن خیالی کی وجہ سے عربی نثر کو مغربی ادب کے موضوعات اور اصناف ملے اور عربی ادب میں عالمی رجحان پہنچنے میں مدد ملی۔ فارسی میں بابا طاہر، خیام وغیرہ اپنے زمانے کے روشن خیال شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ظہوری، میرزا جعفر اور فتح علی اخوند زادہ (مصنف وکلائے مرافعہ) وغیرہ کی فارسی تصانیف میں بھی ان کی روشن خیالی کی جھلک نمایاں ہے۔ اردو میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء اردو زبان وادب اور تہذیب وملت کے حق میں روشن خیال تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مقدمہ شعر وشاعری اس پر دال ہیں۔ انھوں نے قدیم روایاتِ ادبیہ و دینیہ کے احترام کے ساتھ ان کی نئی ضرورتوں پر مجتہدانہ انداز میں غور کیا۔ حالی کی اردو شاعری میں تجدید کا عمل ان کی روشن خیالی کا مظہر ہے۔ سرسید کے رفقاء کی روشن خیالی ہی کی وجہ سے اردو میں ریاضی، تاریخ، جغرافیہ جیسے علوم عصریہ و متداولہ کی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

پروفیسر قمر رئیس میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ انھیں نہ اپنی پروفیسر شپ کا غرہ نہ بیرونی ممالک کی وزیٹنگ پروفیسر شپ کا گھمنڈ۔ ان کا سادہ اور بے ضرر طرزِ حیات دوسروں کی نفع رسانی کی جہات تلاش کرنے والا تھا۔ یوں تو روشن خیالی کو اکثر مذہبی امور میں عدم دلچسپی پر محمول کیا جاتا ہے، بلکہ فی زمانہ تو منکرِ مذہب کو روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اوصاف دوسروں کی دل شکنی کا سبب بن سکتے ہیں۔ آج کے اس قبیل کے روشن خیال دھڑلے سے اپنے عمل، اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعے لوگوں کو ایذا پہنچانے میں عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے ایک قسم کا وقار سمجھتے ہیں۔ قمر رئیس ایسی منفی فکر رکھنے والے روشن خیال نہیں تھے۔ وہ تمام مذاہب کی عزت کرتے اور ان کے ماننے والوں کے عقائد کا احترام کرتے تھے۔

مذہب کو افیون کی گولی سمجھنے والی تنظیم سے جڑے ہونے کے باوصف قمر رئیس مذہب کا احترام کرتے تھے، نواسے کو کلمہ یاد کراتے تھے۔ گویا تصوراللہ ان کے قلب وذہن میں کہیں بڑی گہرائی میں منور تھا۔ وہ کبھی کبھار عید کی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ یہ تمام شخصی خصوصیات ان کی وسیع الذہنی اور روشن خیالی پر دلالت کرتی ہیں۔

قمر رئیس جس طرح سماجی، معاشرتی اور گھریلو معاملات میں روشن خیال تھے، ان کی ادبی تخلیقات اور تنقیدی نظریات میں بھی روشن خیالی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اردو کی بورژوا ادبی تخلیقات کے ذریعے ترقی پسند ادب کے نام پر پھیلائی جاتی رہی مایوسی اور ادعائیت کے خلاف لکھے جانے والے نعرے بازانہ ادب کی قنوطیت پسندی کو قمر رئیس نے باوجود ترقی پسند ادب وتنقید کے ہم نوا ہونے کے پسند نہیں کیا اور اس کی شدت سے مخالفت کرتے رہے۔ بقول محمد علی صدیقی:

''قمر رئیس نے بڑی استقامت کے ساتھ ادب کے ایک ایسے نصب العین پر اصرار کیا ہے جو زندگی کی عکاسی پر یقین رکھتا ہے، جس سے زندگی کرنے کو حوصلہ ملے۔ یہ حوصلہ محض خواب دکھانے اور خواب دیکھنے سے حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ ان خوابوں میں عوامی آرزوؤں اور امنگوں کے زندگی پرور رنگ بھرنے سے حاصل ہوسکتا ہے''۔ (بحوالہ انشا، قمر رئیس نمبر کولکتا ص 99)

قمر رئیس کی تنقید پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ چونکہ ان میں روشن خیالی کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا اس لیے باوجود ترقی پسند ہونے کے انھوں نے جامد نظریاتِ ادب اور زندگی کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ اس کے نئے آفاق ڈھونڈتے رہے۔ ان کی روشن خیالی نے تصوف واساطیر سے لے کر کیوبزم کے دریچوں تک کو ایوانِ ادب میں وا کرنے کے عمل کو بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔

ترقی پسندوں کی بھیمڑی (بھیونڈی) کانفرنس میں ایک ایسا مینوفیسٹو تیار کیا گیا تھا جس میں ترقی پسندوں نے ایسا شدت پسندانہ رویہ اختیار کیا جو تحریک کو جامد اور معطل کرسکتا تھا۔ اس منشور کے چند نکات اس طرح تھے۔

(1) ہم ترقی پسند اسی کو کہیں گے جو کسی سوشلسٹ نظریے کا پابند ہو۔

(2) جو مظلوموں کی طبقاتی جنگ میں حریف نہیں حلیف کی حیثیت سے شریک ہونے کی جرأت کرسکتا ہو۔

(3) جو معاشرے میں موجود طبقاتی آویزش کی جدلیاتی بنیاد پر توضیح کرسکے۔

اس منشور میں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں پر چند پابندیاں عاید کردی گئی تھیں۔ یہ قدغن بعض ترقی پسند ادیبوں کو گوارا نہ تھے۔ چنانچہ احتشام حسین، ڈاکٹر علیم، مجنوں گورکھ پوری اور دیگر ناقدین نے اس سے اختلاف کیا کیونکہ وہ ادب کے بین الاقوامی تناظر کا خیال رکھتے تھے۔

اس وقت دونوں عالمی جنگوں کے بعد کے عالمی ادب کا جائزہ لینا ناگزیر تھا، تاکہ نئے افکار ونظریات اور نئے زاویۂ نگاہ دریافت ہوسکیں۔ وہ لوگ cliche کے حصار میں بند ترقی پسند فطرت کے خلاف سمجھتے تھے۔ جنگِ عظیم کے بعد کے حالات میں لبرازم اور روشن خیالی Enlightenment بھی ان کے نزدیک ترقی پسندی سمجھی جانے لگی تھی۔ قمر رئیس ان حقائق کا معروضی انداز میں یوں تجزیہ کرتے ہیں:

''ترقی پسندیت کوئی جامد چیز تو ہے نہیں، بلکہ یہ ایک زاویۂ نظر ہے جو معروضی حالات کو سائنسی اور جدلیاتی انداز میں سمجھنے اور اس کی توجیہہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ زندگی کی مثبت قدروں کی طرف ایک ایسا رویہ ہے جو انسانوں کے لیے پرمسرت معاشرے کی تشکیل میں معاون ہوسکتا ہے۔''

(کراچی 1986 میں دیے گئے قمر رئیس کے انٹرویو کا ایک اقتباس: انشا، قمر رئیس نمبر) قمر رئیس کی اس روشن خیالی کے کئی ابعاد ان تحریروں اور انٹرویو میں دکھائی دیتے ہیں جن میں کھل کر انھوں نے ترقی پسندی کے لیے اپنا عندیہ بیان کیا ہے۔

بھیمڑی کانفرنس کی بازگشت پاکستان کی انجمن ترقی پسند کانفرنس میں کچھ اور شدید ہوگئی تھی۔ وہاں کے منشور میں تو نام بنام ان ادیبوں کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا جنھوں نے وہاں کی سرکاری مراعات قبول کرلی تھیں۔ اس کانفرنس کی قرار داد میں ترقی پسند رسائل اور ان کے مدیروں کو کہا گیا تھا کہ:

''عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، حسن عسکری، ممتاز شیریں، سعادت حسن منٹو، ن م راشد، ممتاز مفتی، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، محمد دین تاثیر اور اس قسم کے دوسرے رجعت پسند ادیبوں کی تحریروں کو اپنے رسائل میں جگہ نہ دیں۔'' (عبداللہ ملک: 'مستقبل ہمارا ہے' ص 60)

انجمن ترقی پسند پاکستان کے ان واقعات کو قمر رئیس 'غیر جمہوری، تنگ دلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ' کہتے ہیں۔ اس قرارداد سے پاکستان کے ادیب ترقی پسند اور رجعت پسند دو حصوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ہند وپاک میں اس منشور سے ترقی پسند تحریک کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن قمر رئیس نے اس واقعے کے ردعمل میں ہونے والے فائدے بھی تلاش کرلیے تھے۔ منشور کی اس غلطی کو انھوں نے "Boon" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''(اس واقعہ کے بعد) ہند وپاکستان کے بے شمار ادیبوں نے اب زیادہ آزاد فضا اور اپنے فکر ونظر کی روشنی میں تخلیق کا بیڑا اٹھایا..... انھوں نے قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال کو اپنے غور وخوض، تجربہ اور مطالعہ کے زیادہ

معتبر وسائل سے دریافت کیا۔ خاص طور سے پاکستان کی عسکر شاہی، سامراج دوستی، جاگیرداری نظام کے جبر و تشدد اور ملائیت کے حوالے سے اعلیٰ درجے کا مزاحمتی ادب تخلیق اور شائع ہوا..... یہ عجیب بات ہے کہ جب تحریک میں ٹھہراؤ آیا تو تخلیق میں پختگی اور ٹھہراؤ کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ کرشن چندر ہوں بیدی ہوں، عصمت چغتائی..... سب نے اپنے نو بہ نو فن پاروں میں ترقی پسندی کو ایک نئے معنی و مفہوم سے ہمکنار کیا اور فنی میدان میں ترقی پسند روایات کو نئی توسیع دی نئے امکانات سے آشنا کیا۔"

(ترقی پسند ادب کے معمار، مقدمہ: پروفیسر قمر رئیس: نیا سفر پبلی کیشنز دہلی 2006، ص 39-38)

روشن خیالی، تنگ نظری کی متبائن فکر ہے۔ روشن خیال شخص ذات کے بارے میں نہیں کائنات کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ مجرد فرد کی نہیں سماجی انسان کی بات کرتا ہے۔ وہ کمٹ مینٹ یا لبرلزم اور افادیت و مقصدیت کو کمیونزم میں قدر زائد نہیں سمجھتا، بلکہ اسے لازمی ضمیمہ تصور کرتا ہے۔ وہ ادب میں ایسے شعور حیات کو پروان چڑھانا چاہتا ہے جو عصری حالات کی رستخیزی اور کشاکش حیات کے تجربوں سے گزر کر کئی نسلوں میں منتقل ہوتا رہے۔ قمر رئیس نے اپنے مضمون 'غالب اور جدید کلاسکی غزل' میں ان امور پر بحث کی ہے۔ اور اسی فکر کو عام کرنے کے لیے 'عصری آگہی' بھی جاری کیا تھا جو دقیانوسیت، بنیاد پرستی اور روایت پرستی کے بڑھتے ہوئے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ایک 'روشن چراغ' بن گیا تھا۔ اس رسالے کے اداریے قمر رئیس کی روشن خیالی کی نظیر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے ادب اور ثقافت ہی کے لیے نہیں بلکہ مذاہب و معاشرت کے لیے بھی اس رسالے کے صفحات مختص کر رکھے تھے اور اصغر علی انجینئر سے متواتر لکھواتے رہے۔

قمر رئیس نے تنقید میں اپنی 'علمی دھاک' قائم کرنے کے لیے نہ تاریخ نہ علم مدن، نہ بشریات و عمرانیات اور نہ فلسفہ و منطق کے طول طویل حوالوں سے کام لیا۔ ان کے نزدیک "حقیقی نقاد اسی وقت اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے، جب وہ نہ صرف شعور کی سطح پر فن پاروں کی تہ در تہ کیفیات کو اپنے معنوی وجود کا حصہ بنالے گویا قمر رئیس تنقید میں عقل و دل دونوں کے متوازی رویے کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ معاصر تنقید سے مطمئن نہیں تھے۔ اپنی کتاب "تنقیدی تناظر" میں انھوں نے اپنی اس بے اطمینانی کا برملا اظہار کیا تھا۔

"آج بعض باشعور اور ذہین نقاد بھی اصولوں کے ادعا کے باوجود محض ذاتی پسند یا ناپسند کی میزان پر فیصلہ کر رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، ان کے اکثر تنقیدی محاکے تنگ نظری، تعصب اور ایک رخی فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں ایسا جوش، ایسی جھنجھلاہٹ اور اتنا جذباتی خروش ہوتا ہے کہ اصول منہ تکتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فیصلے منصفانہ یعنی معروضی اور علمی جانچ پرکھ کا منطقی نتیجہ معلوم نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے کہ نئی تنقید نئے ادب کی تفہیم و تعبیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکی۔"

(قمر رئیس: تنقیدی تناظر: احتشام حسین اور عصری تنقید کے مسائل)

مندرجۂ بالا تمام مثالیں قمر رئیس کی تنقید نگاری میں روشن خیالی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ تنقید کی طرح اپنی شعری تخلیقات میں بھی قمر رئیس روشن خیال نظر آتے ہیں۔

'شام نو روز' قمر رئیس کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ ان کی 'تخلیقی بازیافت کا انتخاب' ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قمر رئیس نے تہذیب و ثقافت کی روایتوں کی پاسداری، دقیانوسی اور توہم پرستانہ خیالات کے تابع رہ کر نہیں، اپنی روشن خیالی کے زاویۂ نظر سے اور فکر و فہم کے سہارے کی ہے۔ وہ اپنی اکثر منظومات میں وسیع الفکر روشن خیال روایت پسند نظر آتے ہیں، مگر وہ موضوعات جن میں انسانیت اور انسان کے صالح اقدار سے بیزاری عیاں ہوتی ہے قمر رئیس ان کی ترجمانی میں سخت گیر اور ان کی مخالفت میں متشدد نظر آتے ہیں۔

'شام نو روز' کی پہلی نظم 'سراب دشت امکاں' ہے۔ اس نظم میں قمر رئیس نے اپنی 70 سالہ زندگی کا محاسبہ حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے۔ اپنی کوتاہیوں پر ندامت اور مخلصانہ اعمال پر اظہار تشکر والی کیفیات اس نظم میں نمایاں ہیں۔ قمر رئیس شعبہ تعلیم سے جڑے ہوئے تھے۔ درس و تدریس نونہالوں اور نوجوانوں کے روشن مستقبل کو سنوارنے کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ ارسطو نے اس فریضہ کو اوبڑ دھوبڑ پتھر سے خوب صورت موتی نکالنے سے تعبیر کیا ہے۔ قمر رئیس ارسطو کی طرح درس و تدریس کے پیشے کو 'کیمیا سازی' اور طلبہ کو 'کچی دھات' کہتے ہیں۔ 'کارگہ کیمیا سازی' میں ان کچی دھاتوں کو سونا بنانے کا کام استاد کرتا ہے۔ قمر رئیس 40 سال تک اس پیشے سے جڑے رہے۔ محولۂ بالا اپنی نظم میں وہ اپنے 40 سالہ فرائض منصبی کا خود محاسبہ کرتے ہیں کہ آیا انھوں نے اپنے پیشے کے ساتھ انصاف بھی کیا یا نہیں کیا؟ اور کچی دھاتوں کو کندن یا سونا بنایا یا صرف ان پر ملمع سازی کی ہے۔ اس خود احتسابی میں Odysseus کی نقالی نہیں 'بندۂ حق' کی شان نمایاں ہے۔

نظریاتی طور پر قمر رئیس 'ترقی پسند' اور اشتراکیت کے قائل ہیں۔ اس مسلک کو وہ 'روکش معراج انساں'، 'متاع شعلۂ جاں'، اور 'دھڑکتے دل کا ارماں' سمجھتے ہیں۔ سامراجیت پسندوں نے اگرچہ اس 'سیم بر' کے جسم کو تار تار کر دیا اور اس کے سرخ لباس (سرخ پرچم) کو اتار پھینکا ہے، مگر قمر رئیس پھر بھی اسے 'کلید فکر نو' اور 'شیوۂ انسانیت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اس امر کے بھی قائل ہیں کہ اب ان سانحات پر پچھتانا گویا زمین پر گرے ہوئے دودھ پر مچلنے کے مصداق ہوگا۔ قمر رئیس ادب میں تجدید اور تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں۔ گزرے کل کا ادب آج چلن سے ہٹنے لگا ہے۔ عصری ادب کو آج بھلے ہی مقبولیت حاصل ہو رہی ہو اور تسکین انا کی شہ پر بھلے ہی اسے سچ مانا جا رہا ہو لیکن آنے والے کل ان نوشتوں کو کہیں جگہ نہیں ملے گی، تاوقتیکہ ہماری تخلیقات معیاری اور صالح اقدار کی حامل نہ ہوں۔ اس طرح 'سراب دشت امکاں' میں قمر رئیس نے علم اور روشنائی کے سفر کی ترجمانی کرتے ہوئے مختلف مراحل میں اپنی روشن خیالی کے دیے روشن کیے ہیں۔ اسی مجموعے میں ایک نظم 'عبادت' بھی ہے۔ انھوں نے اس لفظ کے روایتی معنی سے ہٹ کر اس کے لغوی مفہوم کو وسیع کینوس عطا کیا ہے۔ ان کے نزدیک 'عبادت' صرف صوم و صلوٰۃ کا نام نہیں۔ ہماری سوچ، خیالات، جذبات، احساسات اور فکر و عمل حتیٰ کہ چوبیسوں گھنٹوں والی زندگی میں نیت کے اخلاص اور اعمال میں صالحیت کا نام 'عبادت' ہے۔

قمر رئیس کی نظم (گیت) 'میاّ! اب مت لوری گاؤ' امت کی بے حسی اور خواب زدگی کا نوحہ ہے۔ قمر رئیس نے عرب اور افغانستان کے حالیہ الم ناک سانحات کے پس منظر میں امت مسلمہ کے لیے 'اصحاب کہف' اور ان کے سگ خواب زدہ کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ ان کی نظم 'پیر تسمہ پا' روایات کہنہ کا استعارہ ہے جو ترقی پسند ذہنیت کے لیے ہمیشہ سد راہ ثابت ہوتی ہیں۔ 'موج و ماہی' ایسی نظم ہے جس میں قمر رئیس دوسرے تخلیق کاروں سے قدرے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ :

"آزادی اگر جمہور میں فرد کے انضمام کا نام ہے تو اس سے بہتر گوشۂ تنہائی ہے کہ وہاں کم از کم 'تشخص' خطرے میں نہیں پڑتا۔ جس آزادی میں وجود ذات کو خطرہ لاحق ہو، وہ آزادی نہیں فریب آزادی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ آج اسی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ قمر رئیس نے اپنی نظم 'موج و ماہی' میں اس آزادی معکوس کی نفی کی ہے۔

غرضیکہ 'شام نو روز' کی اکثر منظومات میں قمر رئیس کی روشن خیالی کی جھلکیاں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار کی گنجائش مطلق نہیں کہ انھوں نے اپنی روشن خیالی کو کبھی بھی قدیم صالح روایات کی رد میں استعمال نہیں کیا اور یہی خوبی انھیں دیگر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے۔

■

Dr. Syed Yahya Nasheet
24, Kashana KALGAON
Dist. Yavatmal 445203 (MS)

اسد اللہ

انشائیہ: شناخت اور حدود

اردو ادب کی اصناف میں انشائیے کو ابتدا ہی سے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ہمیشہ سوالوں کے گھیرے میں رہا ہے۔

انشائیہ کیا ہے؟ انشائیہ کی شناخت؟ حدود؟ تعریف؟ کیا انشائیہ ایک الگ صنف ہے؟ یا محض اسلوبِ تحریر ہے؟

اردو میں انشائیہ کا بانی کون ہے؟

سرسید؟ ماسٹر رامچندر؟ محمد حسین آزاد؟ میر ناصر علی؟ مشکور حسین یاد؟ وزیر آغا؟ وغیرہ وغیرہ

ان سوالوں نے کئی آوازوں کو جنم دیا...

انشائیہ کا اولین نقش سب رس ہے۔ (جاوید وششٹ) انشائیہ امُ الاصناف ہے۔ (مشکور حسین یاد) انشائیہ ایک نئے زاویۂ نگاہ کا نام ہے۔ (وزیر آغا) انشائیہ ایک غیر مقصدی صنفِ ادب ہے۔ (انور سدید) یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں۔ (نظیر صدیقی) خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے پوشیدہ سرچشموں کو پالیتا ہے۔ (کلیم الدین احمد) انشائیہ کسی خاص موضوع کے بارے میں ادیب کی سوچ کا عکس ہوتا ہے اس صنف کی کوئی خاص صورت معین نہیں ہے۔ (احمد ندیم قاسمی) انشائیہ تخیل کی عمل فرسائیوں کا نتیجہ ہے اگر کوئی ذہن تخیل کا سرمایہ دار نہیں ہے تو اس سے کبھی کوئی 'انشائیہ' جسے واقعی انشائیہ کہا جاسکے وجود میں نہیں آسکتا۔ (علامہ اختر تلہری) انشائیہ یا ایسے صرف تابناک اور خود آگاہ قسم کی شخصیات ہی کے قلم سے نکل سکتا ہے۔ (ڈاکٹر محمد حسن) معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں، اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔ اس کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر عبادت بریلوی) مضمون اور شاعری کے درمیان کی کوئی گمشدہ کڑی (ناصر بلوچ) جس تحریر کو افسانہ، طنزیہ مزاحیہ مضمون، نثری نظم یا کچھ اور بھی نہ کہا جا سکے اسے انشائیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ (انوار قمر) جب انشائیے نہ لکھے گئے، لوگوں نے مانا کہ یہ انشائیے ہیں۔ اب کہا جاتا ہے کہ یہ انشائیہ ہے مگر لوگ نہیں مانتے۔ (سلیم شہزاد، پاکستان) میں انشائیے کو اردو ادب کی سلیپنگ پلز قرار دیتا ہوں (طاہر تونسوی) شعری ادب کی تیسری جنس کا نام انشائیہ ہے (جمیل اختر خاں) کثرتِ تعبیر نے انشائیہ کو خوابِ پریشاں بنادیا۔ (احمد جمال پاشا)

ان سوالوں اور مختلف آوازوں کے درمیان انشائیہ کا قاری حیران کھڑا ہے۔ انشائیہ سے متعلق اڑائی گئی اس گرد میں یقیناً اس صنف کے فروغ کی راہ کھوئی ہوئی ہے۔ لوگ شخصیات میں الجھ کر رہ گئے۔ بیشتر مباحث میں انشائیہ کی امتیازی خصوصیات اور ادبی حیثیت کے متعلق اتفاقِ رائے نظر آتا ہے تاہم شخصیات کا ذکر چھڑتے ہی انشائیہ ایک متنازعہ صنف بن جاتا ہے۔

انشا، انشا پر دازی اور انشائیہ نگاری

انشا، انشا پر دازی اور انشائیہ نگاری کے متعلق بھی عوام میں ہمارے ہاں الجھنیں موجود ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ بھارت میں انشائیہ کو ایک صنف سمجھنے کے بجائے اظہار و بیان کا ایک پیرایہ تصور کیا گیا۔ آیئے ان الفاظ کے لیے لغات سے رجوع کریں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ 'پیدا کرنے' کے معنوں میں کئی جگہ وارد ہوا ہے۔

سورۃ الملک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ قل هو الّذی انشاكم

کہو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔

(تذکیر القرآن، ترجمہ مولانا وحید الدین خان، ص 1515)

انشاء کا مادّہ 'ن ش ء' ہے، جس کے لغوی معنی 'پیدا کرنا' ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

انشاء کا لفظ ابتدا میں ایک دفتری اصطلاح تھا۔ اس کا اطلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودے کو تحریر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس محکمہ کے سپرد مسودہ تیار کرنے کا کام ہوتا تھا اس نے 'دیوان الانشاء' کا نام پایا۔

(ڈاکٹر وحید قریشی، اردو کا بہترین انشائی ادب، لاہور، 1964، ص 13-14)

انشا سے متعلق چند الفاظ کے معنی لغت سے نقل کیے جارہے ہیں۔

انشا:

عبارت لکھنا۔ طرزِ تحریر، دل سے بات پیدا کرنا

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا
خط کی انشا اور ہے لکھنے کا املا اور ہے

(رشک)

یہاں انشا مونث نظم ہوا ہے، لیکن لکھنو میں مذکر بولا جاتا ہے۔

انشا پر داز :

منشی۔ نثار

(مہذب اللغات)

مضمون نگار۔ ادیب (فیروز اللغات)

غرقِ گردابِ یمِ فکر ہو انشا پر داز
اے نصیر اپنے دکھاؤں جو میں تقریر کے پیچ

(نصیر)

انشا پر دازی

لکھنے کی مہارت۔ انشا کرنا۔ تحریر کرنا۔ لکھنا۔ اردو صَرف۔ تعلیم یافتہ طبقے کی زبان۔

خون روتا ہوں میں ہر اک حرف خط پر ہمدمو
اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں
(میر)

(مہذب اللغات (جلد اول)، مہذب لکھنوی، لکھنؤ، 1978، ص 387)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تحقیق کے مطابق:

مولانا محمد حسین آزاد کے مکاتیب کے مجموعے 'مکتوبات آزاد' میں ناٹک کی اہمیت کے متعلق لکھا گیا ہے: اس کے لکھنے والے انشا پرداز شمار ہوتے ہیں کیونکہ فنون انشائیہ کا ادا کرنا بھی ایک جزو اعظم انشاء کا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے نزدیک، 'انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشاء ہے۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں مغز و مضمون کی اصل توجہ حسن عبارت پر ہو۔'

(عبدالماجد دریابادی، بحوالہ، انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، لاہور 1985، ص 139)

گویا معیاری اور ادبی زبان کا تصور انشاپردازی کے ساتھ ابتدا سے وابستہ رہا ہے اسی اعتبار سے ہمارے وہ مایہ ناز ادبا جنھوں نے ابتدا میں نثر نگاری کے ذریعے اسلوب کے عمدہ نمونے فراہم کیے اور ان کی ادبی کاوشیں ہمارے ادب کا زریں باب ہیں، انشاپرداز کہلائے۔ آج بھی بہترین نثر نگاروں کو انشاپرداز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

انشائیہ بحیثیت ایک صنف ادب

انشاپرداز اور انشائیہ نگار میں فرق یہ ہے (جو عموماً تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی روا نہیں رکھا جاتا) کہ ہر ادیب اور نثر نگار، انشاپرداز ہو سکتا ہے لیکن انشائیہ نگار وہی کہلائے گا جس نے انشائیے لکھے ہوں، اس لیے کہ انشائیہ نثر کی ایک صنف ہے، اگرچہ ایسے ادیب اور ناقدین بھی موجود ہیں جو اسے صنف نہیں مانتے مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں میں انشائیہ کو ایک صنف نہیں مانتا۔ بعض لوگ انشائیہ کو طنزیہ و مزاحیہ انداز کی طرح ایک طرز تحریر خیال کر تے ہیں۔ اگر انشائیہ کو ایک اسلوب تحریر مان لیا جائے تب بھی وہ اس پر راضی نہ ہوں گے کہ ہر نثر نگار کو انشائیہ نگار گر دانا جائے کیونکہ انشائیہ کے ساتھ بہر حال ایک مخصوص قسم کی تحریر کا تصور جڑا ہوا ہے۔

یہ تصور کیا ہے؟

اس کی وضاحت اس لیے مشکل ہے کہ انشائیہ کو صنف نہ ماننے والے بھی بیشتر انھی خصوصیات کے سہارے انشائیہ کو پہچانتے ہیں جن سے انشائیہ کو بحیثیت ایک صنف پہچانا جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انشائیہ خالص طنزیہ و مزاحیہ تحریر سے مختلف چیز ہے۔ ان کے نزدیک خیال آرائی، فلسفیانہ سوچ، اظہار ذات، تمثیلی یا شاعرانہ انداز بیان اور کسی موضوع کو عام ڈگر سے ہٹ کر دیکھنے اور پیش کرنے کا انوکھا انداز انشائیہ کی پہچان ہے۔ انھی بنیادوں پر سب رس، خطوط غالب، مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط، ادب لطیف اور گلابی اردو کو انشائیہ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے، ان فن پاروں کو جنم دینے والوں کے مقاصد میں انشائیہ شامل نہیں تھا۔ یہ ادب، داستان اور خطوط یا مضمون کی شکل میں تحریر کیا گیا البتہ یہ سچ ہے کہ مذکورہ فن پاروں میں انشائی عناصر موجود ہیں لیکن انشائیہ جو بہر حال مغرب سے درآمد شدہ ایک صنف ہے، ان تمام خوبیوں کے علاوہ اظہار و بیان کی کچھ اور وسعتیں طلب کرتا ہے۔ کوئی اسلوب بیان انشائی عناصر کا حامل ہو تب بھی وہ ایک 'جزو' ہے جب کہ انشائیہ ایک صنف کی حیثیت سے ایک 'کل' ہے جس میں مضمون نگار کسی موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات اور احساسات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس موضوع کو نئی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یہ طریقہ کار بقول رابرٹ لنڈ: 'انشائیہ انسانی فطرت کے کسی نیم تاریک گوشے کو منور کر نے کی ایک سعی ہے۔' انشائیہ اپنے موضوع کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے جیسے ماچس کی تیلی اپنے اطراف کو منور کر دیتی ہے۔

انشائیہ کی تعریف وزیر آغا اس طرح بیان کرتے ہیں:

''انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء و مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، دوسرا کنارہ، سرگودھا، 1982، ص 8)

ایف۔ ایچ۔ پریچرڈ کے قول کے مطابق:

دوسری اصناف کے مقابلے میں اپنے متوازن فکر کا عمدہ حاصل ہے۔ اس میں ہلکی سی بے اطمینانی اور ناموجود کو موجود سے دریافت کرنے کی آرزو ملتی ہے۔

(F.H.Pritchered,Essays of today P.No.11, London1930)

ڈبلیو ای ولیم کے خیال میں 'انشائیہ بالعموم نثر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے جو بیانیہ کے لیے وقف نہیں تاہم انشائیہ نگار نکتہ آفرینی کے لیے کسی چھوٹے سے واقعے کو بھی استعمال کر سکتا ہے:

انشائیہ نگار کا بڑا مقصد کہانی کی پیشکش نہیں بلکہ انشائیہ نگار تو معاشرے کا فیلسوف، نقاد اور حاشیہ نگار ہے۔

(بحوالہ انشائیہ اردو ادب میں، ڈاکٹر انور سدید ص 27، لاہور، 1985)

اگر ہم انشائیہ کو اسلوب تحریر کی ایک خوبی نہ مان کر ایک صنف تسلیم کریں تو اس پر بھی غور کر لیں کہ صنف کیا ہے۔ ادبی اصناف کی تعریف بیان کرتے ہوئے سلیم شہزاد لکھتے ہیں:

'نثر کی وہ اصناف جو مواد اور ہیت کے اعتبار سے نثری ادب میں ایک دوسرے سے متغائر ہوں مثلاً تخلیقی اظہار کی تحقیق و تفتیش، نقد و تبصرہ اور تعین اقدار کے مقصد سے لکھی جانے والی نثری صنف مقالہ (آرٹیکل یا مضمون وغیرہ) کسی فرضی یا حقیقی واقعے کے ادبی اظہار سے کہانی (افسانہ، ڈراما، یا ناول وغیرہ) اور کسی موضوع پر طبع آزمائی سے انشائیہ کی صنف اجاگر ہوتی ہے۔'

(سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، مالیگاؤں، 1998، ص 99)

ایک صنف ادب اور طرز تحریر کے فرق کے بعد دوسرا مغالطہ جو انشائیہ کے ساتھ پیش آتا ہے، اس میں طنز و مزاح کی شمولیت ہے۔ طنز و مزاح یا شگفتگی انشائیہ کو ہلکی پھلکی تحریر کی شکل دینے میں معاون تو ہو سکتی ہے لیکن یہ انشائیہ کے مقاصد میں شامل نہیں ہے بلکہ جارحانہ اور شدید قسم کا طنز اور بھرپور مزاح انشائیہ کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے، بعض ناقدین اس کے بجائے تازگی کو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار دیتے ہیں۔ طنز اور مزاح کسی ناگوار، مضحکہ خیز اور ناقابل قبول صورت حال پر طبیعت کی بھڑاس نکالنے اور اپنے ردِ عمل کو ظاہر کرنے سے عبارت ہے جبکہ انشائیہ نگار بے تکلف اور دوستانہ فضا میں اپنی ذہنی اور روحانی کیفیات میں پڑھنے والے کو شریک کر کے مضمون کے اختتام پر ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے اور سوچ کے ایک ایسے راستے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ فراق کے اس شعر کی منہ بولتی تصویر بن جاتا ہے:

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے پھر بھی رہ گزر تیری

ان کیفیات کی حامل تحریریں ہمیں مغربی انشائیہ نگاروں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ عہد سرسید میں اسی انداز کے مضامین لکھے گئے۔ انشائیہ کے جد امجد مانتین نے جس پیرائیہ اظہار کو اپنی شخصیت کی بے نقابی کا وسیلہ بنایا آگے چل کر وہ ایک ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر گیا۔ Light Essay یا Personal Essay کے نام سے نشو و نما پانے والے ادبی اظہار کے اس پیانے سے ہمارے انشا پردازوں نے اردو ادب کو سیراب کیا۔

سرسید احمد خان نے انگریز انشائیہ نگار ایڈیسن اور سٹیل کے طرز کو اپنایا۔ ڈاکٹر سلیم اختر سرسید کے متعلق لکھتے ہیں: انھوں نے ان دونوں ادیبوں کی صرف ان تحریروں سے ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا جو اصلاح معاشرت کے لحاظ سے مفید ثابت ہو سکتی تھیں اور خود

بھی انھوں نے اس انداز میں انشایئے لکھے، طبع زاد بھی اور ایسیز سے ماخوذ بھی۔ مثلاً 'امید کی خوشی' کے بارے میں سرسید نے خود بھی لکھا ہے کہ یہ 'مسٹر ایڈیسن' کا ایک مضمون ہے جسے ہم نے اپنی زبان اور اپنی طرز پر چھاپا تھا۔

(بحوالہ: ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، لاہور 1986، ص 69)

اسی طرح ماسٹر رامچندر کے متعلق سیدہ جعفر رقمطراز ہیں۔ 'انھوں نے کئی انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا اور متعدد موضوعات پر انگریزی کی طرز ہی میں مضامین لکھنے کی کوشش کی تھی'۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کا یہ قول بہت مشہور ہے: ''میں نے انگریزی انشاپردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔ (محمد حسین آزاد: نیرنگ خیال)

عہد سرسید کے بیشتر نثر نگاروں نے انشائیہ کی ان خوبیوں کو برتنے کی کوشش کی۔ آزادی ہند کے آس پاس ہمارے ادب میں طنز و مزاح کی فراوانی نے اس رنگ کو دبا دیا اس عہد میں سماج جن مسائل سے دوچار تھا طنز اور ظرافت کا فروغ ان حالات کا فطری تقاضا تھا۔ چنانچہ ہمیں کرشن چندر فکر تونسوی، کنہیالال کپور، ابراہیم جلیس، عاتق شاہ جیسے ادیب نظر آتے ہیں جن کی تحریریں طنز کی زہرناکی سے لبریز ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم احمد لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ادیبوں نے جہاں طنز کو بے حد ترقی دی اور کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور ان کے بعد ابراہیم جلیس وغیرہ کی صورت میں صاحب طرز طنز نگار پیدا کیے، وہاں ایک بھی کام کا انشائیہ نگار نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ غیر ترقی پسند ادیبوں جیسے پطرس، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت، عبدالعزیز فلک پیما اور حاجی لق لق کے ہاں مزاح اور طنز تو ہے مگر وہ تحریر نہیں جسے خالص انشائیہ قرار دیا جاسکے۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، لاہور 1986، ص 326)

انشائیہ اور طنز و مزاح

ہمارے ہاں طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہی کو انشائیہ سمجھنے کا رجحان عام ہے بلکہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ طنز کا وار اوچھا پڑ جائے اور مزاح فلک شگاف قہقہہ وصول کرنے میں ناکام رہے تو اس تحریر کو انشائیہ کے طور پر قبول کرلیا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب 'ڈبل رول' (مطبوعہ: 2015) میں اپنے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کو یکجا کرکے اس فرق کو واضح کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ اسی کتاب کے پیش لفظ کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین، ان دونوں کی پہچان میں ہم اکثر اسی طرح دھوکہ کھاتے ہیں جیسے جڑواں بچوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ جن ادبی روایات نے مذکورہ مضامین کو جنم دیا ہے، ان کی نسلی خصوصیات کا ان تحریروں میں موجود ہونا فطری امر ہے۔ ان دونوں اصناف (اور بعض ناقدین کے نزدیک اسالیب میں یہی ایک بیان) قدرے مشترک ہے، اور انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں مغالطہ پیدا ہونے کا سبب بھی۔ ان دونوں کی صورتیں بھلے ہی جڑواں بھائیوں کی طرح ملتی جلتی کیوں نہ ہوں، میں سمجھتا ہوں، ان کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔

میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطع تیرا میرا میل نہیں

ان دونوں کو جڑواں بھائی تصور کرلیں تو کہا جاسکتا ہے کہ، ایک ہنس

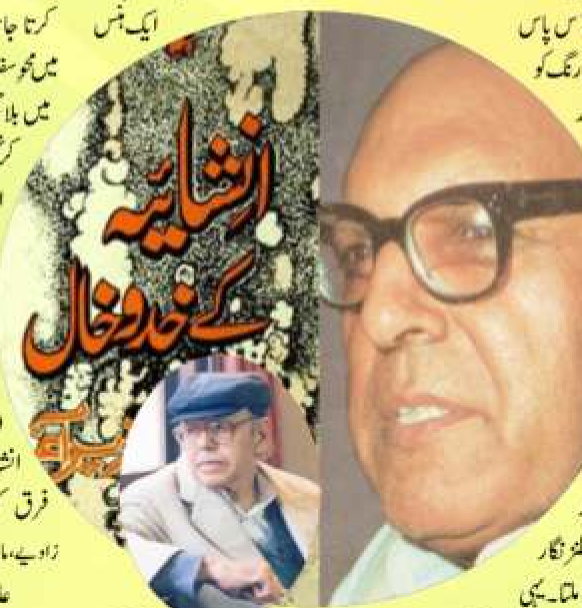

مکھ، چلبلا، زندہ دل، بے تکلف، بات بات پر لوگوں کو ہنسانے والا، مبالغہ آرائی کا شوقین، پھبتی کسنے میں ماہر، بڑا بے مروت اور بلا کا ذہین ہے۔ گاہے بگاہے خود اپنے آپ پر ہنسنے والا، دوسروں پر طنز کے تیر چلانے والا۔ اس کا انداز استہزائیہ، اس کی ہنسی تمسخرانہ، مشاہدہ زبردست، ہر کمزوری کو تاڑ کرتابڑ توڑ حملے کرنے والا، ڈھونگیوں اور بہروپیوں کی پول کھول کر رکھ دینے والا.... ایک طنزیہ و مزاحیہ مضمون ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس انشائیہ اگر چہ ہے اسی شکل وصورت کا، مگر ذرا مختلف قسم کا آدمی، اپنے آپ میں گم رہنے والا، شخصی اظہار کا خوگر، غور وفکر کا عادی، متانت، ذہانت اور حکمت و دانشوری کا پتلا، خوش گفتار، نرم دم گفتگو، بات کرتے ہوئے سوچنے لگتا ہے اور سوچتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بولنے لگتا ہے۔ اس کے خیالات فلسفیانہ اور باتیں شاعرانہ۔ ہر چیز کو دیکھنے کا انداز دنیا جہاں سے نرالا۔ اپنے اردگرد بکھری ہوئی چیزوں کو اس طرح دیکھتا ہے، جیسے وہ وااقتدار رکھی ہوئی ہیں اور انھیں اس انداز سے دیکھنے پر بھی قادر ہے جیسے وہ رکھی ہوئی نہیں ہیں۔ اس کی خیال آرائی مظاہر عالم کو بہ انداز دیگر بھی سجاتی ہے اور وہ منظر لوگوں کو دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ سنا ہے حضرت لقمان سے جڑی بوٹیاں باتیں کیا کرتی تھیں، قدرتی مناظر انشائیہ نگار سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اسے بتاتے ہیں کہ کائنات میں ان کی رشتے داریاں کہاں کہاں ہیں۔ وہ اپنے ذہنی فکری اور جذباتی تجربات اور محسوسات میں دوستوں کو شامل کرتا ہے۔ اسے اپنے دوستوں کے درمیان گپیں ہانکنا پسند ہے۔ وہ دوران سفر دلچسپ باتیں کرتا جاتا ہے تب اس کے ہم قدم خود کو ایک نئی روشنی میں محو سفر پاتے ہیں۔ وہ منچلا فکر و خیال کے ان ایوانوں میں بلا جھجک داخل ہو جاتا ہے جہاں لوگ بالک یہ سوچ کر نہیں جاتے کہ یہ ہمارے شایان شان نہیں اور شرفا ان وادیوں میں اس خیال سے قدم نہیں دھرتے کہ یہ شاہراہ عام نہیں ہے۔

(ڈبل رول: محمد اسد اللہ، ص 19، مطبوعہ 2015)

مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا نے ایک موضوع 'بوز' پر تین مختلف مضامین تحریر کیے تھے (1) مضمون (2) طنزیہ مزاحیہ مضمون اور انشائیہ۔ اس کا مقصد مضمون کی ان تینوں اقسام کے فرق کو واضح کرنا تھا۔ (بحوالہ: ایک موضوع، تین زاویے، ماہنامہ اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر (اپریل مئی 19855)

عام مضامین میں معلومات کو ترتیب اور منطقی ربط کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ اظہار کا ایک آزادانہ بہاؤ ہے جس میں ابتدا اور اختتام کی کوئی پابندی نہیں۔ انشائیہ کے اختتام پر ہم ایک ادھورا پن محسوس کرتے ہیں جو ہماری سوچ کو اس خلا کے پر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (یہ ادھورا پن مضمون میں پایا جائے تو عیب ہے مگر یہی عدم تکمیل انشائیہ کا فن بھی ہے اور حسن بھی)۔

انشائیہ میں بے تکلف گفتگو اور خود انکشافی کو اہمیت حاصل ہے۔ انشائیہ میں سرگوشیوں کا انداز پایا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار ہلکے پھلکے شگفتہ انداز میں روزمرہ کے تجربات، مشاہدات، واردات قلبی اور اپنے خیالات کے ذریعے آپ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ اس کے خیالات سے بھلے ہی اتفاق نہ کریں، لطف اندوز ضرور ہوتے ہیں۔

اردو میں مغربی انشائیوں کے خطوط پر انشائیہ کو استوار کرنے کی کوششیں اس وقت منظر عام پر آئیں

جب ڈاکٹر وزیر آغا نے ماہنامہ اوراق کے ذریعے انشائیوں کے فروغ کا خصوصی اہتمام کیا نیز مضامین اور انشائیہ لکھ کر اسے طنزیہ اور مزاحیہ مضمون سے الگ ایک صنف کے طور پر متعارف کروایا۔ 1950 سے 1960 کے درمیان وزیر آغا نے مغربی انشائیہ نگاروں کی تحریروں کو پیش نظر رکھ کر نہ صرف انشائیے تحریر کیے بلکہ اسے ایک ادبی تحریک کی شکل دی۔ اس قافلے میں نئے اور پرانے لکھنے والے شریک ہوئے آج اردو میں ان خطوط پر طبع آزمائی کرنے والے تقریباً سو انشائیہ نگار موجود ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔ ان میں سے کئی انشائیہ نگاروں کے انشائی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی معلوم تعداد تقریباً چالیس ہے۔

انشائیہ نگار

(1) ڈاکٹر وزیر آغا (2) مشتاق قمر (3) ڈاکٹر انور سدید (4) غلام جیلانی اصغر (5) جمیل آذر (6) سلیم آغا قزلباش (7) کامل القادری (8) محمود شام (9) داؤد رہبر (10) اکبر حمیدی (11) محمد منشا یاد (12) حیدر قریشی (13) نظیر صدیقی (14) مشکور حسین یاد (15) احمد جمال پاشا (16) رام لعل نابھوی (17) محمد اسد اللہ (18) شہزاد احمد (19) غلام الثقلین نقوی (20) ارشد میر (21) بشیر سیفی (22) پرویز عالم (23) طارق جامی (24) جان کاشمیری (25) محمد اقبال انجم (26) انجم نیازی (27) محمد ہمایوں (28) سلمان بٹ (29) ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ (30) اظہر ادیب (31) طارق بشیر (32) انجم انصار (33) رعنا تقی (34) سعشہ خان (35) فرح سعید رضوی (36) پروین طارق (37) عذرا اصغر (38) ساجدہ نواز (39) سریتا خان (40) امجد طفیل (41) تقی حسین خسرو (42) حامد برگی (43) بشیر سیفی (44) محمد یونس بٹ (45) رابعہ ریاض الرحمن (46) خالد صدیقی (47) شمیم ترمذی (48) راغب شکیب (49) راحت بجتی (50) رب نواز مائل (51) محمود اختر (52) عاصی کرنالی (53) کے ایم اشرف (54) افتخار قیصر (5) حیدر قریشی (56) راغب شکیب (57) شمیم ترمذی (58) محمد اسلام تبسم (59) شعیب خالق (60) خیر الدین انصاری (61) صابر لودھی (62) حنیف باوا (63) قمر اقبال (64) منور عثمانی (65) عبدالقیوم (66) ناصر عباس نیر (67) شاہد شیدائی (68) شہزاد قیصر (69) علی اختر (70) نعیم احمد (71) مشتاق احمد (72) محبوب عالم محبوب (73) مختار پارس (74) محمد اسلم (75) آفاق احمد (76) شفیع ہمدم (77) مشتاق احمد (78) نذیر احمد راہی (79) خالد اقبال (80) علی اختر (81) محمد عامر رعنا (82) محمد شفیع بلوچ (83) ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی (84) مشرف احمد (85) جاوید انور (86) جاوید حیدر جوئیہ (87) عامر عبداللہ (88) جاوید اصغر (89) سید تحسین گیلانی (90) اے غفار پاشا (91) انتظار باقی (92) صفدر رضا صفی (93) محمد بصیر رضا (94) سعید خان (95) بہزاد سحر (96) سلیم ملک (97) عابد صدیقی (98) قاضی اعجاز محور (99) خالد سہیل ملک۔ (100) ملک صاحب زادہ حمید اللہ (101) ڈاکٹر شاہد رحمن (102) وفا سعادت (103) ظہیر عباس (104) فاطمہ بتول (105) زوبی جعفری

انشائی مجموعے

1۔ خیال پارے	وزیر آغا	1961
2۔ چوری سے یاری تک	وزیر آغا	1966
3۔ ہم ہیں مشتاق	مشتاق قمر	1970
4۔ جوہر اندیشہ	مشکور حسین یاد	1975
5۔ سرگوشیاں	سلیم آغا قزلباش	1980
6۔ شاخِ زیتون	جمیل آذر	1981
7۔ دوسرا کنارہ	وزیر آغا	1982
8۔ آم کے آم	رام لعل نابھوی	1983
9۔ ذکر اس پری وش کا	انور سدید	1982
10۔ جزیرہ کا سفر	اکبر حمیدی	1985
11۔ چاہِ خنداں	محمد یونس بٹ	1985
12۔ سوچ زاویے	رشید احمد گوریجہ	1986
13۔ آمنا سامنا	سلیم آغا قزلباش	1987
14۔ خوشبو کے قافلے	محمد اقبال انجم	1988
15۔ آئینہ بنے ہیں پیراہن	شہزاد قیصر	1988
16۔ سمندر اگر میرے اندر گرے	وزیر آغا	1989
17۔ موڑ	ارشد میر	1989
18۔ تتلی کے تعاقب میں	اکبر حمیدی	1990
19۔ بوڑھے کے رول میں	محمد اسد اللہ	1991
20۔ میں سورج اور سمندر	انجم نیازی	1991
21۔ باندازِ دیگر	حامد برگی	1993
22۔ آسمان میں پتنگیں	ڈاکٹر انور سدید	1994
23۔ رت کے مہمان	جمیل آذر	1994
24۔ شگوفے	ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	1994
25۔ پگڈنڈی سے روڈ رولر تک	وزیر آغا	1995
26۔ نرم دم گفتگو	غلام جیلانی اصغر	1996
27۔ جھاڑیاں اور جگنو	اکبر حمیدی	1998
28۔ چراغ آفریدم	ناصر عباس نیر	2000
29۔ پہاڑ مجھے بلاتا ہے	اکبر حمیدی	2003
30۔ رعنائی خیال	شفیع ہمدم	2005
31۔ خیالی پلاؤ	عبدالقیوم	2006
32۔ دائروں سے باہر	حنیف باوا	2007
33۔ فرنٹ سیٹ	منور عثمانی	2010
34۔ ڈبل رول	محمد اسد اللہ	2015
35۔ آڑی ترچھی لکیریں	خیر الدین انصاری	.....
36۔ گوشہ عافیت	اے غفار پاشا	.....
37۔ تجدید کا پل	اے غفار پاشا	.....
38۔ بولتے سناٹے	پروین طارق	.....
39۔ دھند	شفیع ہمدم	.....

مراٹھی زبان اردو کے مقابلے میں ایک کم عمر زبان ہے۔ اس زبان میں بھی انشائیے کے فروغ کا زمانہ وہی ہے جو اردو میں ہے (1950 سے 1960) یعنی مراٹھی میں بھی اس صنف کی عمر تقریباً ساٹھ برس سے زیادہ نہیں۔ مراٹھی میں اسے للت لیکھ، للت نبندھ، گوشٹھی، سویر لیکھن وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے ظریفانہ تحریروں سے قطعی مختلف صنف تصور کیا جاتا ہے۔ انشائیہ کا ایسا واضح تصور تو ہماری زبان میں، خاص طور پر ہمارے ملک میں بھی نہیں ہے کیونکہ اسے طنز و مزاح سے خلط ملط کرنے کی روش اب بھی عام ہے۔ اگر ہم اسی طرز تحریر کو انشائیہ قرار دیتے ہیں، ظریفانہ تحریروں کو انشائیہ کہنے پر مصر ہیں اور یہ سلسلہ قائم رہا تو اردو زبان اس صنف ادب سے یقیناً محروم رہ جائے گی جسے مغرب میں مانتین، بیکن، ہزلٹ، لیمب، ایڈیسن، سٹیل، ابراہم کاولے، چیسٹرٹن، الفا آف دی پلو اور سوفٹ جیسے مایہ ناز ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

انشائیہ کا ایسا واضح تصور تو ہماری زبان میں، خاص طور پر ہمارے ملک میں بھی نہیں ہے کیونکہ اسے طنز و مزا ح سے خلط ملط کر نے کی روش اب بھی عام ہے۔ اگر ہم اسی طرز تحریر کو انشائیہ قرار دیتے ہیں، ظریفانہ تحریروں کو انشائیہ کہنے پر مصر ہیں اور یہ سلسلہ قائم رہا تواردوزبان اس صنف ادب سے یقینا محروم رہ جائے گی جسے مغرب میں مانتین، بیکن، ہزلٹ، لیمب، ایڈیسن، سٹیل، ابراہم کاولے، چیسٹرٹن، الفا آف دی پلو اورسوفٹ جیسے مایہ ناز ادیبوں نے پر وان چڑھایا۔

■

Mohd Asadullah
30, Gulistan Colony, Near Panday
Amrani Aauns, Nagpur - 440013 (MS)

حیدرآباد میں اردو افسانہ

رفیعہ سلیم

حیدرآباد کی سرزمین مختلف ادبی نظریات کا گہوارہ رہی ہے اس سرزمین نے علم ودانش کی کئی عظیم ہستیوں کے جسد خاکی کو'احسن تقویم' کا افتخار بخشا اور اس سرزمین نے افسانوی ادب کو بھی اعتبار عطا کیا ہے۔ صغرا ہمایوں مرزا، عظمت اللہ خان، طیبہ بیگم، رضیہ سلطانہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ابراہیم جلیس، محبوب حسین جگر، تمکین کاظمی، عبدالقادر سروری، سید بادشاہ حسین، محی الدین حسین ناکارہ وغیرہ نے اردو افسانے کی روایت کو حیدرآباد میں آگے بڑھایا۔ ان افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے ہیں اُنھیں ہم یقیناً آج کے افسانے کے مقابل نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی ان افسانوں میں وہ شعریات ممکن ہو سکتی ہے جو آج کے افسانے کی پہچان قرار دی گئی ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے محدود مفاہیم و معنی میں مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کے افسانے اپنے زمانے کی روایت کو آگے بڑھانے کا سبب بنے ہیں۔

ترقی پسند تحریک 1936 میں شروع ہوئی لیکن ادب اور سماج کا رشتہ ادب میں حقیقت نگاری اور طبقاتی نظام کے خلاف آوازیں اردو ادب میں 1917 کے انقلاب روس کے بعد ہی نظر آنے لگیں اس سلسلہ میں عزیز احمد کے افسانوں کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ جس زمانے میں عزیز احمد اپنی تعلیم مکمل کر کے حیدرآباد لوٹے اور افسانے لکھنے لگے تقریباً اُسی زمانہ میں گلبرگہ کے دو فنکاروں کی افسانوی ادب میں آواز بلند ہوئی، جنھوں نے اپنی حقیقت نگاری اور تند و تلخ لہجہ کی وجہ سے بہت جلد اردو افسانے کی روایت میں اپنا نام بنالیا۔ یہ تھے محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس۔ ان دونوں نے اردو افسانے کی دنیا میں اپنی کہانیوں سے نام پیدا کیا خصوصاً ابراہیم جلیس نے 'زرد چہرے' اور 'چالیس کروڑ بھکاری' جیسے افسانوں کے ذریعے حیدرآباد میں اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے جو چند کہانیاں لکھیں اُن کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں افسانہ نگاری کی ساری خوبیاں موجود تھیں لیکن جب انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو افسانہ کو خیرآباد کہہ دیا۔ محبوب حسین جگر کے برعکس ابراہیم جلیس نے کہانی لکھنے کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔ 1949 میں پاکستان ہجرت کرنے سے قبل ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے 'زرد چہرے' اور 'چالیس کروڑ بھکاری' ان مجموعوں میں شامل افسانوں کا اہم عنصر سماجی حقیقت نگاری ہے۔

ابراہیم جلیس کے ہم عصروں میں عزیز النساء حبیبی ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار تھیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو سے متاثر ہو کر افسانے لکھنے شروع کیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی اور سماج کی کشمکش نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ عزیز النساء حبیبی نے عصمت چغتائی کی طرح عورتوں کی زندگی اور ان کے سماجی مقام و مرتبہ کو اپنے افسانوں کا محور بنایا۔ 'تم بڑی سنگ دل ہو' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ عزیز النساء حبیبی کی طرح زینت ساجدہ نے بھی افسانے لکھے۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومانیت حاوی نظر آتی ہے لیکن کہانی کا محور عورت اور اس کے مسائل ہیں۔ اپنی چند ابتدائی کہانیوں کے بعد انھوں نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر رومانیت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور سماجی حقیقت نگاری کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بنائی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ''جلترنگ'' کے نام سے شائع ہوا۔

زینت ساجدہ کے ساتھیوں میں ایک نام رفیعہ سلطانہ کا ملتا ہے جنھوں نے افسانہ نگاری کو باضابطہ اپنایا لیکن دونوں افسانہ نگاروں کے نقطہ نظر میں بہت بڑا فرق ہے۔ زینت ساجدہ کے افسانوں کا نقطہ نظر ترقی پسندی ہے جبکہ رفیعہ سلطانہ کے افسانوں کا بنیادی وصف رومانیت ہے۔ رفیعہ سلطانہ کے منتخب افسانوں کا مجموعہ 'کچے دھاگے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں وزیر حسن، بدر شکیب، رشید قریشی نے افسانے لکھے اور مجموعے شائع کیے ان میں خصوصی طور پر رشید قریشی کے افسانے اپنی فنی خصوصیت کی بناء پر اہمیت رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں رشید قریشی کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے اسی وقت بھارت چند کھنہ کے افسانوں کے دو مجموعے منظر عام پر آئے اور منجو قمر کے افسانوں کا مجموعہ 'نورنگ' بھی شائع ہوا۔ بھارت چند کھنہ اور منجو قمر دونوں حیدرآباد کے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنی پہچان طنز و مزاح اور ڈرامہ کی دنیا میں بھی بنائی۔

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر جن افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری شروع کی انھوں نے نہ صرف فن افسانہ کو اپنایا بلکہ اسے پروان بھی چڑھایا ایسے افسانہ نگاروں میں ابراہیم جلیس کے بعد نعیم زبیری، اقبال متین، عوض سعید، عاتق شاہ اور نجمہ نکہت کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ حیدرآباد کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام اقبال متین کا ہے۔ اقبال متین کا پہلا افسانہ 'چڑیوں' کے عنوان سے رسالہ 'ادب لطیف' میں 1945 میں شائع ہوا۔ اقبال متین نے اپنے افسانوں کا مواد عصری زندگی سے اٹھایا۔

حیدرآباد میں اُردو افسانہ کا ایک اور نام عوض سعید کا ملتا ہے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سائے کا سفر' کے عنوان سے 1969 میں منظر عام پر آیا۔ عوض سعید نے

جس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اس وقت ترقی پسند ادبی تحریک پر جمود طاری تھا اور جدیدیت کا رجحان فروغ پارہا تھا۔ عوض سعید کی طرح عاتق شاہ نے بھی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھے وہ خود بھی کٹر ترقی پسند تھے۔ عاتق شاہ کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر رُخ کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو باعزم اور جہد مسلسل کرنے والا بناتے ہیں جو ہر مشکل کا ڈٹ کر سامنا کرتا ہے اور حالات کو بدلنے کا شعور بھی رکھتا ہے۔

ان افسانہ نگاروں میں ایک نام نجمہ نکہت کا بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز گیارہ سال کی عمر میں کیا اُن کا پہلا افسانہ کوثر چاند پوری کے رسالہ 'جاوٗ' بھوپال میں شائع ہوا تھا۔ نجمہ نکہت کے افسانوں کے دو مجموعے 'سیب کا درخت' اور' کسانوں کی دھرتی' شائع ہوئے۔ نجمہ نکہت نے اپنے افسانوں کے موضوعات حیدرآباد کی جاگیردارانہ تہذیب، اُس کے مٹتے ہوئے نقوش اور دکن کی تہذیب وتمدن سے اخذ کیے ہیں۔ اُن کا افسانہ' آخری حویلی' اور' سیب کا درخت' ان موضوعات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو افسانے کا ایک اہم نام جیلانی بانو ہے۔ جیلانی بانو نے ترقی پسند تحریک کے عہد شباب کے گذرنے کے بعد اور جدید رجحانات کے فروغ سے کچھ عرصہ قبل اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ جیلانی بانو نے افسانے کے فن سے متاثر ہوکر افسانے لکھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کو اپنایا اور نہ جدیدیت سے متاثر ہوئے۔ دراصل جیلانی بانو اپنے افسانوں کا تانا بانا اپنی آس پاس کی زندگی سے متاثر ہوکر تیار کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں کسی بھی تحریک کے حاوی رجحانات نہیں پائے جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں اُردو افسانے کے آغاز کے بعد 1936 تک، جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات سے افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا، حیدرآباد میں اردو افسانے کے ارتقاء میں اپنا رول ادا کیا، وہ کسی ازم یا تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ اپنے مشاہدے اور زندگی کے تجربات کو موضوع بنا کر افسانے کی شکل میں ڈھالتے رہے، لیکن ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز کے بعد حیدرآباد میں افسانہ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے لکھا جانے لگا۔ چنانچہ نعیم زبیری، اقبال متین، عوض سعید، عاتق شاہ اور نجمہ نکہت نے ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو اور رجحانات کے زیر اثر افسانے تخلیق کیے۔ اُردو کے جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ترقی پسندی کو اپنا کر کہانیاں لکھیں وہ دراصل زمانے کے تقاضے اور اُن کی ضروریات کو پورا کررہے تھے۔

ان افسانہ نگاروں کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنے فن سے حیدرآباد میں اُردو افسانے کے ارتقاء کو جاری رکھا انھوں نے جدید رجحانات کے تحت افسانے تخلیق کیے ان میں ابراہیم شفیق، انور رشید، رضاء لجبار، قدیر الزماں، مظہرالزماں خاں، پروفیسر بیگ احساس وغیرہ کے پاس جدیدیت سے وابستگی کا قوی احساس ملتا ہے۔ حیدرآباد میں جدیدیت سے متاثر ہوکر افسانے لکھنے والوں میں ایک نام ابراہیم شفیق کا ملتا ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ 'تصویر وہ بناؤں' لکھا جو ماہنامہ 'سبیل' کے شمارے بابت ستمبر 1953 میں شائع ہوا۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ایک ہوا اور چلے' کے نام سے 1970 میں مکتبہ شعر وحکمت سے شائع ہوا۔ جدیدیت انسان کی تنہائی اور داخلی احساسات اور داخلی درد وغم کا تقاضا کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابراہیم شفیق نے اپنے چند افسانے اپنی حیات اور ذات کو موضوع بنا کر لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں فرد کی تنہائی کا تو احساس ہوتا ہی ہے۔ جسے انھوں نے اکثر خود کلامی کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ معاشرے کے بکھر جانے کا احساس بھی ملتا ہے۔ ابراہیم شفیق کے ساتھیوں میں ایک نام انور رشید کا ملتا ہے۔ حیدرآباد میں جدید اردو افسانے کے فروغ اور ارتقاء میں انور رشید نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ 'زوال' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اُن کے افسانوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جدید انداز فکر رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے افسانوں کا اسلوب اور انداز بیان جدید تر معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے افسانے کے بیانیہ میں تہداری کو روا رکھا ہے۔ اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

انور رشید نے اپنے افسانوں کے ذریعے حیدرآباد میں جدید افسانے کی روایت کو مستحکم رکھا ہے۔ اس روایت کو قائم رکھنے میں رضاء الجبار کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے 1954 میں 'لڑکیوں کا وارڈ' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ لکھا 1967 میں 'روشنی کی کرن' پہلا افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ ان کے افسانوں میں ہجرت کا کرب اور نفسیاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ قدیر الزماں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز اس زمانے میں کیا جب جدیدیت کا رجحان فروغ پارہا تھا۔ پہلا افسانہ رسالہ 'صبا' میں نومبر 1976 میں شائع ہوا۔ افسانہ کا عنوان 'جہان گذراں' تھا۔

حیدرآباد میں اردو افسانے کی تاریخ کا ایک قابل توجہ نام اکرام جاوید کا ہے۔ انھوں نے 1947 کے بعد افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے فن پر ترقی پسند تحریک کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اکثر افسانوں میں بھوک، بیروزگاری، طبقاتی کشمکش، سماجی ناہمواری، سیاسی وسماجی کشمکش جیسے موضوعات بیان کیے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ڈھونڈوں کہاں' شائع ہوچکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اکرام جاوید انسان کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اکرام جاوید ہی کی طرح یوسف ساجد نے بھی ایک مقصد کے تحت افسانے لکھے ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ 1956 میں لکھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ساتواں پھیرا' کے عنوان سے 1992 میں شائع ہوا۔

حیدرآباد میں افسانہ نگاری کی تاریخ میں خواتین نے بھی اہم حصہ ادا کیا ہے۔ جن میں صغرا ہمایوں مرزا، جہاں بانو نقوی، زینت ساجدہ، رفیعہ سلطانہ، جیلانی بانو، انیس قیوم فیاض، ہادیہ شبنم، فریدہ زین، عفت موہانی، رفیعہ منظورالامین، آمنہ ابوالحسن اور قمر جمالی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ انیس قیوم فیاض نے اپنا پہلا افسانہ 1954 میں لکھا۔ انھوں نے جدیدیت کے زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی لیکن ان کے افسانے اس رجحان کے اثرات سے خارج نظر آتے ہیں، انھوں

نے اپنے اطراف واکناف کے ماحول سے متاثر ہو کر اصلاحی، سماجی، معاشرتی عنصر کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔انیس قیوم کے ساتھی افسانہ نگاروں میں ایک نام ہادیہ شبنم کا بھی ملتا ہے۔

ہادیہ شبنم (ہادیہ خاتون) نے 1960 کے بعد افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔ان کے اکثر افسانے رسالہ 'پیکر' میں شائع ہوئے ہیں۔ہادیہ شبنم نے اصلاحی اور مقصدی افسانے تحریر کیے ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار مایوسی اور ناکامی کے مراحل میں مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ہادیہ شبنم نے اپنے افسانوں میں انیس قیوم کے برعکس اسلوب سے زیادہ کہانی پر زور دیا ہے۔ہادیہ شبنم کے نزدیک افسانہ نگاری کے پیچھے ایک مقصد پوشیدہ تھا۔اس لیے ان کے افسانوں کا اختتام عموماً واعظانہ ہوتا ہے۔ہادیہ شبنم کے برخلاف فریدہ زین نے اپنے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع کیے۔پہلا مجموعہ 'سسکتی چاندنی' 1976 میں منظر عام پر آیا۔فریدہ زین نے افسانے اصلاحی رومانی نقطہ نظر کو اپنا کر لکھے ہیں۔ان کے افسانوں کی فضا عموماً گھریلو ہوتی ہے۔یہ وہ زندگی ہے جو افسانہ نگار کے آس پاس سانس لے رہی ہے۔جس میں خاندانی زندگی اور رشتوں کی مہک ہوتی ہے۔

عفت موہانی بھی ایسی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بکثرت ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔حالانکہ ان کا پہلا افسانہ 1960 میں رسالہ 'کلیاں' لکھنو میں شائع ہوا۔ہادیہ شبنم ،فریدہ زین اور عفت موہانی ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے کسی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر افسانے تخلیق کیے۔آمنہ ابوالحسن نے اپنی پہلی کہانی 'تارے' کے عنوان سے لکھی۔1965 میں افسانوں کا مجموعہ 'کہانی' شائع ہوا۔ آمنہ ابوالحسن کی طرح رفیعہ منظورالامین نے ترقی پسند تحریک سے اثر قبول کر کے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ اس لیے ان کے ابتدائی افسانوں میں ترقی پسند مینی فیسٹو کے عناصر کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہیں۔دراصل رفیعہ منظورالامین کو اس تحریک سے ذہنی اور فطری لگاؤ تھا۔ان کے افسانوں کے انتخاب کا پہلا مجموعہ 'دستک سی در دل پر' 1986 میں شائع ہوا۔انھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں سماج اور انسان کی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔

حیدرآباد کے افسانے کی دنیا میں ایک نام قمر جمالی کا بھی ملتا ہے۔جنھوں نے کسی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر روایتی افسانے سے کہانی کی دنیا میں قدم رکھا لیکن بہت جلد اپنے اسلوب تحریر اور کرداروں کی تحلیل نفسی کے ذریعے اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔انھوں نے واردات قلب کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی زندگی میں وقوع پذیر سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بھی افسانے کا موضوع بنایا۔ان کے افسانوں میں نئے زمانے کی عورت ملتی ہے۔ عورتوں کے حقوق اور اس کے سماجی مرتبہ کو انھوں نے اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ موجودہ دور میں حیدرآباد کے افسانہ نگاروں میں شامل ایک نام انیس فاروقی کا بھی ہے۔انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز 1975 میں کیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ چاندنی' 1994 میں منظر عام پر آیا۔ایک اور افسانہ نگار مجید سلیم بھی ہے جن کی پہلی تخلیق 1972 میں آئی اور ان کا افسانوی مجموعہ 'پیاسا سمندر' 1984 میں شائع ہوا۔موجودہ افسانہ نگاروں میں یٰسین احمد بھی ایک اہم افسانہ نگار ہیں اُن کی پہلی کہانی 'ظالم' ہے۔ اب تک اُن کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ طہٰ عبدالمقیت' شبینہ فرشوری اور ولی تنویر کے نام اہم ہیں۔

رفعت صدیقی نے ساتویں دہائی میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔یہ زمانہ جدید رجحانات کے فروغ کا بلکہ شباب کا زمانہ تھا لیکن رفعت صدیقی نے اپنے افسانوں کا پس منظر ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو سے حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری اور ان کے اپنے عصر کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے معمولی انسان کو افسانے کا کردار بنایا اور زندگی کی رنگارنگی کو اس کردار کی دنیا قرار دیا۔ حیدرآباد میں جدید اردو افسانے کے دو نام موجودہ عہد میں اسم بامعنی بن گئے ہیں۔وہ ہیں۔محمد مظہرالزماں خان اور پروفیسر محمد بیگ احساس۔ جدید اردو افسانے کے یہ ایسے دو نام ہیں جنھوں نے اپنی کہانیوں سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ برصغیر میں اردو افسانے کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔مظہرالزماں خان 1950 میں پیدا ہوئے اور ان کی پہلی کہانی 'کالا تاج' 1965 میں لدھیانہ کے رسالہ 'پرواز' میں شائع ہوئی۔جب ان کا افسانہ 'منزل کے لیئے' جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی کے رسالہ 'شب خون' 1973 میں شائع ہوا تو راتوں رات مظہرالزماں خان کا نام افسانے کے قاری اور نقادوں کے ذہنوں پر طلسم بن کر ہوش ربائی کرنے لگا اور مظہرالزماں خاں جدید اردو افسانے کا ایک اہم نام بن گیا۔مظہرالزماں نے تاحال تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے ہیں۔ان کے افسانے برصغیر کے علاوہ بیرون ملک کے رسالوں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ 1976 میں انھوں نے اپنے افسانوں کا انتخاب 'ہارا ہوا پرندہ' کے نام سے شائع کیا۔اور دوسرا مجموعہ 'دستکوں کا ہتھیلیوں سے نکل جانا' 1999 میں شائع کیا۔مظہرالزماں خاں نے جدید اردو افسانے کو ایک منفرد اسلوب دیا ہے۔ان کے اسلوب میں علامت اور تمثیل کا آہنگ اور تشبیہات واستعارات کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں کا اسلوب نہ صرف منفرد ہے بلکہ سحرانگیز بھی ہے۔افسانہ نگار اپنے افسانوں کی معنویت و مفاہیم کو پڑھنے والے پر پرت در پرت کھولتا چلا جاتا ہے۔اور یہی ان کے افسانوں کی انفرادیت ہے۔

سرزمین حیدرآباد کے افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے موجودہ دور میں جدید افسانے کی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ان کا پہلا افسانہ 'سراب' کے عنوان سے 1971 میں شائع ہوا۔ان کے ابتدائی افسانوں پر ترقی پسندی کے احساسات اور رومانیت کا اثر دکھائی دیتا ہے۔لیکن بہت جلد انھوں نے جدید رجحانات کو اپنالیا۔ علامت اور تمثیل کو اپنا کر افسانوں کو جدیدیت سے ہم آہنگ کیا۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'خوشۂ گندم' کے نام سے 1979 میں منظر عام پر آیا۔پہلی کہانی 'سراب' ہے جو ماہنامہ 'بانو' دہلی میں شائع ہوئی۔ پروفیسر بیگ احساس نے اپنے افسانوں میں انسانی جبلت وخواہشات اور نفسیات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے افسانے گہرے مطالعے ذاتی تجربات ومشاہدات کے غماز ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے تقاضوں اور ان کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی کمزوریوں کو بھی تمثیلی انداز میں اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔

پروفیسر بیگ احساس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ حیدرآباد کی تہذیبی تاریخ کو اپنے افسانوں میں کامیابی سے سمویا ہے اور تہذیب کے انہی نقوش کے ذریعے انھوں نے کہانی کے تانے بانے بنے ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلجھے ہوئے استاد ہیں اور مستند نقاد بھی ہیں۔مابعد جدید تنقید پر ان کی گہری نظر ہے جس کا ثبوت ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'شور جہاں' ہے جو 2005ء میں منظر عام پر آیا۔ان کے وسیع مطالعہ اور ناقدانہ نظر نے ان کے فن میں نکھار پیدا کیا ہے۔شاید اسی وجہ سے بیگ احساس کا افسانہ فنی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

■

Dr.Rafia Saleem
Asst. Professor Urdu Dept
Central University of Hyderabad
Hyderabad - 500046 (Telangana)

محمد عامل خان

مولوی عبدالحیٔ صفا کے تذکروں کا مختصر جائزہ

بعض دوسری اصناف کی طرح تذکرہ نویسی بھی اردو میں فارسی ادب سے آئی ہے۔ حالانکہ تذکرہ نویسی کی ابتدا عرب میں ہوئی۔ بعد ازاں فارسی والوں نے اسے اپنا لیا۔ اردو میں ابتدا میں لکھے گئے تذکروں کی زبان فارسی تھی۔ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ میر تقی میر (المتوفی 1819) کا تذکرہ 'نکات الشعرا' (1752) ہے۔ شعرائے اردو کے حالات پر لکھا جانے والے یہ پہلا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کی زبان فارسی ہے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک فارسی زبان میں کئی تذکرے لکھے گئے۔ اردو زبان میں لکھا گیا پہلا تذکرہ مرزا علی لطف (المتوفی 1817) کا تذکرہ 'گلشن ہند' ہے۔ جو 1801 میں لکھا گیا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا تذکرہ ہے۔ یہاں سے باقاعدہ طور پر اردو زبان میں لکھے گئے تذکروں کا آغاز ہوتا ہے۔

بدایوں میں بھی کئی تذکرے لکھے گئے ہیں۔ یہ تذکرے کئی وجوہات سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں بدایوں میں شعرائے اردو کا لکھا جانے والا پہلا تذکرہ مولوی اشرف علی نفیس بدایونی (المتوفی 1858) کا 'انتخاب دہر' ہے۔ یہ اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ تذکرہ 1263ھ/ 47-1846 میں شروع ہوا اور 12655ھ / 1848 میں مکمل ہوا۔ نفیس لکرالہ میں پہلی جنگ آزادی میں لڑنے کے بعد انگریزوں کی گولی کے نشانہ بن گئے اور شہید ہوئے تھے۔ ہمارے خیال میں غدر کے ہنگاموں میں یہ تذکرہ تلف ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ یہ تذکرہ نایاب ہے۔

اس تذکرہ کے متعلق پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

''ہمارا خیال یہ کہ شعرائے بدایوں پر سب سے پہلی کتاب اشرف علی نفیس نے باسم تاریخی 'انتخاب دہر' (1263ھ) لکھی۔ جہاد حریت 1857 میں شہید ہو گئے۔ لہٰذا معلوم نہیں کہ ان کی اس تالیف کا کیا حشر ہوا۔''[1]

اس تذکرے کا سب سے پہلے ذکر تذکرہ 'شمیم سخن' میں ملتا ہے۔[2] اس تذکرہ سے پہلے کسی اور تذکرے کا سراغ نہیں ملتا اس لیے ہم بدایوں میں اردو تذکرہ نگاری کا آغاز یہیں سے کرتے ہیں۔

بدایوں میں لکھے جانے والے تذکروں میں مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کے تذکرے 'شمیم سخن' اور 'مذاق سخن' اپنی چند خصوصیات کی بنا پر ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

نام عبدالحیٔ اور تخلص صفا تھا۔ چندوسی میں وکالت کرتے تھے۔ محلّہ سید باڑہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام شیخ فقیہ الدین (المتوفی 1332ھ/ 1914) تھا۔ آپ نہایت سنجیدہ اور مذہبی شخص تھے۔ آپ حضرت مذاق بدایونی کے مرید تھے۔ تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ تاریخ کے علاوہ ادب، صحافت، تذکرہ نویسی اور اسلامیات میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپ نے دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ ان میں اکثر طبع بھی ہو چکی ہیں۔

شاعری میں حضرت مذاق بدایونی سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک دیوان بھی تیار کیا تھا جس کا تاریخی نام 'نظم محمد عبدالحیٔ بدایونی' (1290ھ/ 1873) رکھا۔

صحافت سے خاص لگاؤ تھا۔ اسی لیے اردو اخبار (دہلی)، سید الاخبار (دہلی) اور لارنس گزٹ (میرٹھ) کے واقعہ نگار بھی رہے۔

تاریخ میں 'عمدۃ التواریخ' (1293ھ/ 1879) لکھی، جو دو جلدوں میں ہے۔ 'مرات تاریخ نما' (1871) بھی بدایوں کی تاریخ کی کتاب ہے جس میں شہر بدایوں کے حالات قلم بند ہیں۔ 'مرات تاریخ نما' 580 صفحات پر مشتمل ہے۔ مواد بھی کافی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ 'خیر الکلام فی احوال العرب الاسلام' (بدایوں، 1316ھ/ 1899) جو پانچ جلدوں میں ہے اور 'تذکرۃ الصلحا' (بدایوں 1911) بھی اہم ہے۔

آپ کا انتقال 19 اگست 1914 / 1332ھ میں ہوا۔

مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کی ایک حیثیت تذکرہ نگار کی بھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو تذکرے 'شمیم سخن' اور مذاق سخن نظر آتے ہیں۔

تذکرہ 'شمیم سخن' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول شعرا اور حصہ دوم شاعرات کے لیے مخصوص ہے۔ دونوں حصوں کا سال تالیف 1289ھ/ 1872 ہے۔

اس کے سال تالیف کے بارے میں خود تذکرہ نگار لکھتے ہیں:

''نام اس تذکرہ کا ''شمیم سخن رکھا گیا اور جب یہ تمام ہوا تو 1289ھ تھے۔ لہٰذا غنچہ علم کلام، بہار کلام نظم، اقبال نامہ عشرت افزا، تین تاریخی نام تجویز کیے گئے۔''[3]

محمد سلیمان بدایونی اس تذکرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''شمیم سخن دو حصوں میں شعرا کے تذکروں پر ہے۔ حصہ ثانی میں صرف شاعرات کا تذکرہ ہے۔''[4]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

''یہ تذکرہ مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کی تالیف

ہے، جو مولوی علی ولدار مذاق بدایونی کے شاگرد تھے۔ اس کے دو حصے ہیں، حصہ اول میں شعرا کا کلام اور حصہ دوم میں شاعرات کا کلام بہ ترتیب حروف تہجی دیا گیا ہے۔''5

اس تذکرے کے دوسرے حصے کی اشاعت پہلے عمل میں آئی اور یہ 1883 میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ بعد میں منظر عام پر آیا۔ پہلا حصہ 1301ھ/ 1884 میں مطبع 'امداد الہند عین الاخبار' مراد آباد سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ تذکرے کے پہلے حصے میں 598 شعرا کے تراجم قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ 30*22 تقطیع کے ساتھ 290 صفحات پر مشتمل ہے۔ بعض اہل علم اس کے سال تکمیل کو ہی اس کا سال اشاعت بھی مانتے ہیں جو درست نہیں۔ یہ تذکرہ دو حصوں میں الگ الگ تاریخوں میں منظر عام پر آیا ہے۔

تذکرہ میں فہرست نہیں دی گئی ہے۔ تذکرہ میں جس ترتیب کو استعمال کیا گیا وہ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا ہے۔

پھر حمد، نعت رسول اور منقبت صحابہ ہے۔

اس کے بعد تذکرہ کا سبب تالیف بیان کیا گیا ہے۔

سبب تالیف کے بعد دیباچہ دیا گیا ہے۔ دیباچہ میں اردو زبان کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے۔

بعد ازاں اپنے استاد مذاق بدایونی کے تفصیلی حالات بیان کیے گئے ہیں۔

آخر میں اظہار تشکر اور تصحیح اغلاط کو درج کیا گیا ہے۔

تذکرہ کا سرورق یہ ہے۔

''الشعراء تلامیذ الرحمٰن — جلد اول تذکرہ شعرائے زبان اردوئے معلی مع مختصر زبان اردو و نظم اردو موسوم بہ 'شمیم سخن' — چکیدہ قلم، جواہر رقم، سخن فہم و سخنداں جناب مولوی عبدالحی صاحب بدایونی متخلص بہ صفا وکیل عدالت دیوانی، بلاری ضلع مراد آباد۔ بحسن تصحیح و زیبا تسطیر دلاور علی صاحب، مالک مطبع امداد الہند و عین الاخبار — مطبع امداد الہند و عین الاخبار میں طبع ہوا۔''

تذکرہ کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

تذکرہ با اعتبار حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔

تذکرہ میں 598 شعرا کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ 55 شعرا کے تراجم دیباچہ میں اور 543 کے تراجم تذکرے میں شامل کیے گئے ہیں۔

1288ھ/ 1871 یا اس سے قبل وفات پانے والے شعرا کو شامل تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے گویا یہ پہلا تذکرہ ہے، جس میں عہد کی حد بندی کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

اس میں وہی شعرا زیر بحث آئے ہیں جو 1288ھ یا اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔''6

تذکرے میں شعرا کے سنین پیدائش و وفات درج کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ حالات مختصر مگر سلیقے کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

تذکرے کی ترتیب و تدوین میں تاریخی شعور سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے تذکرہ نگار کے تاریخی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

تذکرے میں ماخذ کی فہرست نہیں دی گئی ہے مگر دیباچہ میں گلشن بے خار، گلستان سخن، سخن شعرا، شعرائے دکن کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔

اس تذکرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' کے دیباچے میں اردو زبان کے متعلق جن موضوعات سے بحث کی ہے، صفا، آزاد سے 8 سال پہلے ہی ان موضوعات پر قلم اٹھا چکے تھے۔

جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 'نگار' (کراچی) سالنامہ 1962 میں لکھا ہے:

''اس تذکرے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زبان اردو اور شاعری کی تاریخ پر ایک مبسوط بحث بھی اس میں شامل ہے۔ یہ بحث 'آب حیات' کے مقدمہ کی طرح جامع ہے اور کم و بیش وہی باتیں کہی گئی ہیں جنھیں بعد کو آزاد نے 'آب حیات' میں درج کیا اور شہرت دوام حاصل کی افسوس ہے کہ آزاد نے 'شمیم سخن' یا اس کے مصنف عبدالحی کا کوئی حوالہ 'آب حیات' میں نہیں دیا ورنہ 'آب حیات' اور 'شمیم سخن' کا تقابلی مطالعہ صاف پتہ دیتا ہے کہ اردو زبان و شاعری کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ 1297ھ/ 1880 میں لکھا ہے اسے صفا بدایونی آٹھ سال پہلے 1289ھ/ 1872 میں لکھ چکے تھے۔''7

ڈاکٹر شمس بدایونی نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ آزاد نے 'آب حیات' کے دیباچے میں اردو زبان کی پیدائش و نشو و نما سے متعلق جو بحث کی ہے وہ صفا کی معلومات سے مستعار ہے۔

ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں:

''تذکرے کا اہم اور وقیع حصہ اس کا دیباچہ ہے جو تقریباً 82 صفحات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں اردو زبان اور اردو شاعری کے آغاز و ارتقا پر پہلی مبسوط اور جامع بحث کی گئی ہے اور اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا کو قرار دیا گیا ہے.........

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد (ف 1910) نے اپنے تذکرہ 'آب حیات' (مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور 1880) کے مقدمہ میں زبان اردو و نظم اردو کی تاریخ پر جو کچھ لکھا ہے وہ مضامین، خیالات اور حوالوں کی یکسانیت کے لحاظ سے 'شمیم سخن' کے دیباچہ سے مستفاد و مستعار ہے۔''8

دیباچہ میں دبستان دہلی اور لکھنؤ کی شعری خصوصیات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں جو حضرات تذکرے میں معاونین تھے ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

حصہ دوم 1883 میں ہی منظر عام آ چکا تھا۔ سالنامہ 'نگار 1962' کے مطابق یہ دوسری مرتبہ مطبع 'نول کشور' لکھنؤ سے 1891 میں طبع ہوا۔ اس حصے میں کل 143 شاعرات کے تراجم شامل ہیں۔ یہ حصہ دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اول میں 99 بازاری عورتوں کا ذکر ہے اور فصل دوم میں 44 پردہ نشین با عفت خواتین کا ذکر ہوا ہے۔ حالات بہت مختصر اور کلام کا نمونہ بھی بہت کم ہے۔ یہ حصہ 52 صفحات پر مشتمل ہے۔ 36 صفحات تذکرے کے لیے اور 16 صفحات تقریظ و تاریخی قطعات کے لیے مخصوص ہیں۔

پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

''شعرائے اردو کا ضخیم تذکرہ شمیم سخن (حصہ اول) اور شمیم سخن (حصہ دوم) مشتمل بر حالات شاعرات لکھے۔''9

شمیم سخن کا پہلا حصہ بہت کم دستیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ دوسرے حصے کے دو ایڈیشنز شائع ہوئے، جن میں پہلا ایڈیشن نایاب ہے دوسرا ایڈیشن آسانی سے مل جاتا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں اس ایڈیشن کے کئی نسخے موجود ہیں۔

مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کا ایک اور تذکرہ 'مذاق سخن' بھی ہے۔ یہ تذکرہ صفا نے اپنے ایک دوسرے پیر بھائی جناب علی احمد مذنب مذاقی بدایونی (المتوفی 1911) کے اصرار پر صرف دو دن میں ہی تیار کر دیا تھا۔

اس کے سال تالیف و اشاعت کے سلسلے میں صفا خود لکھتے ہیں:

''بماہ ذی قعدہ 1298ھ مطابق 1881 دو روز میں اس چمن ہمیشہ بہار کو مرتب کیا۔ عبارت رنگین و دل چسپ سے مزین کر کے 'مذاق سخن' بہ عبارت بتخلص اپنے استاد و الانہاد کے نام۔''10

مولوی عبد الحئی صفا ایک بڑے تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں. 'تذکرۂ مذاق سخن' ان کی ایسی تالیف ہے, جو اب تقریباً نایاب ہے. ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگ گیا,ہم نے اکثر تحریروں میں پایا ہے کہ اس تذکرے کی عموماً محققین کو تلاش و جستجو رہتی ہے.

اس تذکرے میں کل چوالیس (44) شعرا کے تراجم شامل ہیں۔ جن میں حضرت مذاق بدایونی کے سترہ (17) تلامذہ کا ترجمہ شامل ہے۔

جیسا کہ پروفیسر ایوب قادری اس تذکرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس تذکرہ میں ان چوالیس شعرا کے مختصر حالات اور نمونہ کلام درج ہیں جو زیادہ تر مذاق سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔'' 11

یہ تذکرہ بدایوں کے قدیم مطبع 'افضل المطابع' سے شائع ہوا۔ اس کا سال اشاعت اور سال تکمیل ایک ہی ہے یعنی 1881۔ اس کا ذکر تذکرہ 'بہار بوستان شعرا' میں بھی ملتا ہے۔

چنانچہ حافظ فضل اکرم بدایونی لکھتے ہیں:

''صاحب تصانیف کثیر ہیں۔ ایک تذکرہ 'مذاق سخن' ان کی تصانیف سے طبع ہو چکا اور دوسرا 'شمیم سخن' چھپتا ہے۔''12

پروفیسر ایوب قادری نے یہ تذکرہ پنجاب یونی ورسٹی کی لائبریری (لاہور، پاکستان) میں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں کہ اب بھی یہ وہاں محفوظ ہے یا نہیں۔ اس کی ایک نقل ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھی۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کو اصل نسخہ سے نقل کیا تھا۔ صرف 24 صفحات پر مشتمل تھا۔

عموماً اس تذکرے کو صرف حضرت مذاق بدایونی کے شاگردوں کا ہی تذکرہ سمجھا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ اس طرح بدایوں میں شائع ہونے والا پہلا تذکرہ ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں:

''شعرائے اردو و شاعرات اردو کے تذکرہ و تعارف کے بعد صفا نے اپنے استاد مذاق بدایونی کے تلامذہ کے حالات میں ایک تذکرہ باسم 'مذاق سخن' ترتیب دیا جو بدایوں میں شائع ہونے والا پہلا تذکرہ ہے۔'' 13

یہاں اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ اس تذکرہ میں صرف حضرت مذاق بدایونی کے تلامذہ کا ہی ترجمہ شامل نہیں ہے بلکہ چوالیس (44) شعرا میں سے حضرت مذاق بدایونی کے صرف سترہ (17) تلامذہ ہی کا ترجمہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ بدایوں کے مختلف شعرا کے بھی حالات و کلام کا ذکر ہے۔ جب کہ تذکرہ 'بہار بوستان شعرا' میں مکمل طور پر حضرت مذاق بدایونی کے تلامذہ یا ان تلامذہ کے شاگردوں کا ترجمہ شامل ہے۔ تذکرہ 'مذاق سخن' میں شامل شعرا کی ایک بڑی تعداد کا 'بہار بوستان شعرا' میں یا تو ترجمہ شامل ہے یا پھر ضمناً ذکر آیا ہے۔ اس طرح تذکرہ 'مذاق سخن'، (1881) میں بدایوں میں موجود شعرا کے حالات میں لکھا جانے والا تذکرہ ہے۔

تذکرے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے محمد کیف فرشوری لکھتے ہیں:

''مولوی عبد الحئی صفا ایک بڑے تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ 'تذکرہ 'مذاق سخن' ان کی ایسی تالیف ہے، جو اب تقریباً نایاب ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگ گیا، ہم نے اکثر تحریروں میں پایا ہے کہ اس تذکرے کی عموماً محققین کو تلاش و جستجو رہتی ہے۔''14

اس تذکرے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ غالباً پہلی بار اس تذکرے میں کسی ایک اور مخصوص شاعر کے شاگردوں کے تراجم اتنی بڑی تعداد میں شامل کیے گئے ہیں۔ اسی لیے اس تذکرے کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

دوسری اہم اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تذکرہ صرف دو دن میں لکھا گیا ہے۔ اتنے کم وقت میں لکھے گئے اس تذکرہ میں کسی بھی طرح کی کوئی خامی کی نظر نہیں آتی ہے۔ اس سے تذکرہ نگار کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس طرح اس کی اس خوبی کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

دونوں تذکرے بدایوں ہی کے نہیں بلکہ پورے اردو ادب کے اہم تذکرے ہیں. تذکرہ 'شمیم سخن' میں اردو زبان کے متعلق جو مباحث لکھے گئے ہیں وہ بے حد اہم ہیں.یہ تذکرے اپنی انفرادیت اور خصوصیت کی بنا پر ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں.

حیرت کی بات یہ ہے کہ سوائے دو تین محققین کے اردو کے کسی اور محقق اور ناقد نے اس طرف توجہ نہیں کی اور نا ہی اپنی کتابوں میں ان تذکروں کا حوالہ دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ تذکرے اردو تذکرہ نویسی کے اہم حصے ہیں اور ان کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہے گی۔ ان تذکروں سے کہیں نہ کہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔

تذکرہ 'بہار بوستان شعرا' میں صفا کا ترجمہ مع اٹھائیس (28) اشعار کے شامل ہے اور سوانحی حالات و کلام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ دونوں تذکرے بدایوں ہی کے نہیں بلکہ پورے اردو ادب کے اہم تذکرے ہیں۔ تذکرہ 'شمیم سخن' میں اردو زبان کے متعلق جو مباحث لکھے گئے ہیں وہ بے حد اہم ہیں۔ یہ تذکرے اپنی انفرادیت اور خصوصیت کی بنا پر ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

حواشی

1. مقدمہ تذکرہ 'شعرائے بدایوں' جلد اول، پروفیسر ایوب قادری، ص 18
2. بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت، شمس بدایونی ڈاکٹر، ص 185
3. بحوالہ بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی، شمس بدایونی ڈاکٹر، ص 187
4. مشمولہ ہفتہ وار 'ذوالقرنین'، محمد سلیمان بدایونی، محلہ سوتھا بدایوں، اپریل 1956، ص 11
5. بحوالہ اردو تذکرہ نگاری 1835 کے بعد، رئیس احمد ڈاکٹر، مطبع ایچ، ایس، آفسیٹ دہلی، ص 155
6. بحوالہ اردو تذکرہ نگاری 1835 کے بعد، رئیس احمد ڈاکٹر، مطبع ایچ، ایس آفسیٹ دہلی، ص 155
7. بحوالہ بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت، شمس بدایونی ڈاکٹر، ص 189
8. بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت، شمس بدایونی ڈاکٹر، ص 189
9. مقدمہ، تذکرہ 'شعرائے بدایوں'، جلد اول، پروفیسر ایوب قادری، ص 18
10. مقدمہ، تذکرہ 'بہار بوستان شعرا'، محمد کیف فرشوری، عفیف پرنٹرس دہلی، اکتوبر 2016، ص 24
11. مقدمہ، تذکرہ 'شعرائے بدایوں'، جلد اول، محمد ایوب قادری پروفیسر، 1987، ص 18
12. تذکرہ 'بہار بوستان شعرا'، حافظ فضل اکرم، مطبع صبح، بدایوں، 1882، ص 28
13. بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت، شمس بدایونی، ڈاکٹر ص 192
14. مقدمہ، تذکرہ 'بہار بوستان شعرا' محمد کیف فرشوری، عفیف پرنٹرس دہلی، اکتوبر 2016، ص 25

■

Mohd Amil Khan
Research Scholar, Dept. of Urdu
University of Hyderabad - 500046 (Telangana)

پروفیسر نثار احمد فاروقی
کچھ یادیں کچھ باتیں

سید حسنین اختر

1969 کی بات ہے جب میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی، غالب صدی منائی جا رہی تھی، ہر طرف غالب کا چرچا تھا، کیا بوڑھا کیا بچہ ہر شخص کی زبان پر غالب کا نام تھا، امروہہ میں امام المدارس انٹر کالج 1 میں اس سلسلے کے ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز کے علاوہ دلی و علی گڑھ سے بھی متعدد حضرات نے شرکت فرمائی تھی جن میں ڈاکٹر قمر رئیس اور نثار احمد فاروقی بھی شامل تھے۔ میری خوش بختی کہ میں بھی اس جلسے میں موجود تھا، کس نے کیا کہا یہ تو یاد نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک انگریز (ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز) کو چھوڑ کر دو اور حضرات کی تقریروں نے بھی مجھے بے حد متاثر کیا، ایک نثار فاروقی، دوسرے قمر رئیس۔

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز تو چلیے انگریز تھے اور میں نے کسی بھی انگریز کو اردو بولتے ہوئے پہلی بار سنا تھا، لیکن ان حضرات کی تقریروں نے مجھے کیوں متاثر کیا، یہ میں نہیں جانتا، البتہ اتنا ضرور سمجھ سکا کہ ان لوگوں کے انداز تکلم میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ جس نے ایک آٹھ نو سال کے بچے کو اس طرح متاثر کیا کہ اُن کا نام اسے یاد رہا۔ یہ تھی پروفیسر نثار احمد فاروقی سے پہلی شناسائی۔

اس واقعہ کے بعد نثار صاحب جب بھی امروہہ میں حکیم کلب علی شاہد مرحوم (وفات جون 1998) کے ادب کدہ پر نظر آتے، میں اُن کی باتیں غور سے سنتا، حکیم صاحب کا مکان اس وقت امروہہ کے علماء و ادباء کا Meeting Point ہوا کرتا تھا جہاں دن میں دو وقت صبح وشام محفل جمتی تھی جس میں امروہہ کے سنی، شیعہ، ہندو مسلمان ہر طبقہ کے سربرآوردہ حضرات شریک ہوا کرتے تھے اور ادب، سیاست اور مذہب غرض کہ ہر موضوع پر علمی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ سید تقی حسن نقوی مرحوم (وفات 1972) جو کہ نثار صاحب کے تاریخ کے استاد بھی تھے، انھوں نے اس محفل کو 'زمرۂ غم نباشد' نام دیا تھا۔ اس محفل کے شرکا میں میرے والد علّام مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ کلیم اعلی اللہ مقامہ (وفات اکتوبر 1989) کے علاوہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی صاحب قبلہ مرحوم (وفات 1988)، قاضی شہر قاضی محبوب احمد عباسی صاحب مرحوم (وفات غالباً 1980)، سید تقی حسن نقوی مرحوم، تاباں نقوی مرحوم (وفات مئی 2000) اور شہباز امروہوی مرحوم (وفات جنوری 1980) اور ظل عباس عباسی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ نثار صاحب اس مجلس کے غالباً سب سے کم عمر ممبر تھے لیکن میں نے خود دیکھا کہ یہ تمام ذی علم حضرات نثار صاحب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کے تبحر علمی کے مداح تھے۔

نثار صاحب کا تعلق امروہہ کے ایک علمی خانوادہ سے تھا، اُن کا سلسلہ نسب بائیس واسطوں سے حضرت بابا فرید گنج شکر تک پہنچتا ہے۔ آپ کی ولادت 29 جون 1934 کو امروہہ میں ہوئی۔ اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں فاروقی صاحب خود لکھتے ہیں: ''میری ولادت 16 ربیع الاول 1353ھ مطابق 29 جون 1934 جمعہ کے دن ہوئی۔ یہ مجھے اپنے چچا حضرت مولانا نسیم احمد فریدی کی یادداشت سے معلوم ہوئی، مگر تمام اسناد میں 1936 لکھی ہوئی ہے''2

نثار صاحب Self Made انسان تھے۔ اُن کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ جب آپ کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی، اُس وقت آپ کے والد مولوی تسلیم احمد فریدی (وفات جنوری 1987) ایک حادثہ میں دماغ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔ چنانچہ آپ کی پرورش و پرداخت آپ کے نانا حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی صابریؒ (وفات جنوری 1962) کی نگرانی میں ہوئی۔ آپ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے شیخ کبیر حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ (وفات اکتوبر 1776) کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ آپ نے فاروقی صاحب کو بچپن میں عربی و فارسی پڑھائی، 1947 میں تقسیم وطن اور 1952 میں خاتمۂ زمینداری کے بعد شرفاء نے جن مصائب و آلام کا سامنا کیا، اس کا بیان بخوبی وہی کر سکتا ہے جس نے وہ زمانہ دیکھا ہو۔ نثار صاحب نے اس زمانے میں رسالہ شمع میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت آپ نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔ نثار صاحب خود رقم طراز ہیں: ''میرے نانا درویش تھے، تھوڑی سی زمینداری تھی، 1952 میں وہ بھی ختم ہو گئی۔ ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی مگر انھوں نے نہایت محبت و استقلال سے ہماری پرورش کی، جو کچھ انھوں نے پڑھا دیا تھا وہی آج تک کام آ رہا ہے۔ جب میں نے ہائی اسکول پاس نہیں کیا تھا، کسی پڑھے لکھے شخص کے سامنے بیٹھ کر کمتر

وجاہل ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ 1952 میں زمینداری ختم ہوگئی، ہماری اپنی جائداد تو ٹھیکہ دار نے ہڑپ لی تھی، ننہیال کی زمین داری بھی ختم ہوگئی تو میں نے رسالہ شمع دہلی میں ملازمت کرنے کے لیے درخواست بھیجی، اس وقت تک ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا، اس لیے امید نہیں تھی۔ مگر وہاں سے طلبی کا خط آگیا، دہلی میں اسٹیشن سے اتر کر سید حا فتح پوری کی مسجد میں وارد ہوا، یہاں نماز پڑھ کر سوچتا رہا کہ کہاں جاؤں۔ 1947 کے بعد مسلمانوں کا جو حال تھا وہ وہی سمجھ سکتا ہے جو اس پر آشوب دور سے گزرا ہو، ملازمت عنقا تھی، دہلی میں مسلمان صرف چند محلوں میں محصور تھے، خنجر زنی کے اکا دکا واقعات روز ہوتے تھے، پاکستان کو ہجرت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، جامع مسجد کے اطراف میں سڑکوں پر اعلیٰ درجے کا گھریلو سامان، فرنیچر، برتن، جھاڑ فانوس، الماریاں کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ اس زمانے میں ایسی کمیاب کتابیں ایک ڈیڑھ روپیہ میں مل رہی تھیں جو اب شاید ہزار روپیہ میں بھی نہ ملیں، مگر روپیہ کہاں تھا؟ روز رات کو دہلی اسٹیشن پر ہجرت کرنے والے کسی نہ کسی خاندان کو رخصت کرنا ہوتا تھا"۔[3]

اس پیراگراف میں فاروقی صاحب نے بڑے موثر طریقہ سے 1947 کے بعد کے مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ نثار صاحب کے ایک خاص دوست پروفیسر اسلم پرویز بھی جو دلی کالج میں نثار صاحب کے استاد بھی رہے اور بقول خود ان کے نام کے استاد رہے، ان دنوں رسالہ شمع میں ملازمت کرتے تھے، وہ نثار صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"شمع ہی کے دفتر میں ایک ذات شریف اور بھی تھے، یہ تھے جناب نثار احمد فاروقی۔ کتابوں کے کیڑے اور نہ جانے کتنی کم عمری میں انھوں نے اردو، فارسی، عربی زبانوں اور مختلف علوم شرقیہ کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کیا تھا کہ ان کے عہد کے بزرگ تک انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مگر تھے انتہائی سرپھرے انسان۔ اُن کا معاملہ یہ تھا کہ "کسی سے ہم نہیں ملتے کسی سے دل نہیں ملتا"۔ پھر معدودے چند لوگ اُن کی زندگی میں ایسے بھی تھے جن کے ساتھ وہ اپنے علمی مرتبے کے زینے سے کئی سیڑھی نیچے اتر کر بھی معاملہ کرنا گوارا کرتے تھے۔ وہ شاید علم ودانش کے علاوہ بھی کسی اور چیز کو خاطر میں لاتے تھے تو وہ کسی شخص کی شرافت نفس تھی۔ لیکن شرافت نفس کا بھی ان کے یہاں اپنا ایک الگ معیار تھا، یعنی وہ شرافت نفسی کو اتنا بے آبرو نہیں گرداتے تھے کہ ہر شخص کے ساتھ برت لی

> ”
> **نثار صاحب اپنے عقائد کے معاملے میں بہت پختہ تھے، لیکن تعصب سے پاک تھے۔ جس فرقے کی جو بات انھیں بری لگتی اس کا اظہار بے جھجھک وبرملا کرتے، بھلے ہی کوئی ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ میں نے انھیں مسلمانوں کے ہر مسلک پر تنقید کرتے ہوئے دیکھا ہے، چاہے شیعہ ہو سنی ہو، دیوبندی ہویا درگاہی، بریلوی ہو یا اہل حدیث، لیکن تنقید کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھتے تھے کہ مخاطب کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچ پائے۔**
> “

جائے۔ وہ تو صرف اسی کے ساتھ برتی جانی چاہیے جس کا وہ مستحق ہے......... نثار فاروقی کو خوش قسمتی سے یہی دلی یونی ورسٹی کی لائبریری میں ایک کلرک کی ملازمت مل گئی۔ اب تو ان کے وارے نیارے تھے۔ یونی ورسٹی کی لائبریری اپنے اردو، فارسی اور عربی کتابوں کے ذخائر کے معاملے میں بھی کافی وقیع تھی۔ یہیں سے انھیں یونی ورسٹی ایجوکیشن کی لائن میں جانے کا خیال آیا اور انھوں نے جیسے تیسے انٹرمیڈیٹ پاس کرکے دلی کالج شبینہ کی کلاس میں داخلہ لے لیا"۔[4]

فاروقی صاحب نے دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں رہ کر، جیسا کہ میں نے معتبر لوگوں سے سنا ہے، کئی لوگوں کو پی ایچ ڈی کرادی جن میں دو تین تو وہ ہیں جن کا شمار آج کل ادب کی قدآور شخصیات میں ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ہائی اسکول سے بی اے تک کے امتحان دوران ملازمت ہی پاس کیے۔ 1962 میں بی اے کرنے کے بعد ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا جس کی وجہ سے لائبریری کی مستقل نوکری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ایم اے کرتے ہی اسی سال یعنی 1964 میں ہی آپ کو یونی ورسٹی میں لیکچررشپ مل گئی۔ 1977 میں ریڈر ہوئے اور 1985 میں پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا۔

نثار صاحب بڑے محنتی اور دُھن کے پکے تھے۔ مزاج میں جلد بازی بالکل نہیں تھی، نہایت اطمینان وسکون اور مکمل اعتماد کے ساتھ ہر کام کو انجام دیتے تھے، آپ نہایت وسیع وعمیق مطالعہ اور دقیق نظر کے حامل تھے۔ اللہ نے بہت عمدہ حافظہ سے نوازا تھا، حافظہ کا عالم یہ تھا کہ کتابوں کے ریفرینس زبانی یاد تھے، بعض اوقات تو کتاب کا صفحہ نمبر تک بتادیا کرتے تھے۔

فاروقی صاحب نے تصنیف وتالیف کا کام بہت کم عمری سے شروع کردیا تھا، آپ کا پہلا مضمون 1951 میں رسالہ' آجکل' میں شائع ہوا تھا جب کی ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اس کے بعد اُن کا یہ علمی وادبی سفر آخری سانسوں تک مسلسل جاری رہا، اس دوران آپ نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف یا ترتیب دیں اور آپ کے کم وبیش پانچ سو تحقیقی مضامین ملک وبیرون ملک کے معیاری رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ آپ کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو تقریباً دس معیاری انعامات سے بھی نوازا گیا جن میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں 1985 میں ملنے والی اعزازی سند بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں نثار احمد فاروقی کی علمی وادبی خدمات کے اعزاز میں 'کتاب نما' نئی دلی نے 1994 میں اور رسالہ 'انشاء' کلکتہ نے 2002 میں نثار احمد فاروقی نمبر نکالے۔

نثار صاحب اپنے عقائد کے معاملے میں بہت پختہ تھے، لیکن تعصب سے پاک تھے۔ جس فرقے کی جو بات انھیں بری لگتی اس کا اظہار بے جھجک وبرملا کرتے، بھلے ہی کوئی ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ میں نے انھیں مسلمانوں کے ہر مسلک پر تنقید کرتے ہوئے دیکھا ہے، چاہے شیعہ ہو سنی ہو، دیوبندی ہو یا درگاہی، بریلوی ہو یا اہل حدیث، لیکن تنقید کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھتے تھے کہ مخاطب کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچ پائے۔ وہ ایک وسیع المشرب قسم کے انسان تھے۔ اُن کا حلقہ احباب مسلک ومذہب کی قیود سے آزاد تھا۔ انھوں نے یہ خوبیاں اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے حاصل کیں۔ اُن کے نانا حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی صابری اپنے وقت کے جید خانقاہی بزرگوں میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے ہی نثار صاحب کو ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم دی اور انھیں کے زیر نگرانی ان کی تربیت ہوئی۔ ان کے چچا مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہہ میں مدرسہ عربیہ کے شیخ الحدیث اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ پھر ان کے یونی ورسٹی میں استاد پروفیسر خورشید احمد فارق ایک آزاد خیال شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے نثار صاحب کے مذہبی تصورات میں ان سب لوگوں کے افکار کا عکس ایک حسین امتزاج کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہمہ جہتی اور رنگارنگی اُن کی ادبی زندگی میں بھی تھی۔ آپ نے متعدد موضوعات پر مختلف زبانوں میں بھی اپنی

یادگاریں چھوڑی ہیں۔اردو تو اُن کی مادری زبان تھی،اس کے علاوہ وہ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی زبانوں پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ عربی،اردو اور فارسی زبانوں کے ادب کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ان زبانوں کے سیکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔اردو،عربی اور فارسی تینوں زبانوں کے ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی اوران کے متعلق ان کی بیش قیمت نگارشات آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔اردو میں انھوں نے میر وغالب پر جو کام کیا وہ انتہائی اہم اور وقیع ہے۔علاوہ ازیں مصحفی کے دیوان کو مرتب کیا۔فاروقی صاحب کی زبان نہایت سلیس آسان اور بامحاورہ ہوا کرتی تھی۔انھوں نے ذکر میر کا اردو ترجمہ 'میر کی آپ بیتی' کے عنوان سے کیا۔میر کی آپ بیتی پڑھ کر اندازہ لگانا انتہائی دشوار ہے کہ یہ ترجمہ ہے کہ طبع زاد کتاب۔روانی ملاحظہ ہو:

''بیٹے دنیا ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں، تمھیں چاہیے کہ اس سے ترک تعلق کرلو اور اپنے دامن پر علائق کی گرد نہ جمنے دو، عشق الٰہی کو اپنا پیشہ کرو، عاقبت کا دن درپیش ہے، اپنا اندیشہ کرو، جو اہل ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا سہل یعنی حقیر ہے۔زندگی ایک وہم ہے، وہم کی بنیاد پر امیدوں کا محل بنانا پانی کو رسی سے باندھنا ہے اور طول امل میں پھنس جانا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہے۔آہ بے خبر نہ رہیو کہ چل چلاؤ لگ رہا ہے''

یا

بے عشق زندگی وبال ہے، عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے، عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کردیتا ہے دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے، آگ عشق کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی اور زندگی عشق کی ہوشیاری ہے۔رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری ہے۔مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے ''.......4

عربی میں انھوں نے جو کام کیے ان میں جواد علی کی کتاب 'تاریخ طبری کے مآخذ کا تحقیقی مطالعہ' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ، جوزف ہورووتس کی کتاب **'المغازی الأولی ومؤلفوها'** کا اردو ترجمہ اور 'شفاء العلیل' کی ترتیب قابل ذکر ہیں۔شفاء العلیل میں سید غلام علی آزاد بلگرامی (وفات 1785) نے عربی کے مشہور شاعر ابوالطیب المتنبی (وفات 354ھ) کے اشعار پر تنقید کی ہے۔نثار صاحب نے اسے بڑی محنت سے ایڈٹ کرکے ثقافۃ الهند میں شائع کرایا۔ اس کے علاوہ

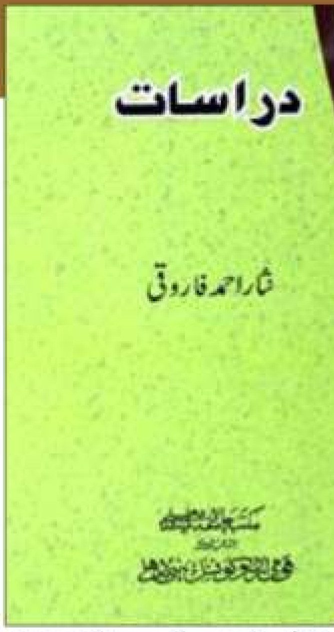

اڑیہ زبان کے مشہور شاعر اور بیوروکریٹ سیتا کانت مہاپاترا کی نظموں کا انگریزی سے عربی ترجمہ 'زرنی فی وقت آخر یا موت' کے عنوان سے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے تو اس میدان میں نثار صاحب کا ہمسر شاید ہی کوئی ہو۔تصوف پر انھوں نے جو کام کیا وہ بڑا وقیع اور معلوماتی ہے۔اس موضوع پر ان کی تالیفات میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

(1) صوفیاء کرام اور قومی یکجہتی، (2) حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے خطوط 'نوادر امدادیہ' کے نام سے مرتب ومدون کیے۔ (3) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے حالات وکرامات پر مشتمل محمد جمال قوام کی تالیف 'قوام العقائد' کا اردو ترجمہ کیا۔ (4) نقد ملفوظات جو اس موضوع پر ایک بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

علاوہ ازیں آپ نے اسلامیات، اسلامی تاریخ پر بھی گراں قدر تالیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔اس سلسلے میں آپ کی انگریزی کتاب '' Early Muslim Historiography'' اور 'سیرت طیبہ، قدیم اور مستند مؤرخ ابن سعد کی روایت' قابل ذکر ہیں۔

فاروقی صاحب ایک بہت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے، وہ خود بھی ایک ادارہ اور انجمن تھے۔کئی ادبی اداروں کا قیام انھیں کی بدولت ہوا، ہریانہ اردو اکیڈمی کا قیام ان کی تجویز اور کوششوں سے عمل میں آیا۔جب سید مظفر حسین برنی ہریانہ کے گورنر تھے تو نثار صاحب نے ان کے سامنے اردو اکیڈمی کی تجویز رکھی اور اکیڈمی کا پورا بلو پرنٹ تیار کیا۔چنانچہ آپ کے تیار کردہ خاکے پر ہی ہریانہ میں اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ رام پور رضا لائبریری جو عربی، فارسی اور اردو کتب ومخطوطات کے ذخیرہ کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے،

مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم (وفات 1981) کے انتقال کے بعد بڑی کسمپرسی کے عالم میں تھی۔ فاروقی صاحب نے اس طرف توجہ کی اور علوم شرقیہ کے اس عظیم ادارہ میں ایک نئی روح پھونکی اور 1985 میں اس کا ریسرچ جرنل بھی شروع کیا۔آئی سی سی آر منسٹری آف کلچر، حکومت ہند کی جانب سے نکلنے والے عربی مجلّہ 'ثقافة الهند' کے 1985 میں مدیر ہوئے تو اس کا رنگ وروپ ہی بدل دیا۔اب تک اس مجلّے میں پچانوے فیصد مضامین آئی سی سی آر کے دیگر مجلات سے ترجمہ کرکے شائع کیے جاتے تھے، نثار صاحب نے اس مجلّہ کے لیے مضامین ومقالات کا انتخاب عربی داں حضرات کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا۔چنانچہ 1985 کے بعد ثقافة الهند میں مضامین کی کثیر تعداد ہند۔اسلامی تہذیب وثقافت وادب کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔

نثار صاحب جیسی شخصیت کا اب ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔اُن کا علمی انہماک آخری وقت تک برقرار رہا۔اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو میرے مذکورہ دعویٰ کا ثبوت ہے۔اُن کے انتقال سے ہفتہ دس روز قبل میں ان کی عیادت کے لیے اسپتال گیا، نثار صاحب اس وقت موت سے آخری جنگ لڑ رہے تھے، موت کے لشکر کے سپاہیوں نے امراض کی شکل میں چاروں طرف سے نرغہ کیا ہوا تھا۔ان کے ہاتھ اور پاؤں تقریباً شل ہوچکے تھے۔اس عالم میں انھوں نے مجھ سے دہلی یونی ورسٹی لائبریری سے ایک کتاب لانے کو کہا۔میں حیران وششدر رہ گیا کہ وہ شخص جس کے ہاتھ پاؤں تقریباً شل ہوچکے ہیں اور موت کا فرشتہ اس کی دہلیز پر دستک دے رہا ہے وہ شخص اس حالت میں بھی اتنے ہوش وحواس میں ہے اور یہ حوصلہ اور خواہش رکھتا ہے کہ جتنا بھی وقت باقی ہے اسے علمی خدمت میں گزار دوں، یہ میری استاد محترم سے آخری ملاقات تھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حواشی وحوالہ جات:

(1) امروہہ میں جدید تعلیم کا سب سے قدیم ادارہ
(2) انشاء، نثار فاروقی نمبر ص 8
(3) ایضاً
(4) سہ ماہی اردو ادب
(5) میر کی آپ بیتی، ترجمہ ذکر میر، مترجم نثار احمد فاروقی

■

Dr. S. Hasnain Akhtar
Associate Professor, University of Delhi
Delhi - 110007
E-mail.: akhtarsyed11@gmail.com

نزہت مہدی رضوی

خاتونِ خانہ دار

سیدہ فرحت

لائٹس آن...

فلم شروع ہو چکی ہے 1963-64

مقام: فرحت کدہ کا باورچی خانہ... جہاں ایک خاتون روٹیاں پکانے میں مصروف ہیں ایک روٹی توے پر اور دوسری بیلنے والے پیڑے پر مگر یہ کیا کہ اب بیلن کے بجائے خاتون کے ہاتھ میں کوئلہ ہے اور وہ دیوار پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ عبارت مکمل ہوگئی۔

ہمیں سے نور ہے تخلیق کا زمانے میں
ہمیں حیات کا عنواں ہیں ہر فسانے میں

مگر روٹی جل کر کوئلہ ہو چکی ہے۔ اُنہہ..... خدا کی مار! جلی روٹی ایک طرف رکھ کر دوبارہ بیلن ہاتھ میں لے لیتی ہیں۔

اب سین بدل چکا ہے. کیمرے کا رُخ دوسری طرف سے آنے والے دھوبی ننھے خاں کی طرف ہو چکا ہے۔ وہی خاتون برآمدے میں بیٹھی انہیں میلے کپڑے اکٹھا کر کے دے رہی ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ صاحب کے کرتے پاجامے الگ سے صاف کر کے دھونا۔ بیگم صاحب کل بیس (20) کپڑے اور صاحب کے دو کرتے اور پاجامے الگ... ہاں ہاں... میں نے لکھ لیا۔ اب تم جاؤ۔ ارے ننھے خاں ذرا اس بکری کو تو بھگاتا کمبخت نے سارے پودوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اب خاتون اسی کاپی پر نہایت اطمینان کے ساتھ دوبارہ کچھ لکھنے میں مصروف ہو چکی ہیں۔

میں تھکی ہاری تھی اتنے میں جو آیا دھوبی
اور کمبخت نے چپکے سے بڑھا دی لا دی

کیمرے کی لائٹ آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی ہے۔

وقفہ

نیا سین... وقت اور مقام داعی پور سن غالباً 1965-66

اب کیمروں کی لائٹس خاتون کے آبائی گھر داعی پور کے آنگن میں بڑے سے تختوں کے چوکے پر فوکس ہیں۔ سب گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے بابا اور اماں کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ چھٹیاں ہیں تو بچوں کی تفریح بھی تو ہونی چاہیے۔ چاندنی رات ہے بچوں کا مشاعرہ برپا ہے۔ صدرِ مشاعرہ سیّد حسین اصغر داعی پوری کے پاس نہایت ادب اور شرافت کے ساتھ کم و بیش ہر عمر کے آٹھ بچے بچیاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا فاصلے پر ان میں سے کچھ بچوں کی پھوپھیاں، نانی، ماں اور وہی فرحت کدہ کی مکین خاتون بھی موجود ہیں۔ اُس محفل میں گھر بھر کے پیارے ماموں و نانا نذیر علی بھی تشریف رکھتے ہیں۔ سب اپنا اپنا کلام سنا کر صدرِ مشاعرہ اور حاضرین سے داد پا چکے ہیں. آخر میں حاصلِ مشاعرہ شاعر کو دعوتِ سخن دی جاتی ہے واہ! کیا لحن ہے... سبحان اللہ...

رات پُر سکون ہے۔ چودھویں رات کا چاند سب کے اوپر اپنی پرسکون چاندنی بکھیر کر فرحت بخش رہا ہے اور مشاعرے کا آخری شاعر غزل سرا ہے۔

”کبھی اے حقیقت کوفتہ نظر آ لباسِ کباب میں
کہ ہزاروں ٹکڑے تڑپ رہے تری ایک مچھلی کی قاب میں
جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو ٹفن سے آنے لگی صدا
ترا دل تو چٹنی میں جا پڑا تجھے کیا ملے گا کباب میں“

شاعر خاموش ہو چکا ہے اُس پر چاروں طرف سے

داد کے پھولوں کی بارش ہورہی ہے۔ صدارتی تقریر ہونی باقی ہے۔ شکریہ! بچو سوجاؤ... صبح سب کو بابا کے ساتھ مسجد میں نماز کے لیے جانا ہے۔

فلم کے ابھی کچھ سین باقی ہیں اور اب 1974 آچکا ہے اور تاریخ ہے 25/ اکتوبر...

دائی پور میں کیمرے پھر ایک بار روشن ہیں۔ چھوٹی بہن کو اس کی شادی کے موقع پر رخصت کرتے ہوئے وہی خاتون دعائیہ نظم پڑھ کر اُسے ڈولی میں رُخصت کررہی ہیں۔

ایک سال کے وقفے کے بعد دہلی کی بستی جامعہ نگر عابد ولا میں کیمروں کی لائٹس روشن ہیں اور خاتون سریلی آواز میں چھوٹے ، پیارے اور لاڈلے بھائی کی شادی کے گیت جوش وخروش کے ساتھ گارہی ہیں۔

"یہ پوچھ ان سے شادی کا کیا فلسفہ ہے
نبھے کیسے آپس میں گُر کون سا ہے
بنے تیرے ماموں ہیں لیکھک گیانی
لکھیں تیری شادی پہ کوئی کہانی
سنیں ہم بھی محفل میں ان کی زبانی
سنا ہے ادیبہ ہیں تیری ممانی
بنے تیرے انکھیاں سرمہ دانی

ایک لمبا وقفہ نیا اسکرپٹ تیار ہونے میں تقریباً ایک دہا لگ جاتا ہے۔ مقام اور مکان وہی۔ عابد ولا

1982 ، آدھا ہوچکا ہے اور تاریخ ہے 14 مئی

اُف... کس قدر گرمی ہے...

"حبس بے حد ہے ذرا تازہ ہوا آنے دو"

واہ! اللہ میاں........ کیا بارش اور اولے ہیں۔

کیمرے اپنا کام شروع کرچکے ہیں رُخ خاتون کی طرف ہے، جو اس دفعہ دُگنے جوش کے ساتھ اپنی سریلی آواز میں گودوں کے کھلائے سب سے چھوٹے بھائی کی شادی کے موقع پر خوشی کے ساتھ محفل جمارہی ہیں سُر بکھیر رہی ہیں۔

"جامعہ نگر نئی دلّی میں رچی ہے پھر ایک شادی
ضلع فرخ آباد کا دولہا، دولہن فیض آبادی
مہدی مہدی دونوں سمدھی ایک حسن ایک باقر
ایک کا صاحب زادہ ہے ایک کی صاحبزادی"
آ۔آ۔آ

وقفہ

سین پھر بدل چکا ہے۔ اس دفعہ عابد ولا کے ایک کمرے میں کیمرے کی مدھم روشنی ایک بیمار وجود پر پھیلی ہوئی ہے۔ خاتون علی گڑھ سے ان کی عیادت کے لیے آئی ہیں، جو ان کی بچپن کی دوست ، ہمراز اور رشتے میں چچی ہیں۔ شاید ایک کی زندگی کی شام ہونے والی ہے۔ وقت بہت کم ہے اور وہ ہیں خاتون کی چھوٹی بہن جس نے ہر کام ہمیشہ غلط وقت پر کیا۔ خاتون کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ خاتون اُسے گھورتی ہیں ارے بھئی..... سمجھوتا.... کیا مصیبت ہے میرے پاس اس وقت کاغذ اور قلم نہیں ہے۔

آؤ... آؤ... ہٹو ایک طرف... آؤ حسن عابد میرے پاس آؤ... دیکھیے پھوپھی اماں میں نے اے بی سی ڈی لکھ لی شاباش... بیٹا شاباس.... اب کاپی اور پینسل خاتون کے ہاتھ میں ہے۔ کیمرے کی لائٹ مریض خاتون، ان کے پوتے اور پٹی سے لگی بیٹھی خاتون دوست پر پڑ رہی ہے اور بیمار خاتون کی پُرسکون نظریں پوتے اور دوست خاتون پر جمی ہوئی ہیں، جو بچے کی کاپی پر لکھ رہی ہیں۔

ہم کو تلاش جادۂ ملکِ بقا کی ہے
وہ راہ جس میں پہلی ہی منزل فنا کی ہے
بیمارِ غم کو ہوگیا حاصل سکونِ مرگ!
حاجت دعا کی ہے نہ ضرورت دوا کی ہے!
ساقی پلا رہا ہے تو پینا ہے نا گزیر
مانا شرابِ زیست میں تلخی بلا کی ہے

کیمروں کی لائٹ مدھم ہوگئی ہے مگر ایک مدھم سا ہالہ تین نفوس کو آج بھی اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے کیونکہ فلم ابھی جاری ہے۔

وقفہ

خاتون علی گڑھ آچکی ہیں اور فرحت کدہ کے باہری برامدے میں بیٹھی کچھ عزیزوں کا انتظار کررہی ہیں۔۔ لو! وہ آگئے... تم لوگ منہ ہاتھ دھولو ناشتہ تیار ہے۔ فرحت آپا... کیا دہلی سے وہ تینوں اور بچے آگئے؟ ارے بھئی جاؤ... تین دفعہ ہرکارا آچکا ہے تم لوگوں کا ناشتہ کھانا سب وہیں ہے۔ اے بچی... ماں کو چین سے ناشتہ کرنے دے نا... نہیں... قطعی نہیں... بچہ میرے پاس رہے گا۔ تم اپنی دیوانی حرکتوں سے باز مت آنا۔ چلو خیر... یہ دودھ کی تھیلیاں اور بچے کی بوتلیں بوا کو دے دو اور کمروں میں جھانکنا چھوڑو۔ ارے بھئی کیا ہے۔ عذرا اسپتال میں ہے۔ ہاں صغرا تم بھی ساڑی بدلو۔ شمع تمہارے کپڑے بھی بہت اچھے ہیں۔ ہاں۔ شکر خدا کا تم نے بھی کچھ انسانوں کی جون بدلی۔ اب جاؤ نہیں بھی عذرا کے لیے پریشان مت ہو۔ اس کے پاس اس کی ماں اور میاں ہیں۔

تینوں مہمان خواتین مع چھوٹی بچی کے، چھوٹی بھاوج کے میکے پہنچ جاتی ہیں کیونکہ آج رات ان کے چھوٹے بھائی کی دعوتِ ولیمہ ہے، جس میں شرکت کے لیے وہ تینوں دہلی سے آئے ہیں مگر ٹھہرے ہیں خاتون کے گھر۔ تھوڑی ہی دیر بعد خاتون کی چھوٹی بھاوج صفیہ بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ آپا۔۔ آپا۔۔ مسعود کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ جی ہاں سزرین۔ شادی کے گھر سے سب کوئی بہو کی آمد کی مبارکباد دیتے ہوئے اُن کے گھر سے چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔ آپا۔۔ جلدی چلیے پہلے سودی اور عذرا کی بچی سے مل لیں ولیمہ تو رات کو ہے خوبصورت دادی کی پھول جیسی پیاری پوتی رابعہ (یہ نام شاید اب بدل چکا ہے) اللہ میاں! تیری شان میرا سودی بھی ابا بن گیا۔

رات ہوچکی ہے۔ ولیمہ کے بعد سب خاتون کے گھر آچکے ہیں۔ جلدی سونا ہے کیونکہ علی الصبح دہلی کے لیے واپسی ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ اب تو بچے بھی سو چکے ہیں۔ تم سوتی کیوں نہیں۔ دلّی والی بڑی بہن اور بھاوج تیزی سے پوچھتی ہیں۔ آپ لوگ سوجایئے کچھ دیر بعد وہ دونوں غافل ہوجاتی ہیں اور بچے بھی۔ اب چھوٹی بہن چاروں کو چھوڑ کر فرار ہوچکی ہے۔ کیا بجا ہے پتہ نہیں۔ ارے بھئی اُٹھ جاؤ... سجاد رو رہا ہے۔ فرار بہن رات والے کمرے میں واپس آتے ہوئے کہہ رہی تھیں اتنے سکون کی نیند برسوں بعد آئی آپا۔ مزہ آگیا۔ آپا گھورتی ہیں۔ بڑی بھاوج مسکراتی ہیں اور خاتون اسے اپنے گلے سے لپٹا لیتی ہیں ارے کیا ہوا۔ اگر میری بچی میرے پاس آگئی تھی۔ وہ خاتون کے گلے میں باہیں ڈال کر بلند آواز میں یہ اشعار پڑھنا شروع کردیتی ہے۔ آخری بند میں خاتون بھی اس کے ساتھ اپنی خوبصورت آواز شامل کردیتی ہے۔

زندگی ایک حسینہ ہے بجیلی بانکی
جس کی ہر ایک ادا نذرِ دل و جاں مانگے
چھین لے ہوش و خرد چشم فسوں گر جس کی
یہ صنم وہ ہے کہ جو ہدیۂ ایماں مانگے
مہرباں ہو کے کبھی راحتِ جاں بن جائے
سختیوں پر جو تلے کوہِ گراں بن جائے
یہ حقیقت ہے اگر آج تو کل افسانہ
نت نئے رنگ میں آتی ہے نظر روزانہ
اس کا خالی نہیں ہوتا ہے کبھی پیمانہ
زندگی شمع اگر ہے تو جہاں پروانہ
روشنی پاتی ہے یہ شمس و قمر کی دنیا
اس سے آباد ہے یہ شام و سحر کی دنیا

اور ان آوازوں کی بازگشت آج تک جاری ہے۔

■

Nuzhat Mehdi Rizvi C/o Raza Mehdi
Abid Villa, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

شبنم حمید

اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت اور الہ آباد

ہندوستان میں لسانی بنیاد پر بھی مختلف صوبے وجود میں آئے اور یہی لسانی بنیاد ان کی شناخت اور پہچان بنیں۔ پنجاب میں پنجابی، بنگال میں بنگالی، بہار میں بھوج پوری یا میتھلی، مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی وغیرہ۔ ان زبانوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم لیکن ان میں سے کوئی زبان ایسی نہیں جو پورے ملک میں رابطے کی زبان بن سکے جسے ہندوستان کی زبان کہا جاسکے۔ اردو کا خمیر ہندوستان کی مٹی سے تیار ہوا اور اس کی سماجی وتہذیبی جڑیں اس سرزمین میں پیوست ہیں۔ اردو کو اس کے ابتدائی مراحل میں مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا۔ کبھی اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا، دکن میں یہ دکنی کہلائی۔ اس کے علاوہ گجری، ریختہ، اردوئے معلی، ہندوستانی اور آخر میں اردو کے نام سے موسوم کی گئی۔ ان ناموں میں ایک بات قابل غور ہے کہ یہ ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا ناموں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہیں یہ نہیں لکھا گیا کہ یہ اردو کے نہیں بلکہ کسی اور زبان کے مختلف مراحل ہیں بلکہ ان ناموں میں سے اکثر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ملک میں باہمی رابطے کے لیے صرف ایک زبان ہونی چاہیے جو کشمیر سے کنیا کماری تک اور کلکتہ سے کچھ تک سمجھی جاسکے اور لوگوں کو ایک دھاگے میں پروسکے۔ 1625 میں ملا وجہی نے 'سب رس' میں زبان ہندوستان کا استعمال کیا اور زبان ہندوستان کہہ کے اردو کے اولین خد وخال کی طرف اشارہ کیا۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ذہنی ارتقا کے ساتھ بنتی گئی، سنورتی گئی چاہے امیر خسرو والی ہندوی کہیے یا ہندی کہیے یا پھر ہندوستانی اور اردو کہیے۔ اس موقعے پر شیکسپیئر کا یہ جملہ بے اختیار یاد آتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا "What is there in a name" کچھ بھی کہیے مراد وہی زبان ہوگی جس کے پس منظر میں پورے ہندوستان کی تہذیبی حرارت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ ہندوستان بلکہ برصغیر کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں آپ اپنی بات دوسروں کو اسی زبان میں سمجھا سکتے ہیں جو ہماری بول چال کی زبان ہے۔ اردو کے ہر لفظ میں ہماری تہذیبی روایات تو شامل ہیں ہی ساتھ ہی اسلاف کا خون جگر بھی شامل ہے۔ اس زبان نے منظم طریقے سے ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر کو پروان چڑھایا اور ادب کے ذریعے سے ملک کو قومی ہم آہنگی کا پیغام بھی دیا۔ یہ اسی زبان کا معجزہ ہے کہ آج ہم بڑے ترنم وآہنگ کے ساتھ گاتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لسانی سطح پر تو اردو نے ہندوستانیت کو فروغ دینے کا کام انجام دیا لیکن اسی کے ساتھ سماجی وتہذیبی سطح پر بھی ایک ایسے سماج کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا جس میں ہولی اور دیوالی کے جشن کے ساتھ عید کی خوشی اور محرم کا غم بھی شامل تھا۔ اس میں کہیں کوئی تفریق نہ تھی اور نہ تصادم تھا بلکہ مشترک جذبات، باہمی یگانگت، پیار ومحبت، بھائی چارہ کے تصورات حاوی تھے۔ یہ مشترکہ تہذیب زندگی کے ہر پہلو سے ہندوستانی سماج پر اثرانداز ہوئی۔ اگر غور کیجیے تو ہمارے یہاں جو صدیوں سے ایک ساتھ رہنے کی بنا پر ایک خوبصورت نقشہ نظر آتا ہے کہ یہاں ہرے سبزہ زار میں کہیں زعفران کے پھول ہیں تو کہیں نیلے رنگ کی پتیاں ہیں اور کہیں بیلا کی سفیدی ہے یہ چمن جو مختلف تہذیبی پھولوں کے رنگ سے آراستہ ہوا ہے اس کے پس منظر میں حالانکہ کچھ ایسے عناصر ہیں جنھوں نے نفرت کا بگل بجانے کی کوشش کی۔ باہمی احترام، رواداری اور محبت کے راگ نے ان سب کو شکست دے دی عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قومی وحدت میں صرف اردو شاعری نے ہی اپنا کردار ادا کیا ہے اور اس دعوی کی دلیل میں جو آزادی کے زمانے میں اقبال سے لے کر مجاز تک شعرا کے کلام کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں لیکن مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ یہ ادبی ظلم ہوگا اگر ہم اس موقعے پر اردو نثر کو فراموش کردیں۔ اردو نثر نے بھی 'سب رس' سے 'فسانۂ عجائب' تک پریم چند سے بیگ احساس تک اردو نثر کے خزانے کو لعل وگہر عطا کیے۔

میرا تعلق سرزمین سنگم الہ آباد سے ہے اس لیے میں نے اپنے لیے اردو کی تہذیبی وادبی روایت اور الہ آباد کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ الہ آباد میں گنگا اور جمنا ملتی ہیں۔ سنگم پر دونوں کا پانی الگ بھی ہے اور ایک بھی ہے۔ الہ آباد لوگوں کا سنگم ہے، تہذیبوں اور زبان وادب کا سنگم ہے، اور اردو زبان بھی سنگمی ہے کیونکہ اس میں بھی مختلف مذاہب وملت کے دھارے آپس میں ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور الگ بھی ہیں۔ الہ آباد نے اپنی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان وادب کے ذریعے پورے ملک کو گنگا جمنی تہذیب کا پیغام دیا ہے۔ پنڈت نہرو کا وطن الہ آباد تھا اور ان کی مادری زبان اردو تھی اور اسی الہ آباد سے اردو

کا وہ معروف سپوت اٹھا جسے زمانہ تیج بہادر سپرو کے نام سے جانتا ہے، ان کا مشہور جملہ قومی یکجہتی کے ماننے والوں کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے یہ کہا تا کہ ''اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی میراث ہے۔'' اور اسی الہ آباد میں اردو کے مشہور شاعر آنند نرائن ملا تھے جنھوں نے کہا تھا:

ملا بنا دیا ہے اسے وجہِ اختلاف
تھی صبح کا پیام جو اردو زباں کبھی

الہ آباد میں اردو کی ادبی روایت کی تلاش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم دور سے ہی الہ آباد اردو شعر و ادب کا مرکز رہا۔ اس سلسلے میں نمایاں نام عمدۃ الملک امیر خاں انجام کا ہے جو کابل کے صوبے دار نواب امیر خاں کے فرزند تھے۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت کے سبب محمد شاہ کے حلقے میں بہت مشہور تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر کلام فارسی میں ہے لیکن اردو شاعری کے بھی کچھ نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دور سے آتے تھے سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیانے کو ہم
کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم
ہم سے چھپا کے اور سے آنکھیں ملا گیا
ظالم کسی کو مار کسی کو جلا گیا

ان شعرا کے علاوہ اس دور کے شعرا میں شاہ عالم ثانی آفتاب، محمد اجمل اجمل، مولوی غلام حسین محزوں، منشی سدا سکھ نثار، بھکاری داس عزیز وغیرہ کسی نہ کسی طور سے الہ آباد سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر شعرا نے دہلی سے آکر یہاں سکونت اختیار کی اور یہیں کے ہو رہے۔ ان میں ایک نام محمد اجمل اجمل کا ہے جن کا تعلق الہ آباد کے دائرہ شاہ اجمل سے تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے والد خوب الہ آبادی اور بھائی شاہ قطب الدین مصیب بھی شاعر تھے۔ اجمل نے فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ محمد اجمل اجمل اور مذکورہ بالا شعرا کے چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں:

جوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب
بے اختیار مجھ کو رلاتی ہے چاندنی

شاہ عالم ثانی آفتاب

ہوگیا خون تاب آنکھوں میں
تھا جہاں تک آب آنکھوں میں

محمد اجمل اجمل

کوئی نہ منع کرو اس کو مے پرستی سے
ابھی یہ نام خدا عام جوانی ہے

مولوی غلام حسین محزوں

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں
تو شکوہ ہمیں کچھ تمھارا نہیں

منشی سدا سکھ نثار

ایسا ہے لعل لب کا ترے رنگ یار سرخ
یاقوت جس کے آگے لگے ایک سنگ سرخ

بھکاری داس عزیز

انیسویں صدی میں الہ آباد کے شعرا میں جانکی بائی اہلیہ، شاہ غلام اعظم، افضل، شیخ امیر الدین مشاغل، سید اعظم علی اعظم، منشی موتی لال سکینہ، جنقل اور شیخ امام بخش ناسخ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ناسخ، جو دبستان لکھنؤ کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں ان کا اصل وطن لکھنؤ تھا لیکن الہ آباد میں تقریباً چھ سال مقیم رہے گویا الہ آباد ان کا وطن ثانی تھا۔ الہ آباد میں ان کا قیام شہر کے مشہور دائرہ شاہ اجمل میں تھا اور بقول ڈاکٹر اعجاز حسین انھوں نے اپنا دیوان بھی یہیں مرتب کیا۔

الہ آباد کے متعلق ایک شعر کہا ہے:

تین تربینی ہیں دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

الہ آباد میں انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکبر اردو کی طنزیہ مزاحیہ شاعری کے بے تاج بادشاہ کہے جاتے ہیں۔ ان کی طرز ادا اور رنگ شاعری آج بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ ترقی کے مخالف اور رجعت پسند ہیں لیکن اکبر رجعت پسند اور ترقی کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ عوام کو اس نئی مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کے سبب آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہے تھے جو آہستہ آہستہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی اقدار پر غالب آتی جا رہی تھی۔ اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے انھوں نے طنزیہ مزاحیہ شاعری کو ذریعہ بنایا۔ اکبر کی شاعری جہاں ایک طرف لوگوں کو گدگداتی ہے وہیں دوسری طرف غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ اپنے دامن میں بے پناہ معنوی وسعت کا حامل ہے، انھوں نے فکری نیرنگیوں کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے فنی لوازم کو بھی نہایت خوبصورتی سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ اکبر کا کلام سنجیدہ شاعری سے بھی عاری نہیں ہے لیکن جو رنگ ان کے یہاں غالب ہے وہ طنزیہ مزاحیہ ہی ہے اور یہی ان کی شناخت بھی ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے
یوں قتل سے لڑکوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں
کس رہے ہیں اپنی منقاروں سے حلقہ جال کا
طائروں پہ سحر ہے صیاد کے اقبال کا
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

اکبر الہ آبادی کے بعد ان کے ہم عصر الہ آبادی شعرا میں اکبر کے استاد مولوی وحید الدین وحید الہ آبادی اور محمد نوح ناروی کا نام آتا ہے۔ نوح ناروی شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ شاگردی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے بھی بہت سے شاگرد بنائے تین ضخیم دیوان اردو شاعری کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ اس دور کے دیگر شعرا میں فیاض علی خاں فیاض، بابو دیو کی نندن ہنر، مولوی سید عزیز الدین حیدر افسر، منشی سکھدیو پرشاد بسمل، ریختی گو شاعر شیدا، حیرت الہ آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وحید الہ آبادی اور نوح ناروی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آج شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو
ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

وحید الہ آبادی

ادا آئی جفا آئی غرور آیا حجاب آیا
ہزاروں آفتیں لے کر حسینوں کا شباب آیا
شب غم کس طرح گزری شب غم اس طرح گزری
نہ تم آئے نہ چین آیا نہ موت آئی نہ خواب آیا

نوح ناروی

اکبر الہ آبادی اور نوح ناروی کے بعد شعرا کی ایک کہکشاں ہے جنھوں نے اپنے دور میں اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن اردو شاعری اور الہ آباد کے

حوالے مذکورہ بالا شعرا کے بعد سب سے بڑا نام رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا ہے جو اپنے آپ میں اردو شاعری کا ایک مکمل عہد ہے۔ فراق کا اصل وطن تو گورکھپور تھا لیکن ان کی زندگی اور شاعری نے تمام مراحل اسی شہر میں طے کیے۔ فراق کی شخصیت ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھی۔ فراق نے اردو شاعری میں میر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اردو شاعری میں ان کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو ہندوستانی تہذیب کا ترجمان بنایا۔ فراق کی شاعری ایک دریا کی مانند ہے جس میں مختلف فکری و تہذیبی دھارے مختلف سمتوں سے آکر اس میں ملتے ہیں ان کے یہاں فارسی و عربی کے تلازمے بھی دکھائی دیتے ہیں اور انگریزی کے جدید رجحانات بھی لیکن جو رنگ ان کی شاعری پر غالب ہے اس کی فکری بنیادیں خاص ہندوستانی یا ہندو فلسفے پر قائم ہیں۔ ان کے یہاں حیات و کائنات، انسان، خدا، حسن و عشق، زندگی اور موت کا تصور ملتا ہے اس پر خالص ہندوستانی فلسفہ غالب ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سرزمین ہند پر، اقوام عالم کے فراق
کارواں آتے گئے، ہندوستاں بنتا گیا

ہم سے کیا ہوسکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں کے چراغ

تقسیم ہند کی وجہ سے جب اردو پر برا وقت پڑا تو الہ آباد نے اس کے دفاع میں اپنا تاریخی فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ الہ آباد سے 'ہمارا اخبار'، 'نیا اخبار'، 'قومی اخبار'، 'سہ روزہ' اور 'نیا دور' وغیرہ شائع ہوتے تھے لیکن اس سے زیادہ اہم پہلو رسائل کا تھا جس میں 'پروین'، 'جھنکار'، 'نکہت'، شعاع اردو، رسالہ اکبر، فسانہ، انجمن دارالادب وغیرہ مشہور ہوئے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت پاکٹ سائز رسالہ 'جاسوسی دنیا' کو حاصل ہوئی۔ جاسوسی دنیا کے مصنف ابن صفی جن کا اصلی نام اسرار احمد ناروی تھا، پورے برصغیر میں سری ادب کے حوالے سے ممتاز نام مانا جاتا ہے۔ الہ آباد سے ہی جدیدیت کا ترجمان رسالہ 'شب خون' جاری ہوا۔ اردو ادب کی تاریخ میں 'شب خون' کی اہمیت اس لیے بھی اور بڑھ جاتی ہے کہ اس نے جدید ادب کے رجحانات سے اردو والوں کو روشناس کرایا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جس کے سبب ایک نئی اور اہم کھیپ اردو ادب کے کارواں میں شریک ہوگئی۔

الہ آباد کی ادبی انجمنوں اور صوفیہ کے قائم کردہ دائروں (دائرہ شاہ اجمل، دائرہ شاہ محمدی، دائرہ شاہ حلیمیہ اور دائرہ شاہ علیم وغیرہ) نے بھی اردو کی ادبی و شعری روایت کو مستحکم کرنے، نئے ادبا و شعرا کی حوصلہ افزائی اور ان کو رغبت دلانے کا کام بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ الہ آباد کی ادبی انجمنوں میں 'انجمن ترقی پسند مصنفین'، 'بزم ادب'، 'بزم ریاض ادب'، 'ادارہ فن ادب'، 'تہذیب نو'، 'انجمن اصلیہ'، 'بزم غزل'، 'اردو گھر'، 'اردو فورم'، 'قلم کار'، 'نیا سفر'، 'بزم ادب' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یوں تو مذکورہ بالا تمام انجمنوں نے اردو کی خدمت انجام دی ہے لیکن ان میں سے چند انجمنیں ایسی بھی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ الہ آباد میں 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی شاخ ترقی پسند تحریک کی ابتدا 1936 میں ہی قائم ہوئی۔ اس کے بانی سجاد ظہیر کے علاوہ انجمن سے وقت کے سربرآوردہ نقاد، ادیب اور دانشور منشی پریم چند، ڈاکٹر اعجاز حسین، فراق گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، امرناتھ جھا (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد)، جواہر لعل نہرو شامل تھے۔ 'بزم روح ادب' کو سرتیج بہادر سپرو نے 1941 میں ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے قائم کیا تھا۔ اس انجمن کے زیر اہتمام کئی یادگار مشاعرے منعقد ہوئے۔

اس مختصر جائزے سے الہ آباد کی ادبی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تمام تحریکات اور تخلیقات کے ساتھ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد کو ملک کا سب سے پہلا اردو شعبہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس شعبے سے بہت سی ایسی علمی و ادبی شخصیات وابستہ رہی ہیں جنھوں نے اردو ادب و شاعری کی تدریس، تحقیق اور تفہیم میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مختلف تحریکات و رجحانات کی کونپلیں بھی یہیں سے پھوٹیں۔ شیخ مہدی حسین ناصری کا نیا رنگ تغزل، ڈاکٹر تاراچند کی تاریخ سے دلچسپی کی بنا پر ادب میں تاریخیت کا رجحان، پھر سب سے پہلے باضابطہ صدر شعبہ پروفیسر ضامن علی کی کلاسیکیت سے دلچسپی، قصیدے کی تفہیم میں اور اپنے طالب علموں میں علمی ذوق پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پروفیسر ضامن علی کے بعد پروفیسر اعجاز حسین فعال شخصیت ایک طرف تو جغرافی کلب کے ذریعے طالب علموں میں ادبی ذوق کی تربیت کرتی رہی دوسرے وہ خود بجا طور پر اردو میں ترقی پسند تحریک کے حامیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے شاگردوں میں وقار عظیم اور احتشام حسین نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اعجاز صاحب کے شاگردوں میں جلیل قدوائی، اطہر پرویز، اور سید محمد عقیل بھی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر رفیق حسین نے کئی بنیادی کتابیں تصنیف کیں۔ پروفیسر احتشام حسین جیسی قد آور شخصیت بھی اسی شعبے سے وابستہ رہی۔ انھوں نے اپنی ذات سے شعبے کو وقار عطا کیا اور شاگردوں کی ایک نئی نسل کے خالق بھی ہوئے۔ پروفیسر احتشام حسین کثیر التصانیف تھے۔ ادب اور سماج، اعتبار نظر، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ذوق ادب و شعور وغیرہ اردو ادب میں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ صدر شعبہ کی فہرست میں ضامن صاحب نے نصابی کتب مرتب کیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین نے سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان کے نام 'پہلی کتاب'، 'آئینہ معرفت'، 'مختصر تاریخ ادب اردو'، 'نئے رجحانات'، 'ملک ادب کے شہزادے'، 'اردو شاعری کا سماجی پس منظر'، 'مذہب اور شاعری' ادبی سنگ میل ثابت ہوئیں۔ پروفیسر مسیح الزماں نے اردو مرثیے کی تاریخ سے متعلق تاریخی کتاب تصنیف کی۔ پروفیسر عطیہ نشاط خان کی کتاب 'اردو ڈراما فن اور روایت' اردو ڈرامے کی تاریخ میں بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

موجودہ دور میں الہ آباد کے حوالے سے اردو شعرا و ادبا کی بات کریں تو بے ساختہ زبان پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کا نام آتا ہے جنھوں نے آسمان ادب کو اپنے علم و دانش کے نور سے منور کر رکھا ہے، الہ آباد کو ان پر ناز ہے اور یہ الہ آباد میں اردو والوں کے سعادت کی بات ہے کہ اتنی بڑی شخصیت کی صحبتیں ان کے حصے میں آئیں۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ عہد حاضر میں استاد الاساتذہ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ اساتذہ اپنے علمی و ادبی ذوق اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کی بنا پر نہ صرف الہ آباد بلکہ تمام اردو ادب میں حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں جس قدر مختلف دبستانوں اور شہروں نے نمایاں رول ادا کیا ہے اسی طرح اردو زبان و ادب کی تاریخ الہ آباد کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

■

Prof. Shabnam Hameed
Head, Dept of Urdu
Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)

وسیم افتخار انصاری

برہان پور میں اردو کا تابناک ماضی

برہان پور، زمانۂ قدیم سے علم و فن اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس پر مختلف ادوار میں، متفرق سلاطین کی حکومتیں رہی ہیں۔ ان کے الگ الگ اندازِ حکومت، طرزِ معاشرت اور رسم و رواج کے اثرات، ساتھ ہی صوفیا، سنتوں کی آمد، قیام اور انہماک دین نے، اسے مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب وتمدن کا دل کش نمونہ بنا دیا ہے۔

مغل سلطنت سے قبل خلجی یا فاروقی سلاطین کا دورِ حکومت رہا ہو، یا مغل حکمراں کا دورِ زریں، ہر عہد میں برہان پور کو علمی، تہذیبی اور سیاسی بالا دستی حاصل رہی ہے۔ ان کے بعد نظام آصفی، مرہٹہ اور انگریزی عہد میں بھی یہاں علم و ادب اور تہذیب وثقافت کی شمع روشن رہی ہے۔ انھیں خصوصیات کے سبب اسے بابِ دکن، کلیدِ دکن، دکن کی دلّی، دارالسرور، دارالعلوم، دارالاولیا، مدینۃ الاولیا اور چھوٹی دہلی جیسے کئی اہم ترین خطابات سے نوازا گیا۔

یہ سب اس لیے بھی ہوا کہ برہان پور کو ہر عہدِ حکومت میں مرکزیت حاصل رہی اور یہاں علماء و دانش وران کا ورود و قیام ہوتا رہا، اُن کی علمی و ادبی محفلوں سے ایک زمانہ مستفیض ہوا، جس کے اثرات مرورِ ایام کے ساتھ آج بھی موجود ہیں اور اسی بنا پر یہاں علم و ادب کا ایک صحت منداور پاکیزہ ماحول پایا جاتا ہے۔

فی الحال، برہان پور کا تعلق ہند کے مقامِ دل، صوبہ مدھیہ پردیش کے خطۂ نماڑ سے ہے۔ یہ نماڑ کا اہم ضلع اور بڑا ادبی مرکز ہے۔ اس لحاظ سے برہان پور کی تاریخ ایک ہزار سال نہیں بل کہ تقریباً تین ہزار سال پرانی ہے۔

مہشمتی (جسے آج مہیشور کہا جاتا ہے) کی تاسیس و بنیاد ایک ہزار سال قبل مسیح سے مانی جاتی ہے۔ یدو یا ہیہئی خاندان کے بادشاہ، مہشمت نے اس علاقے کا نام، اپنے نام پر مہشمتی رکھا، جو وقت گذرنے کے ساتھ مہشمتی سے مہیشور ہوگیا۔ اس خطے پر کچھ عرصہ موریہ کا اختیار رہا۔ 175 قبل مسیح میں شنگ قابض ہوئے۔ پہلی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ساتواہن بادشاہوں کی عمل داری میں آیا۔ کچھ عرصہ نہپان نگراں رہے، پھر دوبارہ ساتواہن کی سلطنت قائم ہوئی۔ 250ء تک کردمک قابض رہے۔ 251 سے 366-67 عیسوی تک آبھیر اور 510 عیسوی تک واکاٹک راجاؤں کا راج رہا۔ 972 تک گپت، کل چُری، وردھن و چالوکیہ، راشٹر کٹ اور گُرجر حکومتوں کے ماتحت رہا۔ 1305 تک اس پر پرمار، اہیر اور چوہان راجاؤں کا راج پاٹ رہا۔ 1305 میں ہی خلجی سلطنت کے اقتدار وتسلط میں آگیا۔ اس طرح دلّی سے تعلقات اُستوار ہوگئے۔ 14ویں صدی عیسوی کے آخر تک اسے خلجی اور تغلق سلاطین کے مختلف ناظمین اور صوبے داروں کی نگہ بانی میسر ہوئی....تیمور کا حملہ ہوا.... جس کے سبب تغلق حکومت منتشر ہوگئی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم ہوئیں۔ دیگر حکمرانوں کی طرح مَلک راجا (رضا) فاروقی نے 1398 میں آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یوں تو اس سے پہلے 1370 ہی سے فاروقی خاندان میں صوبے داری کا سلسلہ چلا آتا ہے۔

(ایم پی ضلع گزیٹر مشرقی نماڑ۔ مرتبہ پریم نارائن شریواستو۔ ضلع گزیٹر وبھاگ ایم۔ پی۔ بھوپال 1971 ص 43 تا 56) اور (ایم پی ضلع گزیٹر مغربی نماڑ۔ مرتبہ راجندر ورما۔ ضلع گزیٹر وبھاگ ایم پی بھوپال 1973 صفحہ 37 تا 55)

برہان پور پر (1370 تا 1601) فاروقی خاندان کے تقریباً 14 سلاطین نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ 231 سال حکومت کی۔ فاروقی عہد، تہذیب و ثقافت، علم و فضل اور فنِ تعمیر کی ترقی کے لحاظ سے بڑا سنہری دور گزرا ہے۔ اس دور کے سلاطین نے فنِ تعمیر کے وہ نقوش چھوڑے ہیں، جن کے آثار صدیاں گذر جانے کے بعد بھی نظروں کو خیرہ کرتے ہیں نیز مقامی اور عالمی سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ان تعمیرات میں جامع مسجد برہان پو، جامع مسجد اسیر گڑھ، قلعۂ اسیر، شاہی مقبرے وغیرہ قابل دید، لائق رشک اور قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں عربی، فارسی زبان میں بڑے اہم کارنامے انجام دیے گئے۔ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز بھی شاہ باجن کے ذریعے ہوا۔ گویا فاروقی سلاطین کا دربار دانشوروں اور علم و فضل کی عظیم شخصیتوں کی کہکشاں بنا ہوا تھا۔ انھوں نے ابرِ بہار بن کر اس شہر کی آب یاری کی اور علم و دانش اور فضل وکمال کی فصلیں اگائیں۔

مغل دور (1601 تا 1720) میں یہاں کے علم و ادب، تہذیب و ثقافت نیز سیاست و معاشرت کے

میدان میں مزید اضافہ ہوا۔ اس عہد میں عبدالرحیم خان خاناں کی شخصیت، یہاں کے علم وفن اور فضل وکمال کو تقویت عطا کرنے میں اور اسے پروان چڑھانے میں ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اُن کا قیام یہاں تقریباً 32 برس رہا۔ اسی لیے کوثر چاند پوری نے جاوید انصاری کی تالیف کردہ کتاب 'سلکِ گہر' کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ۔

''عبدالرحیم خان خاناں کے طویل قیام سے اس (برہان پور) کو 'چھوٹی دہلی' کا مرتبہ حاصل ہوگیا... ایران کے اکثر علما وفضلا واطبا اور شعرا.... اپنے وطن سے چلتے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے دہلی آتے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کا دل نہ لگتا اور آخر کار برہان پور پہنچ کر (عبدالرّحیم) خان خاناں کی سرکار تک رسائی حاصل کرکے اپنی تشنگی دور کرتے تھے''

(پیش لفظ: کوثر چاند پوری بشمول 'سلکِ گہر' مؤلف جاوید انصاری 1949، ص 1 تا 3)

عبدالرحیم خان خاناں کی تبحر علمی، نفاست، شائستگی، علم دوستی، جوہر شناسی اور سیاسی حکمتِ عملی کا زمانہ معترف ہے... چنانچہ برہان پور میں ایران، افغان اور ہندوستان کے مختلف مقامات کی اربابِ کمال اور جامع الصّفات شخصیات کی آمد اور پُر شکوہ ہجوم سے مغل دربار مزین و معمور رہا۔

1720 میں حیدرآباد کے نظام الملک آصف جاہ اوّل نے اپنی خودمختاری کا اعلان کرکے برہان پور کو مزید مستحکم کیا۔ اس نے رعایا اور عوام کی جس طرز سے نگہ داشت کی، اُن کے مسائل کو حل کرنا اپنا فرضِ منصبی جانا، ویسے ہی وہ سخنور اور سخن پرداز تھا اور عبدالرحیم خان خاناں کی طرح علوم وفنون کا دل دادہ بھی۔ نظام آصفی حکمرانوں نے (1720 تا 1760) 40 برس حکومت کی۔ مغل اور نظام آصفی عہد پر روشنی ڈالتے ہوئے 1957 میں منعقدہ 'اردو کانفرنس' برہان پور میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے صدارتی خطبہ میں اہالیان برہان پور سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ:

''برہان پور کی سرزمین میں اردو کا پودا ایسا پھبکا کہ.... یہاں کے بڑے بڑے عالم اور شاعر فارسی کے ساتھ ساتھ اس زبان میں بھی لکھنے لگے اور جب اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے برسوں اورنگ آباد میں قیام کیا تو اورنگ آباد کی علمی وادبی چہل پہل زیادہ تر برہان پوری کے ادیبوں اور شاعروں کی مرہون منت رہی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر برہان پوری شاعروں اور صاحبان کمال کو اورنگ آباد سے خارج کردیا جاتا تو وہاں کی محفلیں سونی

> ”
> **برہان پورکی تہذیب یہاں کے قدیم سیاسی، سماجی نشیب و فراز کی مرہون منت ہے۔یہاں مختلف اوقات، ادوار میں مختلف بادشاہوں، حکمرانوں کی حکومتیں رہی ہیں، جس کا مستقل قدیم سلسلہ ''ملک راجہ فاروقی(1370تا 1399)سے ملتا ہے۔اس سے قبل یہاں کی عوامی زندگی پر مقامی رنگ کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس پر مسلم حکمرانوں کا ورود و قیام ہوا تو مقامی میل جول سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی، جس کی ترقی پذیر صورت آج بھی اس شہر کے رہن سہن، بود و باش، زبان اور کھان پان میں نظر آتی ہے۔**
> “

نظر آنے لگتیں۔ جب اورنگ آباد سے سلطنت آصفی کا پایہ تخت حیدرآباد منتقل ہوا تو دوسروں کے ساتھ ساتھ برہان پوری شعراء اور ادیب بھی حیدرآباد چلے گئے اور اہل کمال کی آمدورفت کا سلسلہ برسوں تک جاری رہا.... جب بھی اور جہاں کہیں اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی برہان پور کے صاحبان کمال اور خدمت گذاران اردو کو فراموش نہ کیا جاسکے گا''

(خطبہ صدارت اردو کانفرنس برہان پور۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور بشمول ماہنامہ سب رس حیدرآباد زور نمبر دسمبر 1963 صفحہ 317 تا 320)

نظام آصفی کے بعد مرہٹے قابض ہوئے، پھر پیشوا آئے، ہولکر آئے، ان ادوار میں بھی علم وفن کی نشر و اشاعت ہوتی رہی۔ 1819 میں اسیر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ پھر مختلف معاہدے کے تحت یہ سندھیا اور ہولکر کے ماتحت رہا۔ آہستہ آہستہ انگریزوں نے برہان پور اور اس کے قرب وجوار پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی تسلط کے ساتھ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح اسے بھی قربان گاہ بنادیا گیا۔ اُخوّت اور امن کے شفاف اُفق پر ظلم وبربریت کے سیاہ بادل چھا گئے۔ انجام کار یہ ہوا کہ یہاں کا باشعور فرد جنگ آزادی کے کارواں میں شریک ہوکر وطن کو آزاد کرانے کے درپے ہوگیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے روشن باب میں یوں تو ہند کے ہر گوشے سے مجاہدین آزادی نے حصہ لیا، جس کی ایک طویل فہرست ہے۔ برہان پور بھی اس فہرست میں شامل ہونے کا فخر

واعزاز رکھتا ہے۔ یہاں سے تحریک آزادی میں حصہ لینے والے کچھ مجاہدین آزادی کے نام اس طرح ہیں۔

عبدالقادر صدیقی برہان پوری (ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان ایم پی ص 299، ایضاً ... ایم، پی ضلع گزیٹر مشرقی نماڑ، مرتب پریم نارائن شری واستو ضلع گزیٹر وبھاگ ایم پی بھوپال 1971، ص 92، ایضاً کرانتی کے چرن، پریادت شکل ص 155)

منشی علیم اللہ خیالی برہان پوری (یادگار سلف۔ جاوید انصاری 1983 ص 21، ایضاً مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین مومن، بھاوے پراوئیٹ لمیٹڈ بمبئی 8، مارچ 1994، ص 689)

حشمت اللہ ریاضی برہان پوری (مجموعۂ کلام، میکدہ (حشمت اللہ) ریاضی برہان پوری، مارچ 1972 ص 6، ایضاً مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین مومن۔ بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی 8، مارچ 1994، ص 689 تا 690)

مولانا حفظ الرحمٰن برہان پوری، محمد ابراہیم ممبر، محمد اصغر ایڈوکیٹ، (مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین مومن، بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی 8، مارچ 1994، ص 681 تا 682)

خلیق برہان پوری، والدۂ خلیق کلثوم بی زوجہ سعد اللہ میاں جی ('برہان پور تاریخ کے آئینہ میں' پروفیسر وسیم افتخار انصاری، بشمول، روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی، آٹھویں قسط، اتوار 10 اکتوبر 2010، ص 6، ایضاً برہان پور میں اردو نثر نگاری ماضی اور حال کے آئینے میں۔ پروفیسر وسیم افتخار انصاری۔ رشید بک ڈپو، منڈی بازار، برہان پور، نومبر 2012، ص 120 اور اسماعیل فہمی برہان پوری (مجموعۂ کلام، نیرنگِ دانش، محمد اسماعیل فہمی برہان پوری، مرتب جاوید انصاری، ادبی سوسائٹی برہان پور 1976 ص 6) وغیرہ حضرات کے ساتھ ہندو حضرات نے بھی خوب بڑھ چڑھ کر تحریک آزادی میں برہان پور کی نمائندگی کی۔

برہان پور کی تہذیب یہاں کے قدیم سیاسی، سماجی نشیب وفراز کی مرہون منت ہے۔ یہاں مختلف اوقات، ادوار میں مختلف بادشاہوں، حکمرانوں کی حکومتیں رہی ہیں، جس کا مستقل قدیم سلسلہ ''ملک راجہ فاروقی (1370 تا 1399) سے ملتا ہے۔ اس سے قبل یہاں کی عوامی زندگی پر مقامی رنگ کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس پر مسلم حکمرانوں کا ورود وقیام ہوا تو مقامی میل جول سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی، جس کی ترقی پذیر صورت آج بھی اس شہر کے رہن سہن، بود وباش، زبان اور کھان

جن حضرات نے اردو زبان وادب کا غائر مطالعہ کیا ہے اور جن کی عمیق نظری نے قدیم علمی و ادبی روایات اور تاریخ کا جائزہ لیا ہے ,وہ یقینایہاں کے شان دار ادبی سرمائے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں سے ایسی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں جس سے اردو ادب کی ارتقائی نشوونما میں مدد ملی۔جن سے گذر کر اردو ادب موجودہ صورت حال تک پہنچا۔

پان میں نظر آتی ہے۔

برہان پور میں اردو زبان وادب کی تاریخ کا سلسلہ بڑا قدیم اور تابناک ہے۔ یہ ایسے علاقوں میں شمار ہوتا ہے، جن کا اردو زبان وادب کی ابتدائی نشوونما سے گہرا رشتہ رہا ہے۔جن حضرات نے اردو زبان وادب کا غائر مطالعہ کیا ہے اور جن کی عمیق نظری نے قدیم علمی وادبی روایات اور تاریخ کا جائزہ لیا ہے،وہ یقیناً یہاں کے شان دار ادبی سرمائے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں سے ایسی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں جس سے اردو ادب کی ارتقائی نشوونما میں مدد ملی،جن سے گذر کر اردو ادب موجودہ صورت حال تک پہنچا۔

مذکورہ افضلیت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ برہان پور شمال ودکن کے مابین ایک گذرگاہ اور رابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔جیسا کہ سیّد احتشام حسین نے 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں تحریر کیا ہے:

''تہذیبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ بات بھی مطالعہ کے لائق ہے کہ دہلی سے دیوگری (دولت آباد) تک کے راستے میں آج بھی ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مسلمانوں کی قدیم آبادی اور صوفیوں کے مساکن اس سفر (تغلق کا دارالسلطنت دولت آباد کرنا اور دلّی کے عوام کا دولت آباد آنا) کی یاد دلاتے ہیں''

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سیّد احتشام حسین، چوتھا ایڈیشن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2001ص 25 پر حاشیے کی عبارت ملاحظہ کریں)

چنانچہ جب بھی شمالی ہند یا دکن سے کوئی علمی جماعت، شاہی لشکر، تاجر یا سفیر کی ادھر اُدھر آمدورفت ہوتی تو اُن کا قیام یہاں لازماً ہوتا۔لہٰذا شمال ودکن میں جو بھی سیاسی، سماجی ہلچل اور زبان وادب میں نئی نئی کوششیں ہوتیں، اُس کے اثرات یہاں ضرور پڑتے۔ انھیں اسباب کی بناپر برہان پور میں علم وفن اور فضل وکمال کی ایسی خوش گوار فضا قائم ہوئی، جس میں مختلف زبانوں کے علوم وفنون اور اصناف سخن کو پھیلنے، پھولنے، پھلنے اور پنپنے کے بہتر مواقع فراہم ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی زمانے سے یہاں قابل قدر علمی شخصیتیں، اپنے علم وفن کا چراغ روشن کیے ہوئے نظر آتی ہیں۔

عہد خلجی 1305 سے قبل یا آغاز ہی سے یہاں شعروسخن کے نمونے سعدی دکنی (برہان پوری) کے اشعار کی صورت میں دست یاب ہونا شروع ہوتے ہیں۔مثلاً مقطع کا شعر دیکھیں۔

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

یہ زمانہ قلی قطب شاہ کے عہد (1556 تا 1612) سے تقریباً 3 صدی قبل کا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اُس وقت سے یہاں شعروسخن کی آب یاری کا سلسلہ جاری ہے۔ سعدی دکنی کا دیوان دست یاب نہیں، چند تذکرہ نگار مثلاً میر، قائم، مصحفی، میر حسن وغیرہ نے اُن کے دو، تین اشعار اپنے تذکروں میں درج کیے ہیں۔ اس لیے باقاعدہ شاعری کا آغاز شیخ بہاؤالدین باجن (آمد 790ھ/1388 رخصت 912ھ/ 1506) کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اُن کا عظیم کارنامہ 'خزائن رحمت اللہ' ہے۔ پروفیسر شیخ فرید کے مطابق جس کے ساتویں باب 'خزانۂ ہفتم' میں اُن کا ہندوی (قدیم اردو) کلام ملتا ہے۔اس لحاظ سے بھی یہاں شعروادب کا آغاز قلی قطب شاہ سے تقریباً دو صدی قبل ہوجاتا ہے۔

شاہ باجن کے بعد شیخ علی متقی نے علم فقہ وحدیث میں بہ زبان عربی وفارسی 100 سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں۔ اُن کا مایۂ ناز کارنامہ 'کنزالعمال' ہے۔ محمد بن فضل اللہ کا 'التحفۃ المرسلۃ' اور شیخ عیسیٰ جنداللہ نے عربی وفارسی میں کئی اہم کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں۔ ان میں علی متقی اور عیسیٰ جنداللہ نے اردو میں اشعار بھی کہے ہیں۔ ولی کے استاد سعداللہ گلشن، جن کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے ایک لاکھ سے زائد اشعار کہے ہیں۔ سعداللہ گلشن کے بعد اولین مرثیہ نگار ہاشم علی، متین پھر بالاجی ترمبک نایک ذرّہ، عاصی، زائی، درگاہی خاں حاذق سلسلۂ میرتقی میر، فخرالدین حاذق سلسلۂ ناسخ، علیم اللہ خیالی سلسلۂ ناسخ، مولوی عثمان خاں راغب، مولوی اختر محمد خان رام پوری سلسلۂ امیر مینائی، عنایت علی آغاز سلسلۂ سیماب اکبرآبادی، منشی حشمت اللہ ریاضی، مطیع اللہ راشد، اسماعیل فہمی، حمید اللہ خلیق، محمود درّانی، صلاح الدین فائق سلسلۂ داغ، ساز، اختر آصف، اسیر امیدی، محسن امیدی، نعیم راشد، نعیم اختر خادمی، ڈاکٹر جلیل الرحمٰن، طاہر نقاش اور فاروق راحیل وغیرہم بے شمار شاعروں، مشہور شعری سلسلوں اور سات صدیوں سے گذرتے ہوئے یہ شعری روایت دور حاضر تک چلی آتی ہے۔ چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

حیرت اس بات کی ہے کہ جو سلسلہ سعداللہ گلشن برہان پوری کے زیر سایہ، ولی کے ذریعے پنجاب اور دہلی پہنچا، وہ خواجہ ناصر عندلیب، خواجہ میر درد، ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن سے ہوتے ہوئے (بحوالہ مضمون، تنویر احمد علوی بشمول، نوائے ادب بمبئی جولائی 1974 ص 12) لکھنؤ میں ناسخ، شمشاد، قلق اور وزیر تک آیا اور پھر لکھنؤ سے دائرہ نما گھوم کر حاذق، راغب اور خیالی کے ذریعے برہان پور پہنچا گویا برہان پور کی شعری شمع سے چراغ روشن ہوئے، چراغوں سے مشعل اور مشعلیں آفتاب بن کر اوٹیں۔یعنی

یہ نظریں بھٹک کے ادھر اُدھر ترے رخ پہ آ کے ٹھہر گئی

شمال و دکن میں جو بھی سیاسی، سماجی ہلچل اور زبان و ادب میں نئی نئی کوششیں ہوتیں، اُس کے اثرات یہاں ضرور پڑتے۔ انھیں اسباب کی بنا پر برہان پور میں علم و فن اور فضل و کمال کی ایسی خوش گوار فضا قائم ہوئی، جس میں مختلف زبانوں کے علوم و فنون اور اصناف سخن کو پھیلنے، پھولنے، پھلنے اور پنپنے کے بہتر مواقع فراہم ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی زمانے سے یہاں قابل قدر علمی شخصیتیں، اپنے علم وفن کا چراغ روشن کیے ہوئے نظر آتی ہیں۔

درج بالا شواہد کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ برہان پور میں اردو زبان وادب کا سلسلہ اردو کی ابتدائی نشوونما اور اس کی تخم ریزی سے ملتا ہے۔ برہان پور میں اردو کے تابناک ماضی کو مدِنظر رکھتے ہوئے حال اور مستقبل کے تابناک ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Waseem Iftekhar Ansari
Asst. Prof. Dept of Urdu
Govt. Maharani Laxmi Bai Girls
PG College, Qila Maida
Indore - 452006 (MP)

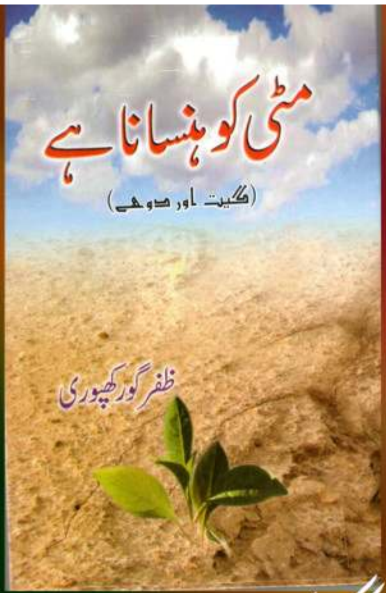

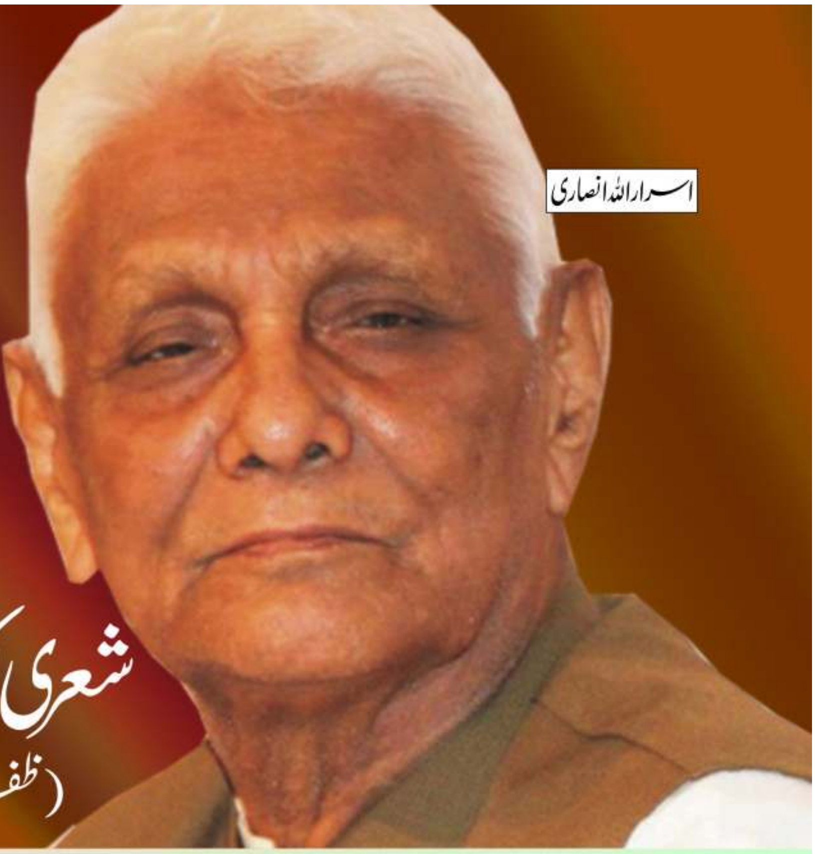

اسرار اللہ انصاری

شعری احساس میں گفتگو کا آہنگ

(ظفر گورکھپوری پر تعزیتی نوٹ)

ظفر گورکھپوری ہمارے دور کے مقبول ترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، چھے دہائیوں پر مشتمل ان کی شعری خدمات بڑی وقیع ہیں، انھیں ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ پچھلی نصف صدی سے موصوف کی تخلیقات اور ادبی کاوشات اردو کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہورہی ہیں۔ ساتھ ہی ملک و بیرون ملک مشاعروں اور ادبی محفلوں وغیرہ میں شرکت آپ کے شاعرانہ امتیازات کی غماز ہیں۔

ظفر گورکھپوری کا اصل نام ظفر الدین تھا۔ 5 مئی 1935 کو اتر پردیش کے ایک گاؤں بدولی بابو ضلع گورکھپور میں انصاری رحم علی کے یہاں ولادت ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد مدرس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہوئے اور عروس البلاد ممبئی کے سرکاری اسکول سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ممبئی میں رہتے ہوئے پوری طرح یہاں کے ادبی ماحول میں رچ بس گئے، یہاں کے ادبی حلقے میں بھی اپنی شخصیت اور شاعری کے باعث انفرادیت قائم کی۔ ظفر گورکھپوری نے جب شاعری کی ابتدا کی اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور اردو کے بڑے بڑے ترقی پسند شاعر و ادیب یہیں اپنی روشنی بکھیر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا اڈہ ممبئی ہی تھا، جہاں سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، ظ انصاری، علی سردار جعفری، جانثار اختر، کیفی اعظمی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطان پوری اور ندا فاضلی وغیرہ جیسے متعدد شعرا و ادبا کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ ان سب کے درمیان بھی ظفر گورکھپوری اپنے ادبی سفر میں کامیابی کے ساتھ نہ صرف گامزن رہے بلکہ اپنی انفرادی شناخت بھی قائم کی۔ ظفر گورکھپوری نے جہاں شاعری کی متعدد اصناف مثلاً غزل، نظم، دوہا اور گیت میں طبع آزمائی کی وہیں بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں بھی تخلیق کیں اور ڈرامے بھی لکھے۔ آپ کے شعری مجموعوں اور طبع شدہ کتابوں میں 'تیشہ'، 'وادیِ سنگ'، 'گوکھرو کے پھول'، 'چراغِ چشم تر'، 'زمین کے قریب'، 'مٹی کو ہنسانا ہے'، 'ناچ ری گڑیا'، 'سچائیاں'، 'آر پار کا منظر'، 'تنہائی' اور 'ہلکی، ٹھنڈی، تازہ ہوا' ہیں۔

(وہاب اشرفی، تاریخِ ادب اردو، جلد سوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص 1697)

کئی مجموعے ہندی میں بھی شائع ہوئے۔ ظفر گورکھپوری کو اپنی شاعری اور ادبی خدمات کے صلے میں مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ، امتیاز میر اور فراق سمّان سے بھی نوازا گیا۔ پچھلے چند برسوں سے علیل تھے، اور بالآخر 29 مئی 2017 کی شب ممبئی میں ہی آخری سانس لی۔

میدانِ شعر و ادب میں ظفر گورکھپوری نے جس قدر مقبولیت حاصل کی اسی طرح فلمی نغمہ نگاری، گیت اور غزل گائیکی کی دنیا میں بھی انھیں بہت سراہا گیا۔ بالی ووڈ کی متعدد فلموں میں آپ کے تحریر کردہ نغمے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ کئی گیتوں کو ناظرین و سامعین نے بہت پسند کیا۔ ظفر گورکھپوری ستر کی دہائی سے فلمی نغمہ نگاری سے وابستہ رہے۔ چند مشہور فلمیں جن میں موصوف کے گیت شامل ہیں ان کے نام 'تپلی بائی'، 'زمانے سے پوچھو'، 'شمع'، 'غنڈہ راج'، 'ہلچل'، 'ظالم'، 'خوددار' اور 'بازی گر' وغیرہ ہیں۔ فلموں کے علاوہ ظفر گورکھپوری کے تحریر کردہ گیت اور غزلوں کے متعدد البم بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں بطورِ خاص: دل پاگل ہے، امن، آپ کے پاس، خیال، تڑپ، آفتاب، گھونگھٹ وغیرہ ہیں۔ محمد رفیع، طلعت محمود، کشور کمار، مہدی حسن، نصرت فتح علی خان، پنکج ادھاس، طلعت عزیز جیسے متعدد مشہور و معروف گلوکاروں نے ظفر گورکھپوری کی شاعری کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ فلمی دنیا میں شعر و ادب کا ذوق و شوق رکھنے والے بیشتر فلمسازوں، ہدایت کاروں، شاعروں، کہانی و مکالمہ نویسوں نے ظفر گورکھپوری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

ظفر گورکھپوری ابتدا میں اگرچہ انجمن ترقی پسند مصنّفین سے وابستہ رہے اسی سبب وہ ترقی پسند شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی تحریک تک محدود نہ رہے، نہ اُن کی شاعری محض کسی ایک تحریک کی نمائندہ رہی۔ بلکہ ظفر گورکھپوری کی شہرت و مقبولیت، شعری پختگی اور ادبی کمالات میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یعنی ظفر گورکھپوری نے متوازن راہ اختیار کی جس پر چل کر انھوں نے اپنی شاعری کا کینوس وسیع کیا اور بحیثیت شاعر صفِ اول میں شمار کیے جانے لگے۔ سبھی تحریکات و رجحانات کی صالح قدروں سے انھوں نے اکتساب فیض کیا، مصنوعی جذباتیت سے ہمیشہ دور رہے نیز کسی بھی سیاسی و ادبی تحریک میں گم ہوکر اپنی شاعری کو پراگندہ نہ

کیا۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری میں یہ وصف ابتدا سے ہی عیاں ہیں۔ لہٰذا انجمن ترقی پسند مصنفین کے اسٹیج سے جب ظفر گورکھپوری کا اولین شعری مجموعہ 'تیشۂ' منظرِ عام پر آیا تو اس کے دیباچے میں مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے تحریر کیا:

''ظفر گورکھپوری کی انجمن بہت وسیع اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، اس لیے ان کی شاعری نہ ابہام ہے، نہ صرف معروضی، وہ پرانی ترقی پسند شاعری بھی نہیں ہے جس کا ایک واضح مقصد بھی ہوتا تھا اور ایک بلند آہنگ بھی ہوتا تھا۔ لیکن جس میں سچی شاعری کا کیف وکم اکثر اوقات کم کم ہوتا نظر آتا تھا۔ جس میں معلوم ہوتا تھا کہ دماغ کو صرف اوپری سطح تک کھرچ گیا ہے، مگر ظفر گورکھپوری کی شاعری ایسی شاعری بھی نہیں ہے۔ یہاں مقصد اُگلا نہیں گیا ہے معلوم ہوتا ہے خون میں جذب ہوگیا ہے۔ 'تیشۂ' کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے بھوک، بیکاری، زرداری کے مسائل کو اپنی ہڈیوں تک محسوس کیا ہے اور اسے اپنے ذہن کی آخری تہہ تک پہنچا کر باہر اچھالا ہے۔''

(کرشن چندر، ہیرے کا جگر، مشمولہ 'تیشۂ' ظفر گورکھپوری، مطبوعہ انجمن ترقی پسند مصنفین، شاخ کرلا، بمبئی 1962، ص 14-13)

کہنے کی بات یہ ہے کہ ظفر گورکھپوری کے یہاں ابتدا سے ہی انسانی مسائل اور زندگی سے وابستہ معاملات پیش پیش رہے ہیں، اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے شاعری میں نہ صرف پختگی و مشاقی آتی جاتی ہے بلکہ ان کے اُس جذبۂ انسانیت کی شدت، انفرادیت اور بے تکلفی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جس کا شناخت نامہ ظفر گورکھپوری کی پوری شاعری ہے۔ اس کی مثالیں ان کے دوہوں میں بھی مل جاتی ہیں، مثلاً:

بھوکی بھیڑ ہے جسم میں بس بیبی بھر خون
چرواہے کو دودھ دے یا تاجر کو اون
من صحرا ہے پیاس کا تن زخموں کی سیج
ساری دھرتی کربلا مولا پانی بھیج

مادی آسائشوں سے بھرپور روزگار کی تلاش اور معیارِ زندگی کو بلند کرنا موجودہ زمانے کے آدمی کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا ہے، اس مقصد کے لیے انسان نہ صرف دیہاتوں سے شہروں کی طرف بلکہ ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے کے لیے بھی تیار ہے۔ آدمی جس گھر میں پیدا ہوتا ہے، جس گاؤں میں اُس کا بچپن گزرتا ہے اس کی یادیں دل و دماغ میں بہت اندر تک، بلکہ خون میں شامل ہو کر دوڑتی رہتی ہیں، اور زندگی اس مہاجر شخص کو پریشان کیے رہتی ہے۔ دنیا بھر کے انسان اپنی زندگی سنوارنے کی خاطر ایسی تلخ یادوں کو سینے میں دبائے ہوئے ہیں۔ ان احساسات کو ظفر گورکھپوری نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے جس میں ہر شخص کو اپنی کہانی سنائی دیتی ہے۔

چھت ٹپکتی تھی اگرچہ پھر بھی آجاتی تھی نیند
میں نئے گھر میں بہت رویا پرانے کے لیے
شام نے اپنی زلفیں کھولیں پھیلا سایہ سایہ گھر
کیا جانے کیا دل نے چاہا آج بہت یاد آیا گھر
مٹی تجھ سے کیا رشتہ ہے جس دن ہم نے چھوڑا گاؤں
دیر تلک دیواریں روئیں، دور تلک ساتھ آیا گھر

اس کارگاہِ ہستی میں خیر و شر کی پرواہ کیے بغیر مادی آسائشوں کی طرف ہر کوئی رواں دواں ہے، ہر شخص کا مقصدِ حیات مسابقت آمیز، میکانیکی اور حصولِ دولت و ثروت ہو کر رہ گیا ہے۔ اس تگ و دو میں موجودہ دور کا انسان اپنی بنیادوں سے بھی ہٹ گیا ہے، مگر اسے احساس تک نہیں۔ کسی کو ایسی باتیں نہ یاد آتی ہیں نہ کوئی یاد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شاعر کیوں کہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے لہٰذا اسے بار ہا یہ کرب کچوکے لگاتا رہتا ہے جس کے سبب وہ مسلسل ذہنی اذیت سے دوچار ہوتا ہے اور بار بار اس کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔

دیکھیں قریب سے بھی تو اچھا دکھائی دے
اک آدمی تو شہر میں ایسا دکھائی دے
کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے
ذہنوں میں کہیں جنگ کہیں ذات کا ٹکراؤ
ان سب کا سبب ایک مفادات کا ٹکراؤ
بلندی سے اتارے جا چکے ہیں
زمیں پر لا کے مارے جا چکے ہیں
فلک نے بھی نہ ٹھکانہ کہیں دیا ہم کو
مکاں کی نیو زمیں سے ہٹا کے رکھی تھی

ظفر گورکھپوری کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں کہ انھوں نے دیہاتی پس منظر، گاؤں کی آب و ہوا، گھر آنگن اور کھیت کھلیان وغیرہ کا مشاہدہ جس قدر باریکی سے کیا اسی قدر باریکی سے انھیں پیش کیا اور اسے اپنی جذباتی و دلی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی بیشتر مشہور و معروف غزلوں، نظموں اور دوہوں میں تجربات و مشاہدات مانوس سے ہیں لیکن انھیں بیان کرنے کا انداز بالکل دیسی اور انفرادی محسوس ہوتا ہے، ان کا یہ بے تکلفانہ انداز اور ہمارے گھروں میں رچے بسے الفاظ کے ذریعے ان کی ادائیگی کے باعث کلام میں آفاقیت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری زندگی اور روزمرہ کے ایسے تجربات اور مضامین جو ظفر گورکھپوری نے بیان کیے ہیں اسے کسی اور ہم عصر شاعر نے پیش نہ کیا ہو، یقیناً پیش کیا ہے، لیکن جو اپنائیت، علامات و لفظیات اور بول چال ظفر گورکھپوری نے اپنے بیانیے میں روا رکھا ہے وہ کم شعرا کے حصے میں آیا۔ یہی انداز انھیں دیگر شعرا سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

''ظفر گورکھپوری نے جدید غزل میں ایک غیر رسمی، کچھ بے تکلف لہجہ اختیار کیا ہے، جس کے باعث کہیں کہیں ان کی لفظیات کلاسیکی غزل کی سڈول، مناسبت اور رعایت کے جلوؤں سے چکائی ہوئی لفظیات کے شائقین کو اجنبی محسوس ہوگی۔ لیکن ایک طرح دیکھیے تو ان کی کامیابی کا راز بھی شاید اسی لفظیات میں پنہاں ہے۔ ان کے شعروں میں گفتگو کے آہنگ کو شعر کا لباس پہنایا گیا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، 'ہلکی' ٹھنڈی، تازہ ہوا' ظفر گورکھپوری، بھوپال 2009، ص 12)

ظفر گورکھپوری کے متعدد نمائندہ اشعار زبان زد خاص و عام ہیں جسے ادب کے قارئین اور مشاعروں کے سامعین نے ہمیشہ سراہا اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میری اک چھوٹی سی کوشش تجھ کو پانے کے لیے
بن گئی ہے مسئلہ سارے زمانے کے لیے
وقت ہونٹوں سے مرے وہ بھی کھرچ کر لے گیا
اک تبسم جو تھا دنیا کو دکھانے کے لیے
آسماں ایسا بھی کیا خطرہ تھا دل کی آگ سے
اتنی بارش ایک شعلے کو بجھانے کے لیے
بدن کجلا گیا تو دل کی تابانی سے نکلوں گا
میں سورج بن کے اک دن اپنی پیشانی سے نکلوں گا
نظر آجاؤں گا میں آنسوؤں میں جب بھی روؤ گے
مجھے مٹی کیا تم نے تو میں پانی سے نکلوں گا
میں ایسا خوبصورت رنگ ہوں دیوار کا اپنی
اگر نکلا تو گھر والوں کی نادانی سے نکلوں گا

جو چیز ہے اپنی وہ بہر حال ہے اپنی
یہ درد یہ سوزِ غم و آلام کے دوں
ملتا نہیں کوئی دلِ پُر خوں کا طلب گار
یہ میکدۂ حافظ و خیام کے دوں
سلسلوں کے بعد کوئی سلسلہ روشن کریں
اک دیا جب ساتھ چھوڑے دوسرا روشن کریں

■

Dr. Asrarullah Ansari
Asst. Prof. MLC Govt. Girls College
Khandwa - 450001 (MP)

شعیب رضا فاطمی

عشق دھاگے سے لپٹی نظمیں

(صلاح الدین پرویز پر ایک پرانا نوٹ)

عہد در عہد زندہ رہنے والی شاعری کے خمیر میں جہاں روایت کی خوشبو ہوتی ہے وہیں جملہ عہد کے اقدار، نمائندہ فکر اور فلسفے کی آمیزش بھی ہوتی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ زندگی سے جڑی ان حقیقتوں کو خوبی کے ساتھ یکجان کر دیا جائے اور ان پر علامت کی ایسی جھینی چادر ڈال دی جائے جسے فکر کی آنکھیں بخوبی دیکھ سکیں۔

شاعری کی بنیاد دماغ کے بجائے دل میں پڑتی ہے اور احساسات کے سہارے یہ برگ و بار لاتی ہے ظاہر ہے مشاہدہ اس کی قوت نمو کو ابھارنے میں تعاون کرتا ہے لیکن یہ مشاہدہ بھی اگر شاعر نے ایک فریق ہو کر کیا تو پھر وہ شاعری محض جذباتی اور سطحی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کمال ہنر مندی یہ ہے کہ اپنے اوپر گذرے ہوئے حادثات و واقعات پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے اور اپنے جذبات قلمبند کرتے وقت جس صنف کا انتخاب کیا جائے اس صنف پر کامل دسترس ہو۔ میری مراد اصناف کے کٹگھرے میں قید ہونے سے نہیں ہے۔ ایک اچھا شاعر بڑی شاعری اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کے اندر مسلسل فکر کرنے کی صلاحیت ہو اور ممکن ہے یہ فکر اسے بنے بنائے اصول سے انحراف کا راستہ بھی دکھا دے اور وہ راستہ اس کی فکر کے لیے موزوں بھی ہو۔ کیونکہ اکثر بڑے تخلیقی شہپارے روایتی اصناف کے جامد در و دیوار کو وسیع بھی کر ڈالتے ہیں اور اسے اس تخلیق کار کا ذاتی اسلوب قرار دیا جاتا ہے۔

> **صلاح الدین پرویز کے لیے وقت بھاگتی ہوئی ریل نہیں اور نہ ہی بہتی ہوئی ندی کا ایسا دھارا جو کبھی مخالف سمت نہ بہے وہ انسان کو ہر عہد میں ایک مکمل انسان کی شکل میں دیکھتے ہیں چاہے وہ قدیم عہد کا ہو یا جدید عہد کا رادھا ہو یا ہیر، سسی ہو یا لیلیٰ یا پھر سوہنی وہ صرف اور صرف معشوق ہیں، ایک ایسا کردار جس کو چاہا جائے اور چاہا جانے والا کردار آتما کا نہیں ہو سکتا وہ پرم آتما ہوتا ہے۔**

صلاح الدین پرویز کا شعری اسلوب ایک مثال ہے جہاں تاریخ بھی ہے روایت بھی، عہد بھی ہے اور اقدار بھی اور ان سب کا جو فلسفہ ہے وہ بالکل نیا اور جدید۔ یہ لہجہ شاعر کا اپنا لہجہ ہے اور یہی انفرادیت اس کی شناخت ہوگی۔

صلاح الدین پرویز بنیادی طور پر ایک اچھے انسان ہیں اور انسانی اقدار کی بحالی ان کا مقصد ہے لہٰذا وہ تاریخ کے ان ہی گلیاروں میں گھومتے ہیں جہاں انھیں انسان نظر آتے ہیں۔ عشق کے فلسفے کو جدید رنگ و آہنگ عطا کرنا ان کا کمال ہے اور ہندوستان کی مٹی سے انھیں جو محبت ہے ان کی شاعری اس کا پرتو ہے۔ خود کہتے ہیں:

''ہندوستان کا منظر نامہ اس کے دیوتا اس کا کلاسیکی سرمایہ یہاں کے پہاڑ یہاں کے دریا یہاں کے بت اور شری کرشن اور عشق کا وہ ابدی احساس جس نے آریوں کی جمالیات کو جنم دیا یہی سب میری شخصیت شاعری اور وژن کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ یہی میرا متن ہے میں اپنے موجودہ جنم میں کئی ہزار برسوں پر محیط ہندوستانی تہذیب کو جی رہا ہوں۔ اس دھرتی کے فنکار اور مقدس صحیفے، اس دھرتی کا حسن، حجاب، معصومیت قدم قدم پر بکھری ہوئی عشق کی داستانیں یہ سب میرا متن ہیں۔ اس میں میر بھی ہیں، میرابائی بھی، کالی داس بھی ہیں اور ملک محمد جائسی بھی۔''

صلاح الدین پرویز کے لیے وقت بھاگتی ہوئی ریل نہیں اور نہ ہی بہتی ہوئی ندی کا ایسا دھارا جو کبھی مخالف سمت نہ بہے وہ انسان کو ہر عہد میں ایک مکمل انسان کی شکل میں دیکھتے ہیں چاہے وہ قدیم عہد کا ہو یا جدید عہد کا رادھا ہو یا ہیر، سسی ہو یا لیلیٰ یا پھر سوہنی وہ صرف اور صرف معشوق ہیں، ایک ایسا کردار جس کو چاہا جائے اور چاہا جانے والا کردار آتما کا نہیں ہو سکتا وہ پرم آتما ہوتا ہے۔ صلاح الدین کی شاعری بیانیہ کی ایسی مثال ہے جس میں الفاظ کردار ہوتے ہیں اور وہ ان لفظوں سے ایسی فضا بندی کرتے ہیں کہ انسان وقت کے آئینے میں پوری انسانی تاریخ کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے۔

مری جاں، مری جاں
جو چھپتی پھرو گی
تو کیسے لکھوں گا
بدن کے سنہرے ورق پر تمھارے

صلاح الدین پرویز کی شاعری والہانہ عشق کی شاعری ہے وہ اپنے مصرعوں کی بنت عشق کے حریری دھاگے سے کرتے ہیں۔ عشق کی ایک عجیب اور سحر کار فضا قائم کرتے ہیں اور ندی کی طرح بہے چلے جاتے ہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتے اور بہاؤ کی وہ سمت نامعلوم بھی نہیں ہوتی وہ جانتے ہیں اور انہیں اس کا پورا اعتماد ہے کہ انہیں کہاں پہنچنا ہے۔صلاح الدین پرویز اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی البیلی شاعری، ان کا بالکل منفرد اسلوب کا شاہکار ناول، نمرتا" ہمیں ہمیشہ بار بار قرأت کی دعوت دیتا رہے گا۔

وہ تخلیق اپنے بدن کے قلم سے
وہ تخلیق جن کو کبھی مجھ سے پہلے
کسی نے کسی کے لیے

جاں
لکھی تھی
کہ جب کچھ نہیں تھا
فقط دو بدن تھے
میری جاں بتاؤ وہ کس کے بدن تھے
وہی دو بدن کیا ہمارے بدن ہیں

تاریخ، روایت اور ان کی تہذیب سے صلاح الدین پرویز کی شاعری کا پورا چمن آباد ہے اور وہ اس چمن بندی میں الفاظ کی جو جڑیں، پودے یا بیل لگاتے ہیں وہ کہیں سے برآمد نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اسے اپنے آس پاس بکھرے ہوئے مردہ اور نیم مردہ تہذیبوں اور ماحول سے اٹھاتے ہیں، انھیں جھاڑ پوچھ کر کندن کرتے ہیں اور اسے نگوں کی شکل میں مصرعے در مصرعے بٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ مدماہٹ، پیڑہ، لہرا، نہارنا، وستر، چھتنار، گل گل، بانبی، سرپ، دیپک، چھتیاں، جائی، تاؤ، چاچا، دادر، کٹار، گھاؤ، وینی، سُر، رکت، چھٹا، چندرما، مرلی، چکر، رتھ اور اس طرح کے بہت سے الفاظ جو بظاہر غیر فصیح غیر اردو اور خالص ہندی اور سنسکرت کے ہیں لیکن ان لفظوں کو برتنے کا فن صلاح الدین پرویز جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس قدیم ہندو دیو مالائی واقعے کو وہ شعری متن بنا رہے ہیں اس کے لیے اس تہذیبی روایت کے الفاظ و استعارات کا استعمال ناگزیر ہے۔

تمھاری آنکھوں میں اتنا بھئے ہے
ڈر لگتا ہے
مانو ساری دنیا اس بھئے کے ساگر میں
ڈوب گئی ہو
رادھے
لیکن اس بھئے میں اک کاجل بھی رہتا ہے
وہ کاجل ورنداون میں تو نہیں بکتا ہے
رادھے
مانو تو وہ کاجل بھی میں ہی ہوں
میں نے اس کاجل کو سپنوں کے بٹّے سے
عشق کی سل پر نیندیں پیس پیس کے
تیار کیا تھا
اور اک شب
جب تم میرے دھیان کے امر بیل سے لپٹی ہوئی تھیں
آیا تھا
اور تمھارے مرگ نینی کاجل کی ڈبیا میں
اس کاجل کو سمو دیا تھا

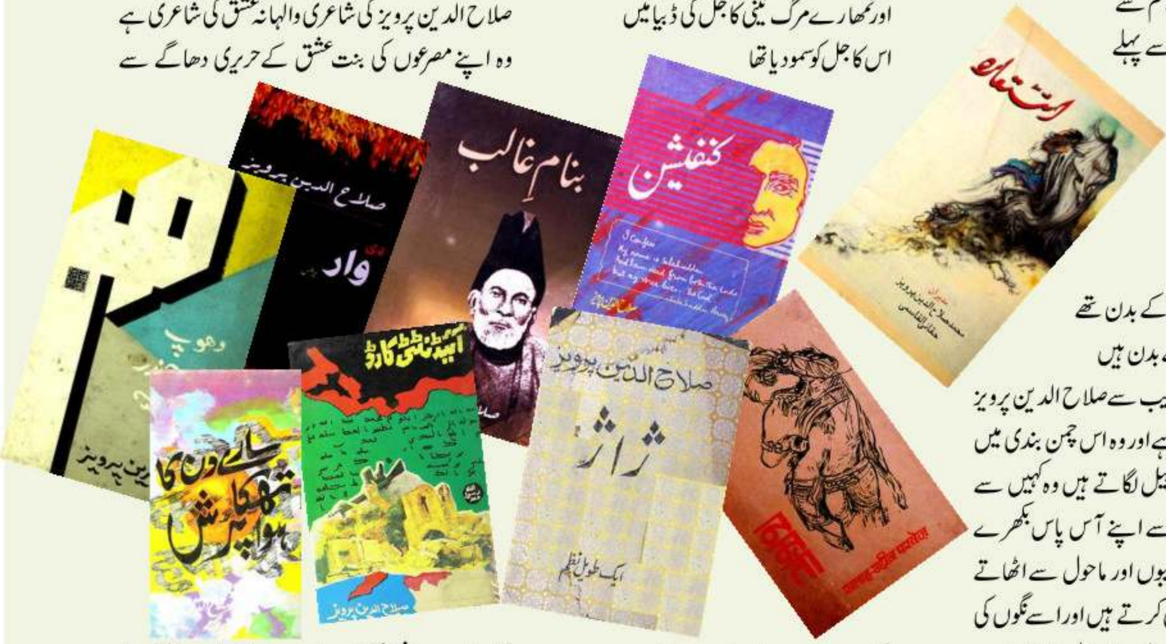

احساس کو زردوزی دو شالے پہنانا ایک بات ہے۔ خوابوں کے محل سرا کی تعمیر کرنا بھی اردو شاعری میں کوئی نئی بات نہیں لیکن ''سپنوں کے بٹّے سے عشق کی سِل پر نیندیں پیسنا صرف اور صرف صلاح الدین کی شاعری کا کمال ہے۔ ایسی تراکیب ہماری شاعری میں نظر نہیں آتیں۔ تراکیب کے سلسلے میں بھی صلاح الدین منفرد ہیں وہ گھسے پٹے اور پامال تراکیب کو اپنی شاعری میں مطلق جگہ نہیں دیتے۔ ان کی نظموں میں جگہ جگہ آپ کو ایسی اصطلاحیں نظر آئیں گی جو خود ساختہ اور منفرد ہوتے ہیں۔ لفظوں کی چھان پھٹک کے بعد جب وہ اسے ایک خاص ترکیب سے مصرعوں کی شکل دیتے ہیں تو وہ لفظ خود بخود معنی کی خوشبو بکھیرنے لگتا ہے۔

تونے ان بالوں میں جو پھول چھپا رکھا ہے
وہ میرے لمس کا ایک بن ہے اسے چھونے دے
تونے ان آنکھوں میں آنجا ہے جو کوئل کا بدن
وہ مری آنکھ کا بندھن ہے اسے چھونے دے
تونے ان ہونٹوں پہ لہکائی ہے لالی کی چھپک
وہ مرے ہونٹ کا چمبن ہے اسے چھونے دے
تونے ان ہاتھوں میں دُبکائی ہے شعلے کی لپک
وہ مری رات کی سمرن ہے اسے چھونے دے
پھر دعا کے لیے کشکول نہ اٹھنے پائے
پھر دعا کے لیے یہ بوجھ نہ جھکنے پائے
رات یوں ہی رہے اور چندر کنارا روشن
بعد اس کے کوئی رحمت تری رحمت میں نہ ہو
تیرے پشچات کوئی دن مری قسمت میں نہ ہو

صلاح الدین پرویز کی شاعری والہانہ عشق کی شاعری ہے وہ اپنے مصرعوں کی بنت عشق کے حریری دھاگے سے کرتے ہیں۔ عشق کی ایک عجیب اور سحر کار فضا قائم کرتے ہیں اور ندی کی طرح بہے چلے جاتے ہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتے اور بہاؤ کی وہ سمت نامعلوم بھی نہیں ہوتی وہ جانتے ہیں اور انھیں اس کا پورا اعتماد ہے کہ انھیں کہاں پہنچنا ہے۔

صلاح الدین پرویز اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی البیلی شاعری، ان کا بالکل منفرد اسلوب کا شاہکار ناول، نمرتا'' ہمیں ہمیشہ بار بار قرأت کی دعوت دیتا رہے گا۔

■

Shoib Raza Fatmi
H.No-47/48- J. Block, New Silampur
Delhi-110053
Mob.: 9968778671

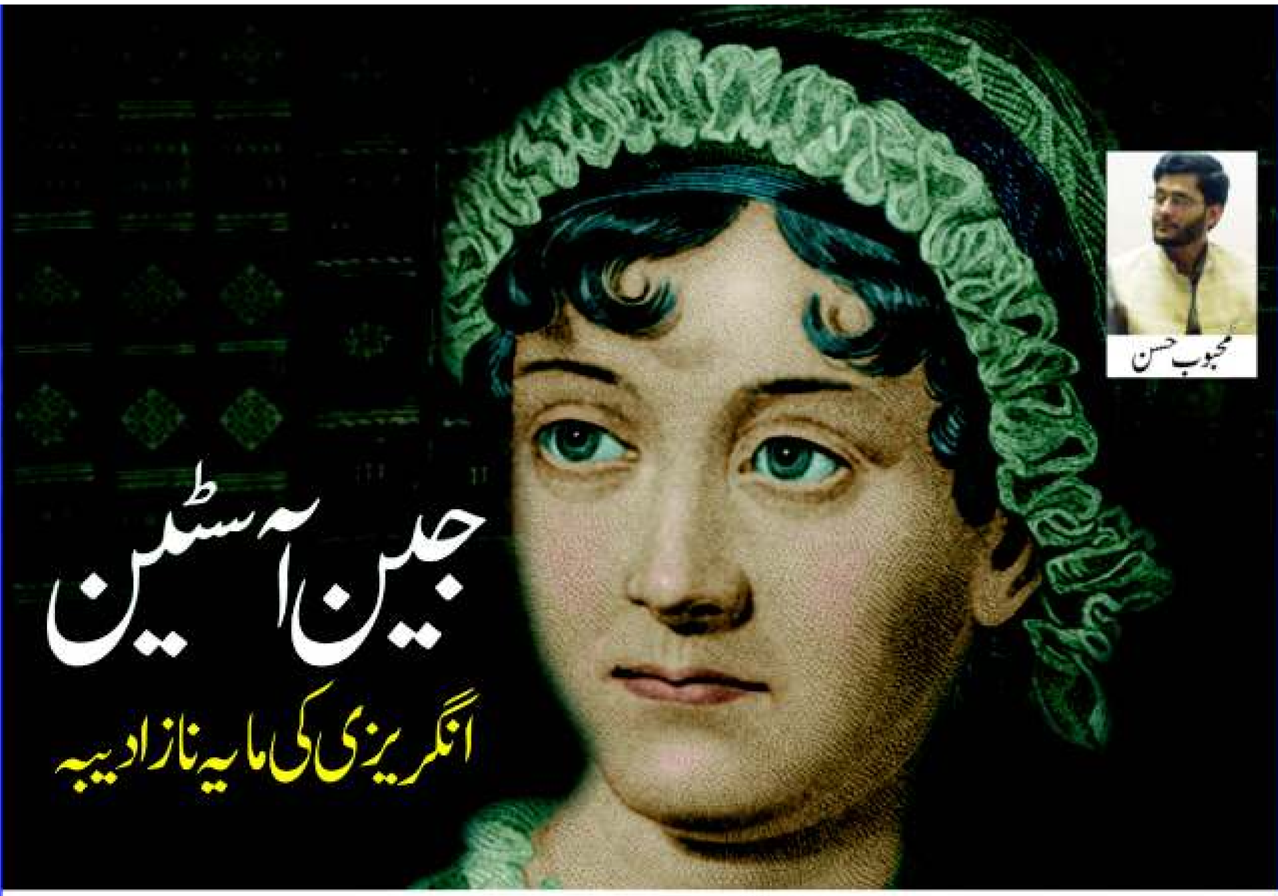

محبوب حسن

جین آسٹین

انگریزی کی مایہ ناز ادیبہ

جین آسٹین انگریزی زبان وادب کی مایۂ ناز وہر دل عزیز ادیبہ ہیں۔ انگریزی ناول کی روایت کو جن چند اہم فکشن نگاروں نے تقویت بخشی ہے،ان میں جین آسٹین کا نام ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے متعدد اہم ناول تخلیق کیے ہیں۔ان کی پیدائش 16دسمبر 1775 کو انگلینڈکی مشہور جگہ ہیمپشائر (Hampshire) میں ہوئی۔ جین آسٹین کا تعلق انگلینڈ کے معروف علمی وادبی خانوادے سے رہا ہے۔ان کے والد جارج آسٹین (George Austen) کے اندر کلاسیکی علم وادب کا گہرا شعور موجود تھا۔ان کے بڑے بھائی ہنری آسٹین (Henry Austen) بھی علم و ادب سے شغف رکھتے تھے۔جین آسٹین کی علمی اورادبی پرورش وپرداخت گھر پر ہوئی۔جین آسٹین کے فکری شعور کی تشکیل وتعمیر میں ان کے والد اوران کے بھائی نے اہم کردار ادا کیا۔بد قسمتی سے جین آسٹین نے مختصر زندگی پائی۔وہ کسی مہلک بیماری کے باعث 18جولائی 1817 کو اس دارفانی سے رخصت ہوگئیں۔اس طرح ان کی زندگی صرف بیالیس برسوں کے مختصر عرصے کومحیط ہے۔

جین آسٹین کو فکشن سے فطری لگاؤ تھا۔انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی انگریزی زبان و ادب کے بلند پایہ تخلیق کاروں مثلاً Richardson, Dr.Johnson, Walter Scott,William Goldsmith,Miss Fanny Shakespeare, Burney,Cowper,Fielding وغیرہ کا مطالعہ کر لیا تھا۔جین آسٹین کے ناولوں پر مذکورہ بالا تخلیق کاروں اور فن کاروں کے فکری وفنی اثرات شعوری وغیر شعوری طور پر مرتب ہوئے۔ جین آسٹین مذکورہ بالا فن کاروں کی قائم کردہ ادبی روایت سے مرعوب نہیں ہوئیں۔ دراصل انگریزی ادب کی دنیا میں وہ ایک روایت شکن ادیبہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔فکری ونظریاتی روایت کے برعکس جین آسٹین نے اپنے تجربات ومشاہدات اور تخلیقی دلچسپی کی بنیاد پر اپنی ایک منفرد راہ بنائی۔ ان کا بیش بہا تخلیقی سرمایہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے۔اعداد وشمار کے لحاظ سے جین آسٹین نے کل چھ ناول تخلیق کیے ہیں۔ان کے ناولوں کے نام حسب ذیل ہیں:

Pride and Prejudice

Sense and Sensibility

Emma

Mansifield Park

Persuation

اور Northanger Abbey۔جین آسٹین کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "Prose Shakepeare" اور "Mother of the Ninteeth Century Novel" جیسے اہم خطاب سے نوازا گیا۔ انھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز تفریحی خاکوں سے کیا لیکن ان کی شہرت ومقبولیت کی اصل وجہ ان کی ناول نگاری ہے۔تقریباً دوصدی گزرنے کے بعد بھی ان کے ناولوں کی دل آویزی اور مقبولیت میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

قابل غور ہے کہ جین آسٹین کا مخصوص عہد سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی نشیب وفراز سے دوچار رہا ہے۔ اس دور میں عالمی سطح پر بہت سے انقلابات وتحریکات رونما ہوئے۔امریکہ کی جنگ آزادی، انگلینڈ کا صنعتی انقلاب، نپولین کا عروج وزوال اور انقلاب فرانس جیسے تاریخ ساز سیاسی حالات وواقعات نے انگریزی ادب پراپنے غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ ادیبوں اور فن کاروں کی تخلیقات میں اس عہد کے پرآشوب وہنگامہ خیز حالات ومسائل کے گہرے نقوش ثبت ہوئے لیکن تعجب کی بات ہے کہ جین آسٹین کے ناولوں میں مذکورہ زمانے کے سیاسی،تہذیبی اور اقتصادی نشیب وفراز کی آہٹ بھی سنائی نہیں پڑتی۔انہوں نے شعوری طور پر اس وقت طلب صورت حال سے چشم پوشی کی ہے۔ عشق ومحبت اور کسک آمیز انسانی رشتوں کی قابل رشک ترجمانی ہی جین آسٹین کے فن پاروں کی تخلیقی اساس قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جین آسٹین کے بیشتر ناولوں میں موضوعات ومسائل کا ایک محدود دائرہ نظر آتا ہے۔ ان کی تخلیقی کائنات ایک خاص طرح کی معاشرتی اورادبی فضا میں نمو پاتی ہے۔جین آسٹین کی فکری وموضوعاتی ترجیحات کے پیش نظر ان کے افسانوی سرمائے کو Domestic Novel میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی نگارشات کومعاشرتی

ناول کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں تخلیق کار دو یا دو سے زائد کنبے/خاندان کے چند مخصوص گھریلو حالات و مسائل کی بنیاد پر ناول کا تانا بانا تیار کرتا ہے۔ ایسے میں فکر و نظر کا محدود ہونا عین فطری ہے۔

ان کا محبوب ترین ناول Pride and Prejudice کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ پیش نظر ناول جین آسٹین کے فکر و فلسفہ اور ان کے ذہنی تصورات و نظریات کی عمدہ مثال ہے۔ یہ ناول نوجوان طبقے کی خوش نما تمناؤں و حسرتوں نیز ان کے حسین خوابوں کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ جین آسٹین نے اس ناول کے پلاٹ و بیانیہ کی بنیاد انسانی زندگی کے نازک و لطیف جذبات و احساسات پر رکھی ہے۔ Pride and Prejudice کا ابتدائی جملہ Key Note کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' کا ابتدائیہ "It is a truth universally acknowledge, that a single man in possession of a good fortune must be in want of a wife" سے جین آسٹین کے مقصد حیات اور انسانی زندگی کے تئیں ان کے تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نے تا عمر شادی نہیں کی۔ لیکن ان کے بیشتر ناولوں میں شادی جیسے مقدس رشتے کی رشک آمیز عکاسی ملتی ہے۔ موصوفہ نے اپنے ناولوں کے توسط سے نوجوان طبقے کی آنکھوں میں محبت اور شادی کا حسین خواب سجایا ہے۔ جین آسٹین کے نزدیک رومانس انسانی زندگی کے درد و غم کا مداوا ہے۔

جین آسٹین بلا کی حسین خاتون تھیں۔ ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے انھیں باطنی خوبیوں سے بھی نوازا تھا۔ ان کا دل انکساری و عاجزی اور خلوص و محبت سے لبریز تھا۔ جین آسٹین نے بھی گلشن محبت میں قدم رکھے تھے لیکن موصوفہ نے براہ راست اپنے معاشقے کا ذکر نہیں کیا۔ جدید تحقیق کے مطابق جان بلیکال نامی ایک نوجوان نے جین آسٹین کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ بعض ناقدین نے Pride and Prejudice کے مرکزی کردار مسٹر ڈارسی کی شناخت جان بلیکال کے روپ میں کی ہے۔ توجہ طلب نکتہ ہے کہ مصنفہ کی تخلیقات اور ان کی ذاتی زندگی و شخصیت کے درمیان تضادات کے پہلو حاوی ہیں۔ جین آسٹین کے ناولوں میں موضوعاتی و فکری وسعت و تنوع نہیں ملتا۔ انہوں نے ایک محدود موضوعاتی دائرے کو اپنے فن کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ مصنفہ کی اس طرز فکر کو چند ناقدین نے خامی بتایا ہے تو بعض نے اسے خوبی میں شمار کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں پیوستہ Limited Range کے باعث ان کے تخلیقی و ادبی کارنامے کو

Two inches of ivory

Three or four families

A little bit of ivory

Ivory

اور Towered جیسے القاب و خطاب سے تعبیر کیا گیا۔ جین آسٹین کے ناولوں کے موضوعات و مسائل کے تئیں ناقدین ادب کے درمیان اتفاق رائے ملتا ہے۔ مصنفہ کی تخلیقات بالخصوص Pride and Prejudice کے مرکزی موضوعات و مسائل کے حوالے سے مغربی ناقد W.A. Craik کی رائے ملاحظہ ہو:

"Real themes of Jane Austen's novels are the same. Love and marriage is the central theme. Love and marriage are highly engaging topics for Jane Austen's women characters. All her six novels are love-stories. Matrimony, existing or intended, constitutes the main situation in her novels. Love at the first sight was the conventional theme of the romantic eighteenth century novels. The novels of Jane Austen, especially the novel 'Pride and Prejudice', also deals with love and marriage. The opening sentence of the novel 'Pride and Prejudice' sets the tone of the novel."(1)

قابل غور ہے کہ انگریزی ادب میں ناول نگاری کا آغاز سترہویں صدی سے ہوتا ہے۔ سیمول رچرڈسن کے Pamela کو انگریزی کا پہلا حقیقی ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ سیمول رچرڈسن کے بعد انگریزی ناول کی روایت کو مزید استحکام بخشنے والے اہم قلم کاروں میں Joseph Addision, Richard Steel, Daniel Defoe, Henry Fieldinge, Laurence Sterne, Oliver Gold Smith, walter Scott اور جین آسٹین وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان ابتدائی فکشن نگاروں نے انگریزی ناول کو انسانی زندگی کے حقیقی و بنیادی مسائل سے روشناس کرایا۔ فکشن کے اس عہد زریں میں انگریزی ناول صحیح معنوں میں فکری و فنی معیار و وقار سے ہم کنار ہوا۔

ذہن نشیں رہے کہ جین آسٹین نے انگریزی ناول نگاروں کی قائم کردہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے

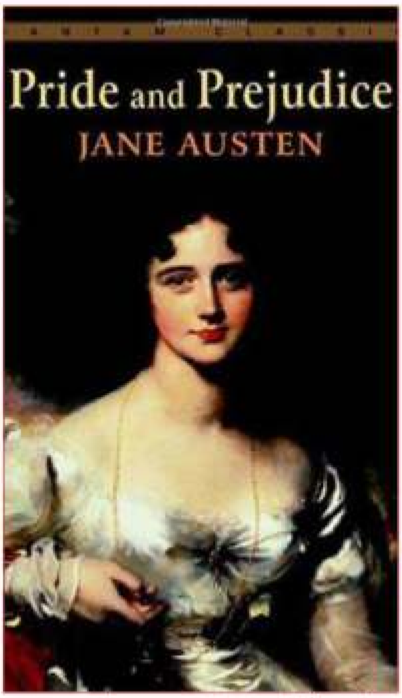

اپنی مخصوص تخلیقی روش قائم کی۔ جین آسٹین نے دیہی زندگی کے گھریلو مسائل بالخصوص نوجوانوں کی حسین خواہشات اور ان کے داخلی جذبات و احساسات کی اچھوتی تصویر کشی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے ناولوں میں موضوعات کا ایک محدود کینوس ملتا ہے، لیکن انھوں نے جس فکری گہرائی اور جس فنی بصیرت کا تخلیقی مظاہرہ کیا ہے، اس کی مثال انگریزی ادب میں خال خال نظر آتی ہے۔ حالانکہ جین آسٹین اپنی محدود فکری کائنات کے باعث ہدف تنقید بھی بنیں لیکن ان کا مخصوص انداز بیان ہی ان کا تخلیقی شناخت نامہ قرار پایا۔ قابل ذکر ہے کہ جین آسٹین سے قبل انگریزی ادب میں Domestic Novel کی روایت موجود تھی۔ انگریزی کے ممتاز فکشن نگار Oliver Goldsmith نے اپنے مشہور زمانہ ناول The Vicar of Wakefield کے توسط سے انگریزی میں 'گھریلو ناول' لکھنے کی طرح ڈالی۔ گولڈ اسمیتھ نے پہلے پہل خالص گھریلو زندگی کے داخلی و خارجی حالات و کوائف کو اپنے ناول میں پیش کیا۔ لیکن انگریزی میں Domestic Novel کی روایت کو نئی جہتوں سے ہم کنار کرنے والے فن کاروں میں Fanny Burney, Maria Edgeworth, Susan Ferrier اور Jane Austen وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ بالا خواتین فکشن نگاروں نے جین آسٹین کے لیے تخلیقی فضا ہموار کی۔ در اصل جین آسٹین نے انھیں روایات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنا شاندار

تخلیقی تاج محل تعمیر کیا۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ جین آسٹین ڈومسٹک ناول نگاری کی اس چوٹی پر ہیں، جہاں سے دونوں طرف ڈھلان شروع ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقی عظمت و مرتبے کا اعتراف مغربی ناقدین کے ساتھ مشرقی ناقدین نے بھی کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ایس سین:

"Jane Austen occupies a prominent place in the history of the art of fiction. Though she was contemporary of Sir Walter Scott, She is more in line with her predecessors in this art than with him. She widened the scope of fiction in almost all its directions."(2)

''پرائڈ اینڈ پریجوڈس'' ان کا شاہکار ناول ہے۔ مصنفہ نے بھی اسے اپنا محبوب ترین ناول قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا ناول Pride and Prejudice، 21 برس کی عمر میں لکھا لیکن اس فن پارے کی اشاعت تصنیف کے سولہ برس بعد ہوئی۔ ان کا دوسرا ناول Sense and Sensibility بھی تخلیق کے چودہ برس بعد زیور طبع سے آراستہ ہو سکا۔ تیسرے ناول Emma کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک ناشر نے دس پاؤنڈ میں خرید کر اسے ردی کے ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ مشہور مغربی ناقد Compton Rickett نے جین آسٹین کی خلاقانہ صلاحیت کے پیش نظر مصنفہ کو Born Story-Teller کے القاب وخطاب سے نوازتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"Jane Austen was born story-teller and revelled in it from early years. She wrote from sheer love of writing and was not sensitive to criticism"(3)

جین آسٹین انسانی نفسیات کی نباض ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی ادھوری خواہشات اور اپنے کسک آمیز تجربات و مشاہدات کو ہی اپنی تخلیقی اساس بنایا ہے۔ مصنفہ کے ناولوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کا لازوال ناول Pride and Prejudice اس جانب واضح اشارہ کرتا ہے۔ پیش نظر ناول میں انہوں نے اپنی زندگی کی تلخ و شریں یادوں کو خوش اسلوبی سے سمویا ہے۔ سوانحی طرز کے اس ناول کی ہیروئن جین بینیٹ کی پرکشش شخصیت جین آسٹین سے مماثلت رکھتی ہے۔ مصنفہ جین آسٹین کے عہد کا انگلینڈ مختلف طرح کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی تحریکات و رجحانات سے دوچار تھا۔ لیکن جین آسٹین کسی مخصوص ازم / نظریے سے متاثر نہیں ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی نگارشات میں کسی طرح کی انتہاپسندی نظر نہیں آتی۔ ان کا تعلق انگلینڈ کے

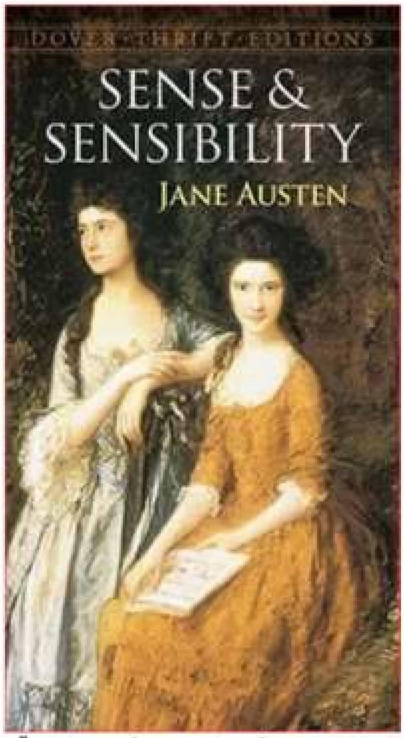

متوسط طبقے سے تھا۔ انھوں نے اپنے طبقے کی سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی زندگی کو ہی اپنی تخلیقات میں مرکزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ فن کار کو اس بات کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ آزادانہ اپنے تجربات ومشاہدات کا تخلیقی اظہار کر سکے۔ ایسے آزادانہ ادبی ماحول میں ہی کسی شاہکار وعظیم تخلیقی فن پارے کی امید ممکن ہے۔ کسی مخصوص نظریے / ازم یا کسی مصلحت / مجبوری کا بوجھ اٹھانے والا فن کا روقتی ہنگامے کی پیداوار ہوتا ہے اور اسے کسی بھی صورت حیات جاوداں نصیب نہیں ہوتی۔ عالمی ادبیات میں انجام دیے گئے تمام تر عظیم تخلیقی کارنامے اس بات کی دلیل فراہم کرتے ہیں۔ جین آسٹین کی وابستگی انگلینڈ کے معروف مذہبی، علمی اور ادبی خانوادے سے رہی ہے۔ ان کے والد جارج آسٹین انگلینڈ کے مشہور پادری تھے۔ لیکن موصوفہ نے مذہبی اور روحانی قدروں سے قطع نظر اپنے ناولوں میں انسانی زندگی کے عام مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جین آسٹین کی تخلیقات میں مذہبی فکر و فلسفے کے تئیں بیزاری ملتی ہے۔ عام تخلیقی روش کے برعکس انہوں نے ہمیشہ ہی بیش بہا انسانی قدروں کو ترجیح دی۔ دنیائے ادب میں جین آسٹین کی بے پناہ مقبولیت وکامیابی کی بنیادی وجہ ان کا منفرد وآزادانہ تخلیقی موقف ہے۔ مصنفہ کے ناولوں میں ممتاز انگریزی شاعر Alexender Pope کے مصرعہ "The proper study of mankind is man" کی فکری خوبیاں تراوش کر رہی ہیں۔ جین آسٹین کی ان خصوصیات کے متعلق F.B. Pinion کی رائے ملاحظہ ہو:

"The Jane Austen's interest was predominantly in people rather than in things, in principles of conduct, personal bias and errors of judgment rather than in the detail and colour of social scene."(4)

خاتون فکشن نگار جین آسٹین انسان دوست ادیبہ ہیں۔ ان کے فن پاروں میں انسانی اقدار و حیات کی آفاقیت موجود ہے۔ وہ خلوص ومحبت اور جذبہ ایثار وقربانی سے انسانی دکھ درد کا مداوا تلاش کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں اخلاقی قدروں کی تابناکی اور زندگی کا جمالیاتی حسن موجود ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے عشق ومحبت اور شادی بیاہ کے مسائل کو کلیدی اہمیت دی تاہم ان کے ناولوں میں جذباتیت اور مقصدیت کا گزر نہیں۔ جین آسٹین کے مرکزی کردار کے گفتار و اسلوب اور حرکات وسکنات سے سنجیدگی و شائستگی آشکارا ہے۔ ان کے شاہکار ناول Pride and Prejudice کے کلیدی کردار مسٹر ڈارسی والیزبیتھ بینیٹ اور مسٹر کولنس وجین بینیٹ انسانی زندگی کے روشن وتعمیری قدروں کے امین ہیں۔ نازک جذبات و احساسات اور خواہشات کی تکمیل ہی ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔ ان کے اندر زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہیں ہے بلکہ انھیں خواب وخیال کی نرگسی زندگی عزیز ہے۔

درحقیقت جین آسٹین کی نگارشات حسن وعشق اور رقص وسرود کا ایک ایسا نگار خانہ ہیں، جس میں جنوبی انگلینڈ کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' کے علاوہ ان کے دیگر ناولوں میں بھی حسرتوں وتمناؤں کی ایسی ہی دلفریب دنیا آباد ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کی پیش کش میں ڈرامائی اور تشریحی دونوں طریقۂ کار استعمال کیے ہیں۔ لیکن نفسیاتی ادراک اور فنی بصیرت کی ڈور ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے بیشتر کردار اسی علاقے سے ہی اخذ کیے ہیں۔ جین آسٹین کے کرداروں کی طرز زندگی سے انگلستان کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، سماجی اور اقتصادی زندگی نیز وہاں کے بود و باش، خورد ونوش اور گفتار و اسلوب کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان کے ناولوں میں کرداروں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اس بنیاد پر جین آسٹین کی نگارشات کو

'کرداری ناول' کے ذیل میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کرداروں کی پیش کش میں اپنی خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ مذکورہ ناولوں کے پلاٹ کی ترنگوں پر ہچکولے کھانے والے کرداروں سے جین آسٹین کے عمیق تجربات ومشاہدات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشہور مغربی نقاد Peter Wesland نے جین آسٹین کی اس فنی دسترس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"The special charm in Jane Austen's novel lies, not in any deep insight into character, but in the fine impartiality with which she individualises and differentiates them. Her compass is not wide, but within it she never fails."(5)

پیش نظر اقتباس میں پیٹر ویسٹ لینڈ نے جین آسٹین کی کردار نگاری پر نہایت معروضی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ موصوفہ نے اپنے موضوعات ومسائل کے دوش بہ دوش ڈکشن اور طرز نگارش کی امتیازی خوبیوں سے بھی اپنے ناولوں کو آراستہ کیا۔ ان کے فن پارے تکنیکی نقطۂ نظر سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ جین آسٹین کے ناولوں میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، اسلوب اور زبان وبیان کے بعض منفرد اوصاف نظر آتے ہیں۔ اپنے ناولوں کے پلاٹ اور واقعات کی تنظیم وترتیب میں انھوں نے اپنے فن کارانہ ادراک کا مظاہرہ کیا ہے۔ جین آسٹین نے پلاٹ سازی میں کسی پیچیدہ تکنیک سے قطع نظر سادہ وخوبصورت بیانیہ اور خطوط کا سہارا لیا ہے۔ ان کے ناولوں میں Dramatic یا Stream of Consciousness Monologue کی تکنیک کا فقدان ہے۔ جین آسٹین نے رچرڈسن کے ناول Pamela کی طرز پر اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تنظیم میں خطوط کا برمحل استعمال کیا ہے۔ ایسے ناول کو ہم Epistolary Novel کے نام سے جانتے ہیں۔ ذہن نشیں رہے کہ مصنفہ نے اپنے ادب پاروں میں کوئی نیا فنی تجربہ نہیں کیا ہے بلکہ روایتی اسلوب/تکنیک میں ہی دلکشی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات قارئین کے دل میں فکری اور فنی تازگی کا احساس جگاتی ہیں۔ کسی پیچیدگی ومشکل پسندی کے برعکس انھوں نے سادہ اور عام فہم پلاٹ کو ترجیح دی ہے۔ جین آسٹین کے ابتدائی تین ناولوں Pride and prejudice, Sense and Sensibility اور Emma میں ان کا تخلیقی حسن عروج پر نظر آتا ہے۔ ان کے دوسرے ناول بھی اپنی سادگی وپرکاری کے باوجود جمالیاتی طرز احساس کا ایک نیا تصور پیش کرتے ہیں۔

جین آستین کی تخلیقی بصیرت کا خاص راز ان کے ناولوں کے ڈرامائی حسن میں پوشیدہ ہے۔ مصنفہ نے اپنی زندگی میں ایک بھی ڈرامہ تخلیق نہیں کیا ہے لیکن ان کے ناولوں میں ڈرامے کی بیشتر خوبیاں در آئی ہیں۔ انھوں نے پلاٹ کے ارتقاء اور واقعات کے تسلسل میں مکالموں کا حسب حال استعمال کیا ہے۔ ناولوں کے کردار باہمی تصادم اور کشمکش سے دو چار نظر آتے ہیں۔ جین آستین مرکزی کرداروں کو اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانے کے بجائے انہیں فطری انداز میں جینے کی آزادی دیتی ہیں۔

جین آسٹین کی تخلیقی بصیرت کا خاص راز ان کے ناولوں کے ڈرامائی حسن میں پوشیدہ ہے۔ مصنفہ نے اپنی زندگی میں ایک بھی ڈرامہ تخلیق نہیں کیا ہے لیکن ان کے ناولوں میں ڈرامے کی بیشتر خوبیاں در آئی ہیں۔ انھوں نے پلاٹ کے ارتقاء اور واقعات کے تسلسل میں مکالموں کا حسب حال استعمال کیا ہے۔ ناولوں کے کردار باہمی تصادم اور کشمکش سے دو چار نظر آتے ہیں۔ جین آسٹین مرکزی کرداروں کو اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانے کے بجائے انھیں فطری انداز میں جینے کی آزادی دیتی ہیں۔ مذکورہ بالا خوبیوں کی وجہ سے ہی ان کے ناولوں میں ڈرامائی شان پیدا ہوگئی ہے۔ جین آسٹین نے اپنی تعلیمی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ہی عالمی شہرت یافتہ ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کی تخلیقات کا براہ راست مطالعہ کر لیا تھا۔ غور طلب ہے کہ بعض داخلی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ جین آسٹین شیکسپیئر کی تخلیقی عظمت اور فتوحات سے بے انتہا متاثر بھی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ کے ناولوں میں جگہ جگہ ولیم شیکسپیئر کا ڈرامائی انداز مترشح ہے۔ بالخصوص ان کے ناول Pride and Prejudice پر شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ Much Ado About Nothing کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ جین آسٹین کی مذکورہ تخلیقی خصوصیات کی بنا پر ہی ناقدین ادب نے انھیں Prose Shakespeare کے خطاب سے سرفراز کیا۔

جین آسٹین کے ناول مکالمہ نگاری کے اعتبار سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے مختصر، برجستہ، پرتاثیر اور فطری ہوتے ہیں۔ جین آسٹین نے مکالمہ نگاری کے لیے بول چال اور گفتگو کی عام زبان کا استعمال کیا ہے۔ کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے ان کی ذہنی کیفیت کے حسب حال ہوتے ہیں۔ مسٹر بینگلے، مسٹر ڈارسی، جین بینیٹ، ایلزبیتھ، لیڈی کیتھرین اور مسٹر کولنس کی زبان سے نکلنے والے مکالمے اس کا منطقی جواز فراہم کرتے ہیں۔ جین آسٹین کے ناولوں کی ایک نمایاں خوبی ان کا طنزیہ ومزاحیہ اسلوب اور لب ولہجہ ہے۔ مصنفہ نے اپنی تخلیقات میں بعض اوقات دانستہ شوخی وظرافت پیدا کی ہے۔ جین آسٹین نے اپنے ناولوں میں چند مزاحیہ کردار خلق کیے ہیں۔ ناول Pride and Prejudice کی ہیروئن جین بینیٹ کی والدہ مسز بینیٹ اس کی عمدہ مثال ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ Walter Scott, Goldsmith, Coleridge, William Somerset Maugham اور Sidney جیسے انگریزی کے بلند پایہ ناقدین ادب نے جین آسٹین کی تخلیقی عظمت وانفرادیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے کہ نوبل انعام یافتہ ادیب ولیم سمریٹ مام نے جین آسٹین کے ناول Pride and Prejudice کو دنیا کے دس عظیم ناولوں میں شمار کیا ہے۔ جین آسٹین نے اپنی فکری انفرادیت اور تکنیکی دلکشی کی بنیاد پر انگریزی ناول کی روایت کو مزید استحکام بخشا۔ جین آسٹین کی بے مثل افسانوی خدمات کے پیش نظر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ موصوفہ انگریزی فکشن کی دنیا میں تخلیقی دست خط کی حیثیت رکھتی ہیں۔

References:

(1) Jane Austen: The six novels, W.A. Craik, methuem, London, 1965, p: 81

(2) Pride and Prejudice: A Critical Evalution, Dr. S. Sen, Unique Publishers, New Delhi, 1992, P: 20

(3) Compton Rickett, A History of english Literature, Oxford University Press London, 1915, p: 103

(4) F.B .Pinion, A Jane Austen Companion, Macmillian Education Ltd, London, 1973, p:51

(5) Peter Westland, Contemporary literature, English Universities Press, London, 1961, P:56

■

Dr. Mahboob Hasan C/O Md Javed
Urdu Dept, Banaras Hindu University
Varanasi - 221005 (UP)
Mobile: 8527818385
Email: mahboobafaqi@gmail.com

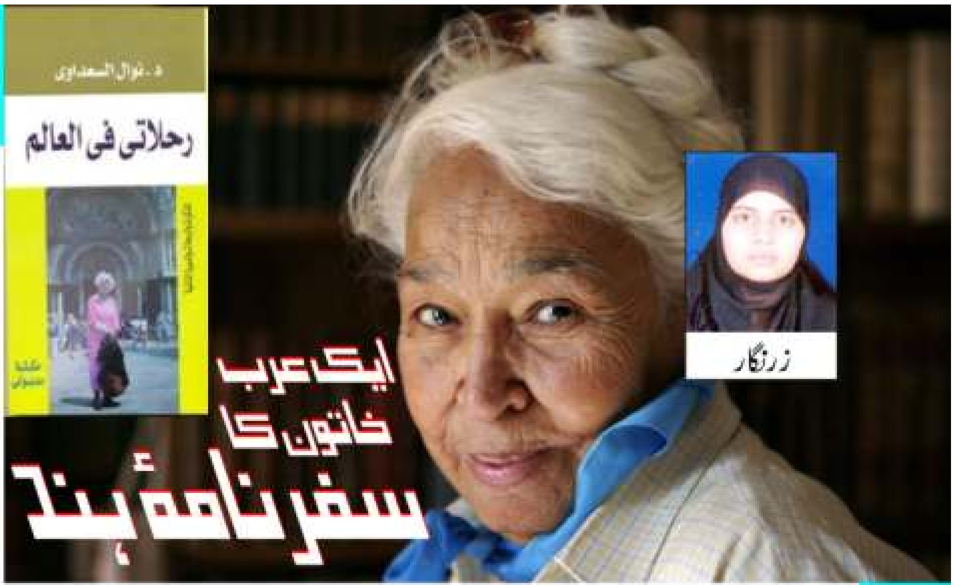

ایک عرب خاتون کا سفرنامۂ ہند

زرنگار

ہمارا وطن عزیز ہندوستان زمانۂ قدیم سے ہی سیاحوں اور راہ نوردوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے خواہ اس کی وجہ اس ملک کی وسعت مکانی اور قدرتی مناظر ہوں یا وسعت قلبی، رواداری اور گنگا جمنی تہذیب ہو۔ بہر حال یہ سیاحین عالم کے لیے ہمیشہ ایک پرکشش ملک ثابت ہوا ہے۔ ان غیر ملکی سیاحوں نے جہاں ہمارے ملک کے اقتصادی نظام کو فائدہ پہنچایا، وہیں ان میں سے ایک خاصی تعداد نے اپنی اپنی زبان کے ادبی سرمایے میں بھی اضافہ کیا اور 'سیاحتی ادب' کی آبیاری کی۔ سیاحوں اور سفرنامہ نویسوں کے اس زمرے میں یوروپی و یونانی اور عرب و غیر عرب سب ہی شامل ہیں۔ ہر زبان ان کے سیاحتی تجزیوں اور سفرناموں سے مالا مال نظر آتی ہے۔

سیاحتی روداد اور سفرنامے خواہ وہ کسی خطے یا کسی ملک کے ہوں عموماً دلچسپ اور پرکشش ہوتے ہیں خصوصاً جب بات وطن مالوف کی ہو تو ان سفرناموں کی جاذبیت اور مقناطیسیت میں کئی گنا اضافہ ہو جانا فطری بات ہے کیونکہ نگاہ غیر سے اپنے ملک کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور دیگر حالات کا مشاہدہ کرنے کا لطف ہی الگ ہوتا ہے اور جب چشم غیر ادیب و ناقد ہو تو وہ مشاہدہ کے وقت چشم غائر بن جاتی ہے اور قارئین کے لیے مطالعے کی لذت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ روز و شب کے تمام مانوس مناظر یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں، غیر محسوس اشیا محسوس ہونے لگتی ہیں، غیر مرئی اور جامد امور مرئی اور متحرک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر لفظ اور ہر جملہ تاریخی دستاویز اور ہر واقعہ عبرت و نصیحت کا ایک مستقل باب محسوس ہونے لگتا ہے۔ یعنی یہ سیاحتی شہ پارے نہ صرف قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان ہوتے ہیں بلکہ فکر میں کشادگی اور ذہنی ارتقاء کا باعث بھی ہوتے ہیں۔

'رحلاتی فی العالم' ایک عرب خاتون ڈاکٹر نوال سعداوی کی تصنیف کردہ ہے۔ جس میں ان کے دیگر اسفار عالم کے ساتھ ساتھ ایک مکمل و مفصل باب ہندوستان کے سفر و قیام کے دوران حاصل شدہ تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر نوال سعداوی 27 اکتوبر 1930 میں قاہرہ کے مضافات میں واقع ایک قصبہ کفرطحلہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قاہرہ یونیورسٹی سے 1955 میں طب کی تعلیم مکمل کی۔ موصوفہ پیشے سے ڈاکٹر لیکن صفات سے محققہ اور سماجی کارکن ہیں۔ آزادیٔ نسواں کی علم بردار ہیں لہٰذا اپنی آواز کو ایک رسالہ 'الصحۃ' کی شکل میں عوام تک پہنچانے کی کوشش بھی کر چکی ہیں لیکن حکومت کو ان کی آراء سے شدید اختلاف ہوا نتیجتاً محض تین سال کی عمر پا کر یہ رسالہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ موصوفہ کو پابند سلاسل بھی کیا گیا تھا کہ کچھ سیاسی اور دینی تنظیموں نے آپ کو سزائے موت دلوانے کی بھی سازشیں کیں لیکن ڈاکٹر نوال کے عزم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھنا تو بہت پہلے ہی شروع کر دیا تھا 1957 میں آپ کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'تعلمت الحب' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اب جب حالات نامساعد ہوئے اور فضا میں اختلاف بڑھا تو آپ کے قلم میں بھی روانی آ گئی ادبیات کے ساتھ ساتھ سماجیات کو بھی اپنا موضوع بنا لیا۔ اب تک آپ کی 40 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور دنیا کی کم و بیش 35 زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی اکثر تحریروں کا موضوع عورت، انسان اور مختلف فیہ سماجی روایات ہے۔ ڈاکٹر نوال کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں: اوراق حیاتی، المرأۃ والجنس، مذکراتی فی سجن النساء، سقوط الامام، تعلمت الحب، کسر الحدود اور قضیۃ المرأۃ المصری وغیرہ

ہر چند کہ ڈاکٹر نوال ایک متنازع فیہ شخصیت کی حامل ہیں۔ بحیثیت ادیبہ وہ ممتاز ہیں لہٰذا ان کی شخصیت کے متنازع فیہ پہلوؤں سے صرف نظر ہم صرف ان کے مشہور سفرنامہ 'رحلاتی فی العالم' جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان سے متعلق ہے پر ہی تبصرہ کریں گے۔ یہ سفرنامہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ ڈاکٹر سعداوی کے دیگر اسفار عالم کی روداد بھی ہے لیکن اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں قیام و حضر پر مشتمل ہے اور اس وقت وہی ہمارا مطمح نظر ہے۔ ڈاکٹر نوال اندرا گاندھی کی وزارت عظمی کے دور میں ہندوستان ایک انٹرنیشنل اور کچھ نیشنل سمینارز میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں۔ یہاں اپنے قیام کے دوران انھوں نے نہ صرف مذکورہ علمی مجالس میں شرکت کی بلکہ ہندوستانی ادیان و آداب کا بڑی دلچسپی سے مشاہدہ و مطالعہ بھی کیا اور بحیثیت ادیبہ و ناقدہ اپنے تجربات کو اس سفرنامے میں رقم کر دیا۔

ہندوستان کی تہہ در تہہ تہذیب و ثقافت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ڈاکٹر نوال نے جو راستہ اختیار کیا وہ یہ تھا: "میرے خیال میں ہوائی جہاز کا سفر، عجائب خانوں اور میوزیمز کے مشاہدے اور مہنگے ہوٹلوں میں قیام و طعام اصل سیر و سیاحت نہیں ہے بلکہ سیاحت کی اصل روح مقررہ مقام کے گلی کوچوں کی خاک نوردی سے اور وہاں کے باشندوں سے گفت و شنید کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔"

سرزمین ہند میں ڈاکٹر نوال ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوئی تھیں لہٰذا نئے ملک کے مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اپنے وطن سے موازنہ بھی کرتی رہیں۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سرزمین کبھی اپنے وطن مالوف مصر سے بڑی مشابہہ محسوس ہوتی تو کبھی یکسر مختلف، کبھی یہاں کے افراد اور آثار و شعائر میں انھیں مصر اور اہالیان مصر نظر آتے تو کبھی یگانگت کا احساس ہوتا۔

ڈاکٹر نوال نے ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک متعدد شہروں، اضلاع اور ریاستوں کا دورہ کیا اور حتی الامکان ان کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کی کوشش کی۔ راجستھان، گجرات اور جنوبی ہند کے ایک دوسرے سے خاصے مختلف علاقوں اور ریاستوں جہاں زبانوں کی تبدیلی سے تہذیب میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، کے دورے کے بعد ڈاکٹر نوال ایک جگہ لکھتی ہیں کہ "مصر و ہند کے باشندے شکلاً کتنے ہی ایک دوسرے سے مشابہہ کیوں نہ ہوں زبان و بیان کا معاملہ ان میں یکسر مختلف ہے مصر میں صرف اور صرف عربی زبان ہی مادری اور سرکاری زبان ہے لیکن ہندوستان کی الگ الگ ریاستوں اور مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں ہیں جو سرکاری، مادری اور ثانوی زبانوں کے الگ الگ خانوں میں منقسم ہیں۔ البتہ عربی کی ہی طرح یہاں بھی زبانیں فصحی اور عامی دونوں ہی لہجوں میں پروان چڑھتی ہیں۔ لہٰذا علوم لسانیات میں ہندوستان دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔"
آگے اپنی بات کی وضاحت کچھ اس طرح کرتی ہیں کہ

''ایک مصری بچہ ایک عرب ماحول میں پیدا ہوتا ہے اسی میں پروان چڑھتا ہے اور اخیر عمر تک اسی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے لیکن ایک ہندوستانی بچہ ہندی یا اردو، ملیالم یا تمل، پنجابی یا بنگالی یا اسی طرح کی کسی ایک مادری زبان بولنے والے گھرانہ میں آنکھ کھولتا ہے لیکن دوران پرورش اس کو ایک سے زیادہ زبانیں عموماً انگریزی یا ہندی بھی سکھائی جاتی ہیں ورنہ بیرون ریاست وہ کسی سے متعارف نہیں ہو سکے گا۔'' نیز لکھتی ہیں کہ انگریزی زبان کو ہندوستان میں مصر کے مقابلے کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہے۔ مصری قوم انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ دیتی ہے جبکہ ہندوستان میں اکثر علاقوں میں انگریزی کو سرکاری زبان تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس سفرنامے میں مناظر کا ایک ہجوم ہے اشیاء و حوادث کی تصویر کشی نئے نئے زاویوں سے کی گئی ہے۔ مثلاً سڑک پر پھدکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو دیکھ کر ڈاکٹر نوال کو ہندوستان کی فضا میں امن و سکون اور آزادی وخود مختاری کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے مصنفہ کی ذہنی جست کو بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح ایک عام منظر سے قاری کے ذہن کو بالکل نئی جہت میں موڑ دیتی ہیں۔ تاج محل جو عجائب عالم میں سے ایک ہے اور بذات خود غیر ملکی سیاحوں کی ہندوستان میں آمد کا ایک اہم سبب ہے ڈاکٹر نوال کو کچھ زیادہ نہ لبھا سکا اور ان کا تجزیہ کچھ یوں سامنے آیا ''تاج محل ایک مغل بادشاہ کی محبوب بیوی کے مقبرہ سے زیادہ کچھ نہیں..... تو جو خطیر رقم اس کی تعمیر میں خرچ کی گئی وہ ملک کے کام آسکتی تھی اور ہندوستان ایک زیادہ متمدن ملک ثابت ہو سکتا تھا۔''

جنوبی ہندوستان میں قیام کے دوران ڈاکٹر نوال نے چائے کے باغات کی سیر کرتے ہوئے چائے کی کاشت کے تمام کم وکیف معلوم کیے اور اپنے اس سفرنامہ میں محفوظ کر دیے، لکھتی ہیں: ''چائے کا پودا دیگر پودوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے اس کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ چند مخصوص شرائط کے ساتھ ہی اس کی کاشت ہو سکتی ہے جن میں ایک خاص قسم کی نشیبی زمین جو سمندری سطح سے چار ہزار فٹ اونچائی پر ہو، درجۂ حرارت، بارش، دھوپ چھاؤں اور ہوا میں نمی ان سب کا ایک متعین تناسب شامل ہے۔''

راجستھان کے محلات کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کرتی ہیں کہ'' محلات کی در و دیوار حسین ترین نقوش و نگارشات سے مزین ہیں یہاں کے باغیچے اپنے نادر و نایاب پھولوں اور رنگ و بو سے زائرین کو مسحور کر دیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عالم وجود نہیں عالم خیال ہے۔''

ڈاکٹر نوال نے شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند کے سفر کے دوران نہ صرف مختلف ریاستوں، علاقوں اور اضلاع کی تہذیب وثقافت کا مشاہدہ کیا بلکہ حتی الامکان وہاں کے ادباء وشعراء سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کے ادب کا سرسری ہی سہی کچھ مطالعہ بھی کیا۔ گرچہ اس بات کا براہ راست ان کے سفرنامے میں تذکرہ نہیں ہے لیکن درج ذیل چند جملوں سے اس امر واقع کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔''ہندوستانی ادبی شہ پاروں کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا ادبی سرمایہ اپنی گونا گوں خصوصیات کے باعث نہایت عمدہ اور ضخیم ہے اور عالمی ادبی منڈیوں کے متفق علیہ سربرآوردہ ادباء کی تخلیقات کی بنسبت زیادہ متنوع اور پر کیف و پرکشش بھی ہے۔''

اپنے سفر کے دوران ڈاکٹر نوال نے ایک عام سیاح کی طرح صرف تاریخی آثار و شواھد دیکھنے پر ھی اکتفا نھیں کیا بلکه یہاں کے مختلف ادیان کا مطالعه بھی کیا بالخصوص ھندو دھرم کی بنیادی کتاب 'گیتا' کو بنظر غائر پڑھا اور اس میں موجود علم نفس اور دور حاضر سے مطابقت رکھنے والی تعلیمات پراپنی حیرت کا اظھار بھی کیانیز ان مذاھب کی موجودہ عملی شکل کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر نوال نے ھندو، عیسائی، جینی، بودھ اور پارسی مذاھب کی متعدد عبادت گاھوں کی زیارت بھی کی۔

اس دور کی مشہور ادیبہ وشاعرہ امرتا پریتم سے بھی ڈاکٹر نوال نے ملاقات کی۔ امرتا نے اپنے گھر دعوت کے دوران ان کو اپنی کہانیوں کا مجموعہ عطیہ کیا جس کا ڈاکٹر نوال نے دوران سفر ہی مطالعہ کیا اور ان کے مطابق اس ادبی شہ پارہ سے اہل ہند سے متعلق بہت سے دینی اور سماجی حقائق ان پر منکشف ہوئے۔

ہندوستان جیسے کثیر الادیان ملک سے قریب لانے میں ادیان اور معاشرتی علوم سے ڈاکٹر نوال کی دلچسپی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اپنے سفر کے دوران ڈاکٹر نوال نے ایک عام سیاح کی طرح صرف تاریخی آثار و شواہد دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یہاں کے مختلف ادیان کا مطالعہ بھی کیا بالخصوص ہندو دھرم کی بنیادی کتاب 'گیتا' کو بنظر غائر پڑھا اور اس میں موجود علم نفس اور دور حاضر سے مطابقت رکھنے والی تعلیمات پر اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا۔ نیز ان مذاہب کی موجودہ عملی شکل کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر نوال نے ہندو، عیسائی، جینی، بودھ اور پارسی مذاہب کی متعدد عبادت گاہوں کی زیارت بھی کی۔

ایک جگہ لکھتی ہیں ''میں نے ممبئی شہر میں ایک ہی دن میں پانچ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہندو مذہب کا مندر، جینی اور بودھ مذاہب کی عبادت گاہیں، عیسائیوں کا گرجا گھر (چرچ) اور مسجد شامل تھے۔ ان پانچوں مختلف الادیان عبادت گاہوں کو دیکھ کر میں تب حیران رہ گئی جب میں نے محسوس کیا کہ ان کی اندرونی و بیرونی تعمیر میں حد درجہ مشابہت ہے یکساں ستون اور گنبدیں اور وہی عبادت کے لیے مخصوص ایک مقام..... یہی نہیں بلکہ مماثلت شاید اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اور وہ ہے اندرون معابد ان لوگوں کے لباس وحرکات میں گونا گوں مماثلت اور ان کے تعلق اور طرز برتاؤ میں مشابہت...''

ان اقوال کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک سفرنامہ نویس کی حیثیت سے ڈاکٹر نوال ایک کامیاب قلم کار ہیں جنھوں نے نہ صرف ہندوستان کو دیکھا بلکہ اپنے قارئین کو دکھایا بھی۔ اس سفر نامہ کی ورق گردانی کے دوران مصنفہ محض ایک عام سیاح نہیں بلکہ حقائق کی تلاش کنندہ کے طور پر بھی ابھرتی ہیں لہٰذا ہر چھوٹے بڑے معاملے میں انھوں نے اشیاء و واقعات کے ظواہر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے پس پردہ وجوہات اور اسباب پر بھی توجہ کی ہے اور اپنی عقل سے اس کی تعلیل و توجیہ کی بھی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ نیز اس سفرنامہ کے مطالعے سے اس بات کا بھی بخوبی احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نوال کی اپنی شخصیت خواہ کتنی ہی پیچیدہ اور متنازع فیہ کیوں نہ ہو ہندوستان کی مختلف و متنازع دینی حیثیت کو باریکی سے سمجھنے کے لیے انھوں نے بڑی جد و جہد اور سعی کی ہے۔ گرچہ سفرنامہ کے بین السطور ایک اضطراب بھی نظر آتا ہے جو شاید مصنفہ کی شخصیت کی تاثیر ہے۔ لیکن بحیثیت ادبی شہ پارہ و سفرنامہ یہ مصنفہ کی ایک کامیاب اور مقبول ومفید کوشش ہے جو ان کو دیگر سیاحوں اور سفرنامہ نویسوں میں ممتاز بناتی ہے کیونکہ ہندوستان آنے والے کچھ فیصد سیاح ہی ہندوستان کو اتنے قریب سے دیکھ پاتے ہیں جتنے قریب سے ڈاکٹر نوال نے دیکھا، زائرین کی اکثریت محض سیر وتفریح کی جگہوں یا زیادہ سے زیادہ تاریخی مقامات کا رخ کرتی ہے۔

منجملہ ہندوستان سے متعلق ڈاکٹر نوال کا یہ سفرنامہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو محققین، طلبہ اور سیاحین کے لیے بے حد اہم اور مفید معلومات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ انگریزی اور ڈچ زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

■

Dr. Zarnigar
Opp Kohinoor Pustak Sadan,
Shahabad Gate
Rampur - 244901 (UP)

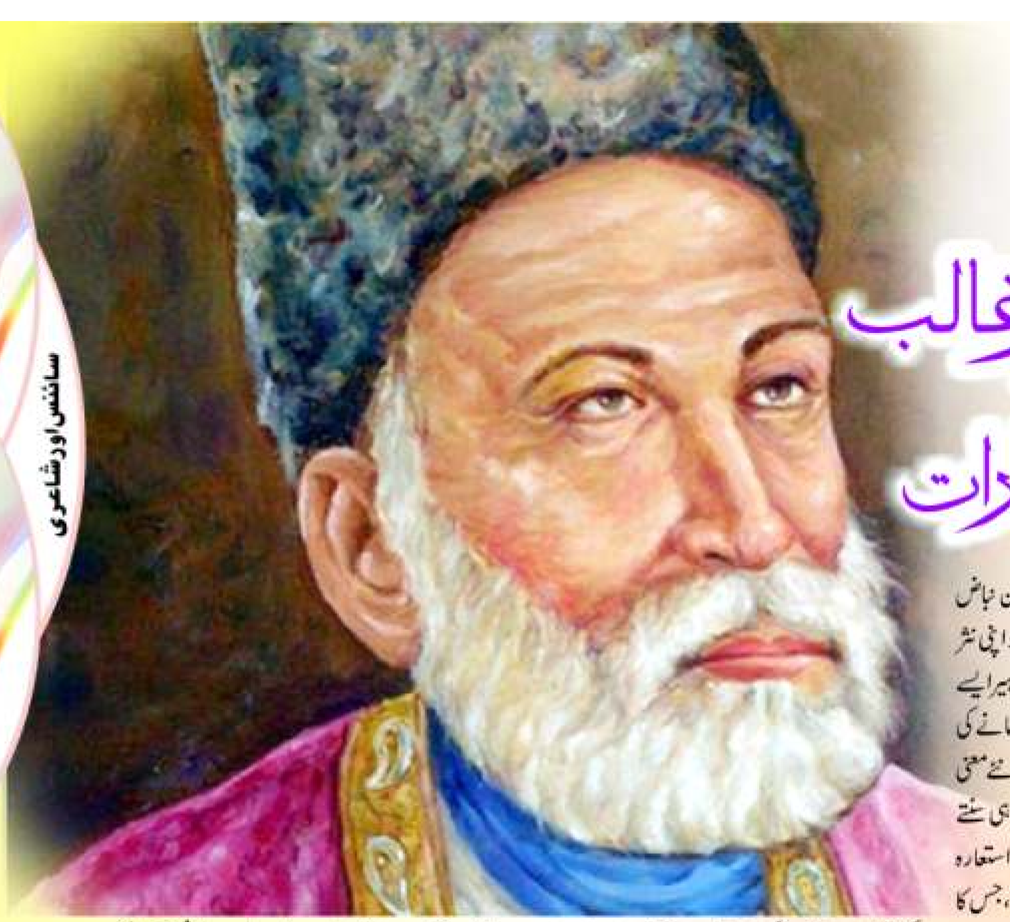

محمد اکمل خان

کلامِ غالب میں سائنسی اشارات

ہر ادب کا تخلیق کار اپنے زمانے کا بہترین نباض ہوتا ہے۔ وہ جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے ان کو اپنی نثر یا نظم میں پیش کرتا ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں چند مشاہیر ایسے بھی گزرے ہیں جن کی شاعری نہ صرف اپنے زمانے کی آئینہ دار ہے بلکہ ہر زمانے میں اس کے نئے نئے معنی دریافت ہوتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی سنتے آئے ہیں کہ غالب کی شاعری مشکل پسندی کا استعارہ ہے۔ خود غالب کو اپنی دشوار پسندی کا احساس تھا، جس کا اعتراف انھوں نے ایک رباعی میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اسی مشکل اور دشوار پسندی نے انھیں آفاقی اور عالمگیر شہرت عطا کی ہے۔ کلام غالب کے وہ اشعار جن کو عام طور پر ناقدین اور اساتذہ غالب کی مشکل پسندی کا نام دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں، حقیقت میں یہی مرزا غالب کو مستقبل کا شاعر بناتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مشکل اشعار ایسے ہیں جن میں گہرا فلسفہ یا کوئی سائنسی پہلو پوشیدہ ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے ادب کا رجحان سائنس کی طرف بڑھتا جائے گا، ویسے ویسے کلام غالب کے نئے نئے گوشوں کا انکشاف ہوتا جائے گا۔

غالب کے فلسفیانہ اور سائنسی اشعار کو سمجھنے کے لیے ان کے عہد کے علمی اور ادبی ماحول پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ غالب کی پیدائش سنہ 1796 میں ہوئی اور غالب نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔ اس وقت تک یعنی سنہ 1811 تک دہلی میں بہت سے مدارس کا قیام ہو چکا تھا جن میں سے ایک مدرسہ غازی الدین نام کا بھی تھا جو آگے چل کر دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالحق نے 'مرحوم دہلی کالج' میں لکھا ہے کہ کالج کے قیام کی منشا ہندوستانیوں کو اردو زبان کے ذریعے ادب اور سائنس کی تعلیم دینا ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کے زمانے میں سائنسی علوم کی جانب لوگوں کی توجہ اور دلچسپی بھی تھی اور اس کے تعلق سے لوگوں میں تجسس بھی تھا۔ لہٰذا مرزا غالب اور دلی کے لوگوں کے درمیاں یہ موضوعات زیر گفتگو رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایک اور دلیل ان کے زمانے کے سائنسی مزاج کی یہ ہے کہ غالب نے جن اشعار میں بھی سائنس اور فلسفے کو باندھا ہے اس میں زیادہ تر اشعار میں تخلص اسد اختیار کیا ہے جو ان کے ابتدائی اشعار کی دلیل بھی ہے۔

غالب کی فکر عام انسانی ذہن سے یقیناً بالاتر تھی۔ ان کی سوچ میں ایک سائنسداں کی گہرائی اور گیرائی تھی اور اشیاء کی حقیقت و ماہیت کے ادراک کا ذوق بھی تھا اور تجسس بھی۔ ان کے کلام میں اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے:

سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اس غزل کے دوسرے تمام اشعار میں بھی غالب کا تجسس ظاہر ہوتا ہے۔ غالب کی اشیاء کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی عادت تھی۔ وہ اپنی اس صفت سے بخوبی واقف تھے اور اسی بات کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

غالب ایک بیدار ذہن اور حساس دل و دماغ کے مالک تھے۔ روایتی علوم سے اپنی واقفیت کے سبب اپنے کلام کو علم فلکیات، علم طب، طبیعات، ریاضیات اور منطق و فلسفہ سے اپنے کلام کو مزین کیا۔ جب ہم غالب کے ہم عصر شعراء کو پڑھتے ہیں اور اس کے بعد غالب کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک شعر میں مختلف معنی دریافت ہوتے ہیں۔ غالب کے اشعار میں معنی کی تہہ داری ہے۔ جن پر نتائج اور حقائق کا پردہ پڑا ہے۔ اسلوب احمد انصاری 'نقش غالب' میں لکھتے ہیں:

"غالب کے لیے کائنات اور اس کے تمام مظاہر توانائی سے چھلک رہے ہیں۔ اشیاء عالم جامد اور ساکن نہیں بلکہ رواں اور مضطرب ہیں۔ غالب کے نزدیک تکوین کائنات کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا، اور چونکہ نمو اور تبدیلی فطرت کا قانون ہے، اس کے لیے اولین مادے کی مختلف ہیئتیں اور ترکیبیں ارتقاء کے ہر ہر مرحلے پر ابھرتی ہیں۔ غالب کا خیال تھا کہ اگر ذرّے کا دل چیر کر دیکھیں تو وہ حرکت و حیات سے لبریز نظر آئے گا۔"

اسلوب احمد انصاری نے غالب کے جس شعر کے حوالے سے بات کی ہے، وہ غالباً یہی شعر ہے:

بے پردہ سوئے وادی مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس شعر کی تشریح میں بتایا ہے کہ لیلیٰ کا اپنا چہرہ کھول کر وادی مجنوں میں جانا مناسب

نہیں ہے کیوں کہ اس وادی کے ہر ذرے میں مجنوں کے دل کی بیتابی پوشیدہ ہے جب وہ اسے دیکھیں گے تو اور زیادہ بیتاب ہو جائیں گے۔ لیکن غالب کے اس شعر کو اگر سائنسی عینک سے دیکھا جائے تو اس کے معنی کے پیچھے ایک کیمیائی عمل دریافت ہوتا ہے۔

ہوا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی کیمیائی خاکہ نہیں ہے۔ اسی طرح ذرات کا بھی کوئی کیمیائی خاکہ (Chemical Structure) نہیں ہوتا۔ یہ ذرات مختلف معدنیات کا مرکب ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اس کو silicon dioxide یا SiO2 کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ سیلکان اور آکسیجن کا مرکب ہے اور آکسیجن (Oxygen) زندگی کی علامت ہے اور دل کی بیقراری (یعنی دھڑکن) بھی زندگی کی علامت ہے۔ اس طرح غالب نے ذرات کے سینے میں دھڑکنے والے دل کا ایک سائنسی پہلو پیش کیا ہے۔ غالب کا یہ شعر ان کے اظہار خیال کو بڑا سائنسی بناتا ہے اور اردو شاعری کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔

غالب کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر جگہ جگہ سائنسی تجربات سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات ہم اس کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ذہن اس کی طرف منتقل ہوتا ہے ورنہ ہم اس کے عام معنی کو سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہم سب اپنی زندگی میں ایک سفر پر ہیں جس کی منزل آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ سائنس میں نسبتی حرکت (Relative Movement) یا نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نظریۂ اضافیت کی رو سے جب ہم حرکت میں ہوتے ہیں تو ہمیں اپنے آس پاس کی چیزیں بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ہم ریل گاڑی میں سفر کرتے ہیں تو ہمیں پلیٹ فارم بھاگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کار کی حرکت سڑک کے کنارے لگے ہوئے پیڑوں سے نمایاں ہوتی ہے لیکن اگر اسی رفتار سے کوئی کار ہمارے پاس سے گزرتی ہے تو برابر رفتار کی وجہ سے ہمیں ساکت دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے ایک شعر میں کہا ہے:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ جیسے جیسے وہ منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اسی رفتار سے بیاباں پیچھے کی طرف بھاگ رہا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایک لفظ کو سائنسی طریقے سے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیاباں کے بھاگنے کی رفتار ان کی رفتار کے عین مطابق ہے۔ اس شعر میں غالب نے اشارے میں اس بات کا بھی سبق دیا ہے کہ اگر ہم اپنے مقصد کی طرف لگاتار بھاگتے رہیں تو پریشانیاں اور مشکلیں خود ہی دور بھاگ جائیں گی۔ یہاں اس باریکی کا خیال رکھا گیا ہے کہ بیاباں کے بھاگنے کی رفتار وہی ہے جو غالب کی ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کے متناسب (Proportional) ہیں۔ یہی آئنسٹائن (Einstien) کے نظریۂ اضافیت کا اصول ہے۔

آئنسٹائن نے اپنے نظریۂ اضافیت میں یہ بھی بتایا کہ مادہ فنا ہوسکتا ہے۔ اگر مادہ (Mass) روشنی کی رفتار (Speed of Light) سے سفر کرے تو وہ قوت (Energy) میں تبدیل ہو جائے گا۔ آئنسٹائن کا یہ آفاقی نظریہ E=mc^2 کے نام سے مشہور ہے۔ جب ہم کلام غالب میں مادہ اور توانائی سے متعلق اشعار تلاش کرتے ہیں تو بہت سے اشعار مل جاتے ہیں لیکن ان میں ایک غالب کا درج ذیل شعر سب سے زیادہ مشہور ہوا:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اس شعر کی سائنسی تشریح میں جن لوگوں نے آئنسٹائن کے مذکورہ بالا نظریے کو بنیاد بنایا ہے وہ اس علمی حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ غالب کا انتقال سنہ 1869 میں ہوا اور آئنسٹائن کی پیدائش غالب کے انتقال کے دس سال بعد مارچ 1879 کو ہوئی اور اس نے اضافیت کا نظریہ 1916 میں پیش کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس شعر کی سائنسی تشریح کرنے میں اگلے لوگوں نے عجلت سے کام لیا ہے۔ درحقیقت آئنسٹائن سے پہلے بیسویں صدی کے آغاز تک بڑے بڑے سائنسداں، مفکر اور فلسفی یہی کہتے رہے کہ مادہ ایک ایسی شے ہے جسے نہ پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تباہ کیا جاسکتا ہے۔ مادہ بے شک اپنی شکل تبدیل کرسکتا ہے۔ جسے قانون بقائے مادہ (Law of Conservation of Mass) کا نام دیا گیا۔

غالب نے اس سائنسی کلیہ کو اپنے شعر کی بنیاد بناتے ہوئے کہا ہے کہ جو مادہ انسان کی شکل میں تھا، مرنے کے بعد پھر لالۂ وگل کی شکل میں نمایاں ہوگیا ہے۔ ان کے جسم کا مادہ کہیں پھول بن کر باہر نکلتا ہے تو کہیں لالہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے یعنی مادہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی شکل (Form) تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ سلسلہ (Cycle) روز ازل سے چل رہا ہے اور قیامت تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

خلا ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی حیرت انگیز دنیا ہے۔ اس میں لاتعداد نامعلوم سیارے اور ستارے ہیں۔ یہ ہماری زمین سے اس قدر دور ہیں کہ ان کے فاصلوں کو کروڑوں نوری سالوں کے ذریعے دیکھا جاتا ہے۔ سورج کے مقابلے زمین سے زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے یہ ہمیں دن میں دکھائی نہیں دیتے۔ رات کو جب ہم ان ستاروں کو دیکھتے ہیں تو وہ بہت چھوٹے معلوم ہوتے ہیں جبکہ ان میں چند سورج سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

غالب کہتے ہیں کہ یہ ستارے ہمیں اپنی اصل صورت میں نظر نہیں آرہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کے وقت آسمان میں ستارے ہمیں جلتے بجھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیوں کہ ان کی جسامت پھیلتی اور سکڑتی رہتی ہے۔ ان کو Cepheids Variables بھی کہتے ہیں۔ زمین سے ان کا فاصلہ تقریباً ایک کروڑ نوری سال (Light Year) کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ایک نوری سال کا مطلب ایک سال میں روشنی کی رفتار (3*10^8m/sec) ہے جو کہ تقریباً 9.4607*10^12 کلومیٹر یا چھ ٹریلین میل کے برابر ہوتا ہے۔ جبکہ زمین سے سورج کی مسافت محض 149.6 ملین کلومیٹر ہی ہے۔ اس لیے ہمیں یہ ستارے اپنی اصلی صورت میں دکھائی نہیں دیتے۔ غالب نے اپنے شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ستارے جو کچھ اصل صورت میں ہیں وہ ہمیں طویل مسافت کے سبب نظر نہیں آتے۔ اس شعر کے حوالے سے غالب کا علم فلکیات کا شعور قابل تحسین ہے۔

غالب کے کلام میں علم فلکیات سے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔ انھوں نے کائنات کا مشاہدہ بہت گہرائی سے کیا تھا۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ تاروں کے دن میں دکھائی نہ دینے کے سبب کو ایک شعر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

تھیں بنات النعش گردوں، دن کے پردے میں نہاں
شب کو اس کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

تاروں کا دن کے پردے میں چھپنا اور رات کو دکھائی دینا ایک فطری عمل ہے۔ ستارے دن میں بھی نکلتے ہیں لیکن روشنی کے نظریۂ اضافیت (Relative Intensity of Light) کی وجہ سے سورج کی روشنی میں دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ آفتاب کے مقابلے طویل مسافت اور سورج کی چمک کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے اور سورج غروب ہوتے ہی دکھائی دینے لگتے ہیں۔

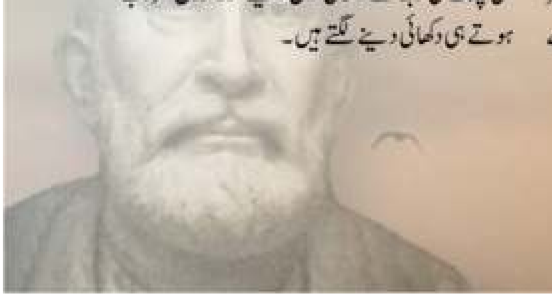

غالب نے اس شعر میں ان سات ستاروں (بنات النعش) کی طرف اشارہ کیا ہے جنھیں 'سات سہیلیوں کا جھمکا' بھی کہا جاتا ہے۔اردو میں انھیں ثریا (Pleiades) اور فارسی میں پروین کہتے ہیں ۔یہ ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے۔قدیم ماہر فلکیات ٹالمی (Ptolemy) نے ان کی تعداد 48 بتائی تھی لیکن جدید تحقیقات کے مطابق ثریا کا یہ جھرمٹ دو ہزار چھوٹے ستاروں پر مشتمل ہے لیکن ان میں سات ستارے ایسے ہیں جن کو بغیر کسی آلے کی مدد کے دیکھا جاسکتا ہے۔ستاروں کا یہ جھرمٹ زمین سے سب سے قریب ترین ستاروں میں سے ہے۔زمین سے ان کی مسافت 400 سے 500 نوری سال کی ہے اور مرکزی مقام سے نصف قطر (Radius) 8 نوری سال ہے۔غالب نے ان ستاروں کے دن میں دکھائی نہ دینے کے عمل کو حسن تعلیل کا پیکر عطا کیا ہے۔

انسان اپنی زندگی میں تین ادوار بچپن، جوانی اور بڑھاپے سے گزرتا ہے۔جو تحریک بچپن میں ہوتی ہے وہ جوانی میں برقرار نہیں رہتی اور جوانی کی توانائی بڑھاپے میں کام نہیں آتی۔جیسے جیسے انسان بوڑھا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کے جسم کا ڈھانچہ بھی کمزور ہوتا جاتا ہے۔یہ ایک فطری عمل ہے۔جس کو غالب نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے:

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

اس شعر کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے میں ناتوانی کی وجہ سے بدن میں تناؤ (Contraction) پیدا ہو گیا ہے اور اس کی لچک (Flexibility) ختم ہو گئی ہے اس لیے جھک نہیں سکتا اور کمزوری کا مظاہرہ بھی نہیں ہو سکتا۔اس شعر کو اگر سائنسی زاویے سے دیکھا جائے تو اس میں ایک طبی عمل کارفرما ہے۔

Nucleus Pulposus ریڑھ کی ہڈی (Vertebral disc) کا اندرونی حصہ ہے۔اس میں اندرونی حصے میں لسلسا مائع بھرا ہوتا ہے جو زیادہ تر پانی سے بنا ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اعضا کو جوڑے رکھنے اور قوت دینے کے لیے کولجن فائبر (Collagen Fibre) بھی ہوتا ہے۔عمر کے ساتھ ساتھ جسم کا یہ Disc پانی کی کمی کی وجہ سے سوکھنے لگتا ہے اور دباؤ میں پریشانی پیدا کرتا ہے۔ریڑھ کی ہڈی کمزور ہو جاتی ہے اور عصبی نظام متاثر ہو جاتا ہے اور انسان جھکنے میں پریشانی محسوس کرنے لگتا ہے۔اس شعر میں غالب نے لفظ 'گنجائش' (Capacity) کے استعمال سے شعر میں مزید معنویت پیدا کردی ہے۔

کلام غالب میں علم طب (Medical Science) سے متعلق ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔

انسان کی زندگی میں سائنس کا عمل دخل کئی طرح سے ہوتا ہے۔وہ ہمارے روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہوتی ہے لیکن ہمیں پتہ نہیں چلتا حتی کہ ہم ان اصول کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔علم طبیعات کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔سر آئزک نیوٹن (Sir Isaac Newton) ایک ماہر طبیعات تھے۔لاطینی زبان میں ان کی کتاب ''قدرتی فلسفہ کے حسابی اصول'' (Philosophiæ Naturalis Principia Mathematica) سائنس کی تاریخ کی ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔سنہ 1687 میں شائع ہونے والی اس کتاب میں نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون (Law of Gravitation) اور تین قانون حرکت (Three Laws of Motion) کو پیش کیا۔

حرکت کے تین قوانین میں سے پہلا قانون یہ ہے کہ کسی بھی چیز پر جب تک کوئی باہری قوت کام نہیں کرتی، اس وقت تک وہ حرکت یا سکون کی حالت میں رہتی ہے۔ جیسے زمین پر رکھی ایک شے اس وقت تک حرکت میں نہیں آتی جب تک اس پر بیرونی طاقت نہ لگائی جائے اور اگر وہ حرکت میں ہے تب بھی اس کو روکنے کے لیے بیرونی طاقت کی ضرورت پڑے گی۔اس کو $v=u+at$ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، جہاں v سے مراد Velocity یعنی حرکت، u یعنی Unbalanced force جو کہ کسی ساکت چیز کو حرکت میں لانے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ a کشش ثقل ہے جس کو یہاں Acceleration کہا گیا ہے اور t سے مراد time ہے۔

واضح ہے کہ جب تک کسی ساکت یا متحرک شے پر Force لگا کر اسے دھکا (Accelerate) نہ دیا جائے تب تک اس میں حرکت (Velocity) نہیں پیدا ہوگی اور اگر وہ حرکت میں ہے تو وہ اس وقت تک اسی حالت میں رہے گی جب تک کوئی باہری طاقت اس کو حالت سکون میں نہ کردے۔خواہ وہ شے چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی ہو۔غالب نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اس شعر میں غالب نے آسمان کی گردش کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ آسمان ہمیشہ گردش میں ہیں اس لیے ایک نہ ایک دن ان سے کوئی نہ کوئی حادثہ یا تبدیلی ضرور ہوگی لیکن جب تک آسمان کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی یعنی جب تک ان پر کوئی باہری قوت نہیں لگائی جاتی وہ حرکت میں رہیں گے اور تب تک وہ ایسے ہی گردش کرتے رہیں گے۔

غالب نے اپنے ایک شعر میں نیوٹن کے تیسرے قانون حرکت ($V^2=u^2+2as$) کو بھی پیش کیا ہے۔ حرکت کا تیسرا قانون عمل اور رد عمل کا ہے۔یعنی جب ہم کسی شے پر طاقت لگاتے ہیں تو وہ شے بھی ہم پر برابر کی طاقت لگاتی ہے۔نیوٹن کا حرکت کا یہ قانون ہماری زندگی کے ہر شعبے میں کام آتا ہے خواہ ہوائی جہاز کے اڑنے کا عمل ہو، یا زمین پر پیدل چلنے کا یا پھر تیرنے کا۔ان سبھی حالتوں میں ہمارے اوپر ایک منفی (Opposite) قوت کام کرتی ہے جس سے چیزیں آگے کی طرف بڑھتی ہیں۔غالب نے ایک شعر میں کہا ہے:

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

شعر کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ میرے دل کی کشش کی شکایت مت کرو اور دیکھو کہ ہم دونوں کے درمیان یہ کشاکش کیوں پیدا ہوگئی ہے۔اگر تم اپنے آپ کو اتنا نہ کھینچو تو یہ کشاکش پیدا ہی کیوں ہو؟

شعر میں غالب نے نیوٹن کے مذکورہ بالا اصول کو پیش کیا ہے لیکن یہاں قوت متضاد سمت (Opposite Direction) میں عمل کر رہی ہے۔لہٰذا ایک دوسرے کے کھینچنے کی وجہ سے کشاکش (Stress) پیدا ہوگئی ہے۔یہی نیوٹن کا تیسرا قانون حرکت ہے۔ "to every action there is an equal and opposite reaction"

ان اشعار کے علاوہ غالب کے دیوان میں سیکڑوں شعر علم فلکیات اور علم طبیعات وغیرہ سے متعلق ہیں لیکن جیسے جیسے سائنس اور تکنیک کی دنیا میں ترقی ہوتی جائے گی ویسے ویسے ان اشعار کی معنویت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔اس تعلق سے آفتاب احمد کے الفاظ اہمیت کے حامل ہیں۔جو انھوں نے 'قومی زبان' کے غالبیات پر منعقد مذاکرہ میں صدارت کرتے ہوئے کہے تھے:

''یہ ضروری نہیں کہ بیسویں صدی کے تنقیدی شعور نے ان کو پورے طور پر پہچان لیا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں کوئی اور مضمون پیدا ہو، کوئی اور کیفیتیں مزاج کی رونما ہوں تو اس کے بعد غالب کے اسی مختصر سے دیوان میں سے بہت کچھ اور نکلے۔''

Mohd Akmal Khan
Flat No. 301, Skl Apartment
Surya Nagar Colony, Toli Chowki
Hyderabad - 500008 (Telangana)

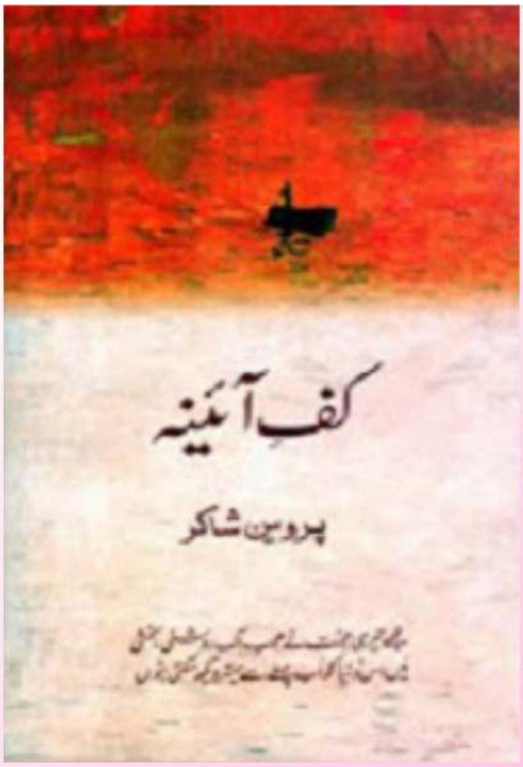

پروین شاکر کی شاعری میں سائنسی اصطلاحات

عظیم اللہ ہاشمی

آزادی کے بعد ادبی اُفق پر پروین شاکر کے مقدر کا ستارہ نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی دودھیا روشنی بکھیر کر ایک عہد کو متحیر کر دیا۔ اس دودھیا روشنی کی میٹھی میٹھی چھاؤں میں صنفِ نازک کے جذبات کی رنگا رنگی قوس قزح کی مانند بکھری ہے، جس کے ست رنگی جلو میں دل سوز تجربات، تلخ اور شیریں محسوسات نیز دل آشفتگی کے لطیف محسوسات نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں مٹّی کی مہک سانس کی خوشبو میں اُتر کر بھیگے ہوئے سبزے کی ترائی میں بلاتی ہے جہاں وصل کی خوشیاں کم اور فراق کی آہیں زیادہ سنائی دیتی ہیں۔ یہ آہ جب شدّت کے اوجِ ثریا پر پہنچتی ہے اس وقت یہ ناگن کی پھنکار نہیں بلکہ جوگن کی چاہت بن جاتی ہے جو اپنے ہاتھوں سے جس کی ہتھیلیوں پر رنگِ حنا کی رمق ابھی باقی ہے، اپنے بے وفا محبوب کے لیے دُلہن سجانے کی آرزو کرتی ہے خصوصاً خوشبو کے اوراق پر نوخیز لڑکیوں کی اُمنگیں اور عشقیہ جذبات کی فراوانی قاری کے دامن دل کو اپنی پوری توانائی کے ساتھ گرفت میں لیتی ہے۔ یہی دل گرفتگی پروین شاکر کی شاعری کے سر پر قبولیت اور مقبولیت کا تاج رکھتی ہے۔ لہٰذا پروین کی شاعری میں بیتی باتوں کی یاد زلیخا کی طرح پیچھے سے دامن گیر ہوتی ہے۔ بیشک ایسی یادوں کی پروائی میں ایک چبھن اور کڑواہٹ ہوتی ہے لیکن پروین شاکر کے یہاں یہ کڑواہٹ ان کی شخصیت کے عناصر سے رُل مل کر آتم منتھن کے بعد امرت بن جاتی ہے، جس میں ایک منفرد لذت کا احساس ہوتا ہے۔

ادا جعفری نے جس پیکر کو نوکِ قلم سے تراشا ہے اس کے کنجِ مژگاں میں کچھ ان کہے الفاظ باقی رہ گئے ہیں۔ ساجدہ زیدی کے درِ دل پر دل کی دھڑکن تیز سنائی دیتی ہے۔ زاہدہ زیدی کے دل میں ادھورے سفر کی یاد تازہ رہتی ہے جو کب چھلک جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ حسینہ سرور کے بند کیواڑوں پر بھی پیہم دستک ہوتی ہے جبکہ پروین کے یہاں یہ دروازے مقفّل ہو گئے ہیں۔ اس لیے پروین شاکر کا جمالیاتی شعور دل کے آتش دان میں آنچ کی تپش کو کچھ زیادہ محسوس کرتا ہے۔ فیض احمد فیض، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور پروین شاکر ایک ہی صدی کے شاعر ہیں۔ احمد فراز اس دن کے منتظر رہے جب صلیب گر صلیب پر ہو۔ ناصر کاظمی نے شہر کی بے رعنائی پر کفِ افسوس ملا۔ احمد ندیم قاسمی اُجالے کی تلاش میں رات کے بھیگنے کے منتظر رہے اور فیض مظلوموں کے لیے انصاف طلب کرتے رہے۔ اس ماحول میں پروین شاکر نے دل اور صرف دل کی باتیں زیادہ کیں ایسا اس لیے کہ دل ہی وہ مرکز ہے جس کے اندر دُنیا کے تمام مسائل کو حل کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کے فانوس میں انسانی مسائل کے چراغ بھی جلتے ہیں جس کے اُجالے میں موصوفہ کی شاعری میں مزاحمتی پہلو نیز جذبات سے عاری خیال کے جلو بھی دِکھائی دیتے ہیں جو قاری کے ذِہن و خیال پر مانند بجلی کوندتے ہیں۔ لیکن زیرِ نظر مضمون اپنی نوعیت سے انفرادیت کا حامل اس لیے ہے کہ اب تک پروین شاکر کے حوالے سے جو بھی مضامین رقم کیے گئے ان میں اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی گئی کہ انھوں نے اپنی شاعری میں سائنسی اصطلاح کا بھی

استعمال کیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں قاری کی آنکھوں سے اوجھل اس گوشے کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہانِ ادب میں پروین شاکر کے چارشعری مجموعے 'خوشبو'، 'صد برگ'، 'انکار' اور 'خودکلامی' منظر عام پر آئے۔ انگریزی ادب میں موصوفہ نے پوسٹ گریجویٹ تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے 'خودکلامی' میں سائنسی اصطلاحات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل نظم 'چین ری ایکشن' کے عنوان پر جب نظر مرکوز ہوتی ہے تو سب سے پہلے ذہن کے پردے پر فزکس کا ایٹومک ماڈل گردش کرنے لگتا ہے جہاں ایک ایٹم الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون تین ذروں سے ملکر بنا ہوتا ہے۔ ایٹم کے مرکز میں ایک نیوکلیس ہوتا ہے۔ جس کے اندر پروٹون اور نیوٹرون جبکہ مدار پر الیکٹرون نیوکلیس کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ الیکٹرون پر منفی، پروٹون پر مثبت اور نیوٹرون پر کوئی چارج نہیں ہوتا ہے۔ ایٹم بم بنانے کی تھیوری یہیں سے حاصل کی گئی تھی، جس کے مطابق بیرون سے تابکاری لہریں پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل نیوکلیس پر پھینکی جاتی ہیں۔ نتیجتاً تابکاری لہروں اور نیوکلیس کے تصادم سے نیوکلیس ٹوٹتا ہے۔ اس عمل کو نیوکلیر فیشن کہتے ہیں جس کے دوران کثیر مقدار میں توانائی خارج ہوتی ہے۔ اس عمل کے دوران جو تابکاری لہریں خارج ہوتی ہیں وہ انتہائی خطرناک ہوتی ہیں جو نسل آدم اور کائنات کے ہر شے پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ تابکاری لہروں اور نیوکلیس کے تصادم کے دوران کم وبیش چھ ہزار کیلوواٹ حرارت خارج ہوتی ہے جس کی حدت اس قدر ہوتی ہے کہ اردگرد کی تمام چیزیں جل کر راکھ ہوجاتی ہیں۔ اردو شاعری کے کینوس پر اپنے خیال کو ادب کے پیمانے میں ڈھالنے کے دوران اس میں شدت پیدا کرنے کے لیے پروین شاکر 'پروٹون' اور 'تابکاری لہروں' کا استعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کرتی ہیں:

(1) سوعافیت اسی میں ہے
کہ ہم اندھیرے میں رہیں
اور اپنے اپنے نیوٹرونز سے
تعلقات ٹھیک رکھیں
تابکار نفرتوں کی زد میں ایک بار آگئے
تو پھر محبتوں کا اختیار ختم سمجھو۔!!

(چین ری ایکشن) 'خودکلامی'

بایولوجی سائنس کا وہ شعبہ ہے جس میں جانداروں کے بارے میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سائنس کے اسی شعبے میں خون اور اس کے اقسام کی تعلیم دی جاتی ہے۔ خون

جہانِ ادب میں پروین شاکر کے چارشعری مجموعے 'خوشبو'، 'صد برگ'، 'انکار' اور 'خودکلامی' منظر عام پر آئے۔ انگریزی ادب میں موصوفہ نے پوسٹ گریجویٹ تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے 'خودکلامی' میں سائنسی اصطلاحات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔

انسانی جسم کی ایک قیمتی شے ہے، جس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ اس کے چار گروپ ہوتے ہیں۔ گروپ A، گروپ B، گروپ AB اور گروپ O۔ خون کے O گروپ رکھنے والے انسان میں کسی بھی گروپ کے خون کو داخل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس گروپ کے خون کو ہر گروپ کے خون رکھنے والے انسان کو دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس گروپ کو یونیورسل ڈونر بھی کہتے ہیں۔ گروپ O دو طرح کے ہوتے ہیں۔ O منفی اور O مثبت۔ ان دونوں میں O منفی بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ آیئے دیکھئے پروین شاکر اپنی شاعری کے قرطاس پر بایولوجیکل سائنس کی اس اصطلاح کا استعمال کس طرح کرتی ہیں۔

جان!
تمھیں شاید نہ خبر ہو
بعض محبتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
'او۔منفی' ہوتی ہیں!

'مجبوری کی ایک بات' (خودکلامی)

ایکوسسٹم بایولوجیکل سائنس کا ایک اہم باب ہے۔ اس باب کے مطابق ایکوسسٹم جاندار اور غیر جاندار دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں جاندار اجزاء تین حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پہلا پروڈیوسر، دوسرا کنزیومر اور تیسرا ڈی کمپوزر۔ ایکوسسٹم میں پروڈیوسر (سبز پیڑ پودے) سورج کی توانائی ماحول کے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کی مدد سے نوری ترکیب کا عمل انجام دیتے ہیں جس کے دوران کاربوہائیڈریٹ تیار ہوتا ہے جس میں شمسی توانائی کیمیائی توانائی کی شکل میں محفوظ ہوجاتی ہے۔ کنزیومر اس کاربوہائیڈریٹ کو بطور غذا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح شمسی توانائی ان کے جسم میں منتقل ہوتی ہے۔ کنزیومر تین طرح کے ہوتے ہیں۔ پرائمری کنزیومر (کبوتر، خرگوش)، سیکنڈری کنزیومر (کتا)، اور ٹرسیری کنزیومر (شیر، بھیڑیا)۔ ایکوسسٹم میں سب سے پہلے پرائمری کنزیومر پرڈیوسر کو کھاتے ہیں۔ اس کے بعد سیکنڈری کنزیومر پرائمری کنزیومر کو پھر سیکنڈری کنزیومر ٹرسیری کنزیوم کو بطور غذا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ایکوسسٹم میں ایک غذائی زنجیر کی تشکیل ہوتی ہے اور یکے کے بعد دیگرے توانائی منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جس سے ایکوسسٹم متوازن رہتا ہے۔ سائنس کے اس خشک موضوع کو پروین شاکر اپنی فنکاری سے اردو شاعری کا ایک حصہ بنادیتی ہیں:

تو قرب و دور سے
چمگادڑیں آتی ہیں
اور گرتی چھتوں کو تھام لیتی ہیں
کبوتر منہ میں دابے کوئی بلی
اور اس کو سونگھتا کتا
کوئی سہما ہوا خرگوش
اور خرگوش کے پیچھے لپکتا ہوا بھیڑیا
اور بھیڑیے کی پشت پر اک شیر
اور پھر شیر کے پیچھے کوئی پیاسا شکار

(نظم دائرہ) خودکلامی

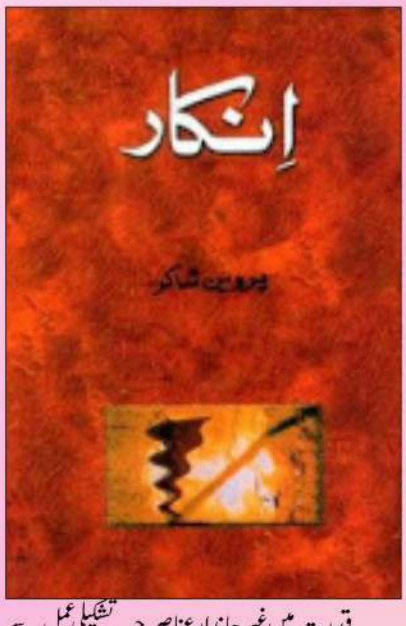

قدرت میں غیر جاندار عناصر جب تشکیلی عمل سے گزرتے ہیں تب جاکر کے ایک جاندار کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس کائنات میں مختلف قسم کے قدرتی اور مصنوعی واقعات وحادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جس کی زد میں آکر روئے زمیں کے ان جانداروں کے جسم فنا ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس عمل کے

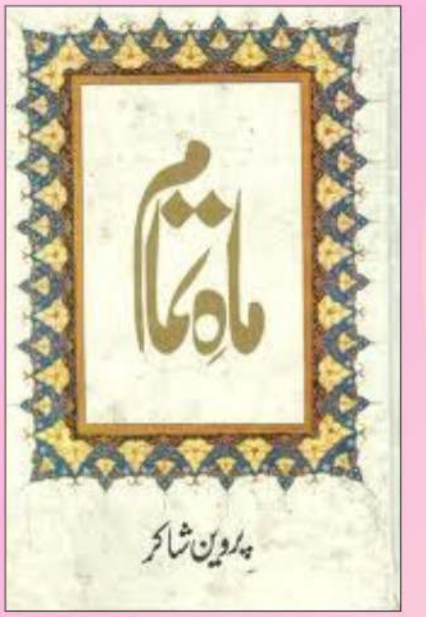

دوران جانداروں کے ایک پورے طبقے کا ہی صفایا ہوجاتا ہے اوراس کائنات سے ان کے وجود کا نہ صرف خاتمہ ہوجاتا ہے بلکہ ان کے جسم کے تشکیلی عناصر منتشر ہوکر آزاد غیر جاندار عناصر میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔لہٰذا وہ جاندار جن کا وجود اب اس دنیا میں نہیں ہے بلکہ صرف ان کے باقیات رہ گئے ہیں۔ ایسے جانداروں کو بایو سائنس کی اصطلاح میں 'مِسنگ لنک' کہا جاتا ہے۔ جیسے آرکیو پٹیرس۔ پروین شاکر نے سائنس کی اس تفہیم کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے اور اپنی ایک نظم کا عنوان اس سائنسی اصطلاح کو بنایا ہے:

سارے عناصر
اپنی پہلے سے تعین کردہ ہیئت میں
کہیں سے جمع ہوتے ہیں
پھراس کے بعد بے حد خامشی سے
واپسی کے طے شدہ رستوں پہ اک دن چل نکلتے ہیں
ازل سے زندگی کا دائرہ
یونہی سفر میں ہے...!

'دی مِسنگ لِنک' (خودکلامی)

پھول کے زردانے کو ایک پھول سے نکل کر دوسرے پھول کے اسٹگما پر پہنچنے کے عمل کو زیرگی کا عمل کہتے ہیں۔اس عمل میں ہوا، پانی اور دوسرے قدرتی ذرائع کے علاوہ کیڑے مکوڑے بھنورے، تتلی، مکھی، شہد کی مکھی وغیرہ بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ بھنورے، تتلیاں، شہد کی مکھیاں جب ایک پھول پر بیٹھتی ہیں اس وقت زر دانے ان کے پیروں میں چپک جاتے ہیں۔ جب یہ اڑ کر کسی دوسرے مادہ پھول پر بیٹھتی ہیں اس وقت ان کے پیروں سے چپکے زردانے اس مادہ پھول کے اسٹگما پر پہنچتے ہیں اور زیرگی کا عمل انجام پاتا ہے۔اس عمل کے بعد زرخیزی کا عمل شروع ہوتا ہے اور پھل کی تشکیل ہوتی ہے۔ بایولوجیکل سائنس کے اس Phenomenon کو پروین شاکر نے اپنی شاعری کے پیمانے میں اس طرح ڈھالا ہے ملاحظہ فرمائیں:

اگر گُل قند خود ہی شہد کی سب مکھیوں کے گھر پہنچ جائے
تو ان کو گُل بہ گُل آوارہ گردی کی ہے حاجت کیا
ہوا کی چال بھی کچھ نامناسب ہوتی جاتی تھی
سو تتلی اور مکھّی اور ہوا
نامحرموں سے دور رکھی جارہی ہیں
مگر یہ بھی کوئی سوچے
کہ پھر پھولوں کا کیا ہوگا
چمن میں ایسے کتنے پھول ہوں گے
کہ جو خود وصل اور خود بارآور ہوں

'پھولوں کا کیا ہوگا' (خودکلامی)

بایولوجیکل سائنس کے مطابق پیڑ پودے کی نشو ونما کے لیے پانی، مٹی اور معتدل موسم بہت ضروری ہیں۔ان کے بغیر ان کی نشو ونما ناممکن ہے۔سائنس کی اس حقیقت کو پروین شاکر نے اپنی شاعری کا حصہ اس طرح بنایا ہے:

پانی دیکھا، نہ زمیں دیکھی، نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

(خودکلامی)

جیومیٹری کی کچھ اصطلاحات کو بھی انھوں نے اپنی شاعری کے پیمانے میں ڈھالا ہے۔قوس ایک دائرہ کے قطع کو کہتے ہیں۔ایک نقطہ کے چاروں طرف یکساں دوری پر کھینچی گئی لکیر کو دائرہ کہتے ہیں۔اور پرکار اس اوزار کو کہتے ہیں جس سے دائرہ کھینچا جاتا ہے۔علم الحساب کی ان اصطلاحوں کو انھوں نے کس طرح خوبصورتی کے ساتھ شعر میں موزوں کیا ہے:

یا قوس رکھے یا وہ ہمیں دائرہ کردے
نقطے کی طرح ہیں کسی پرکار کے آگے

(خودکلامی)

ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے روشنی کے ذریعے طے کی گئی دوری کو نوری سال کہتے ہیں۔ایک خط مستقیم پر آواز کی لہریں انگریزی کے حرف S کی طرح سفر کرتی ہیں۔ایک مکمل آواز کی لہر کی درمیانی دوری کو ویولینتھ کہتے ہیں۔سائنس کی یہ دونوں اصطلاح فزکس کی ہیں۔سائنس کی ان خشک اصطلاحوں کو پروین شاکر ادب کی چاشنی میں ڈبوتی ہیں اور قاری کی جمالیاتی حس کو تسکین پہنچتی ہے:

میں اپنے سورج سے
ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر ہوں
کائنات کی بے اندازہ وسعت میں
اِک اور ہی بولی بولتے ہیں
وہ ویولینتھ
جس پر میرا اوران کا رابطہ قائم تھا

(خودکلامی)

فزکس میں فریکونسی کی اصطلاح آواز کے باب میں کی جاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ کسی لرزش کرنے والی شے کے ذریعے ایک سیکنڈ میں طے کی گئی دوری کو فریکونسی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ زلزلہ، روشنی، کیمسٹری جیسی سائنسی اصطلاحات کا بھی انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے:

(1) جب خود میں سکڑتے سکڑتے
میں اپنے آپ سے باتیں کرنے والی
رابطہ رکھنے والی
فریکونسی بھی بھلا دوں
اور اِس دن
مے ڈے، مے ڈے کرتی رہ جاؤں!

(خودکلامی)

(2) میں فقط چلتی رہی منزل کو سر اس نے کیا
ساتھ میرے روشنی بن کر سفر اس نے کیا

(خودکلامی)

(3) فشار جاں کے بہت ہیں اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمیں نہیں آتا

(خودکلامی)

(4) لیکن میری کیمسٹری میں
ایسا کوئی طلسم نہیں ہے
جو میری تقدیر کو جھلمل کردے
میری مانگ میں اس کے نام کی افشاں بھردے!

ایک تنہا سیارہ' (خودکلامی)

المختصر سائنس کی اصطلاحات کی مدد سے قرطاس ادب پر نسائی جذبات کی ترجمانی بازیچۂ اطفال نہیں بلکہ اورنگِ سلیمانی ہے جن کو پروین شاکر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔!!

■

Dr. Azeemullah Hashmi
H.No.: 1/A, BL.No: 23, Kela Bagan,
Jagatdal, North - 24 Parganas (WB)

رضوانہ پروین

الیاس احمد گدی کا افسانوی افق

اُردو فکشن نگاروں میں الیاس احمد گدی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ موصوف کی شہرت کا ضامن ان کا مایۂ ناز ناول 'فائر ایریا' (1994) ہے۔ اس ناول پر انھیں 1997 میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ ان کا تعلق جھریا ضلع دھنباد (بہار) موجودہ جھارکھنڈ کے ایک گدی خاندان سے تھا۔ وہیں آپ کی پیدائش 14 اپریل 1933 میں ہوئی۔

الیاس احمد گدی کی تعلیم آئی۔ اے تک ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکنے کے باوجود ذہن کافی کشادہ تھا۔ وہ نظریاتی طور پر اشتراکی تھے۔ اور مارکس و انجلس کے فلسفے کو پسند کرتے تھے۔ ایک مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا مزدوروں کا درد اُن کے دل میں پنہاں تھا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اس درد کو پیش کیا ہے۔ جس کی بہترین مثال 'فائر ایریا' ہے۔

الیاس احمد گدی کے ادبی سفر کی شروعات 1948 کے آس پاس ہوئی۔ ان کی پہلی مطبوعہ کہانی 'سُرخ نوٹ' ماہنامہ 'افکار' 1948 میں شائع ہوئی۔ لیکن اس وقت کی یہ تخلیق ادبی نہیں کہی جا سکتی۔ ان کی پہلی معروف کہانی 'عجائب سنگھ' ہے جو ادبی حلقے میں پسند کی گئی۔ یہ کہانی افسانوی مجموعہ 'آدمی' میں شامل ہے۔ الیاس نے ابتداً افسانے تخلیق کیے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'آدمی' 1983 میں منظر عام پر آیا اور دوسرا مجموعہ 'تھکا ہوا دن' کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا۔ الیاس صاحب نے کم و بیش چار پانچ ناول لکھے جن کے نام اس طرح ہیں۔ 'زخم' 1953، 'مرہم' 1954 فائر ایریا 1994 اور اخیر وقت کا ادھورا ناول 'بغیر آسمان کی زمین' جسے وہ مکمل نہ کر سکے۔

الیاس صاحب نے ایک سفرنامہ 'لچھمن ریکھا کے پار' کے عنوان سے لکھا جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا اور ایک سوانحی خاکہ جو ان کے بھائی غیاث احمد گدی پر مبنی ہے 'گلدھ پوری کا داستان گو' کے عنوان سے لکھا جو کافی مقبول ہوا۔ یہ جمشید قمر کی مرتب کردہ کتاب 'غیاث احمد گدی کے افسانے' اور 'غیاث احمد گدی فرد اور فنکار' از ہمایوں اشرف میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ الیاس صاحب نے ترجمے کے بھی کئی اہم کام کیے ہیں جن میں پھنیشور ناتھ رینو کی کہانیوں کو اردو میں 'بہترین کہانیاں' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔

الیاس احمد گدی اپنے ہم عصروں پر کئی معنوں میں سبقت لے گئے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی انعام 1997 کے ساتھ ساتھ بنگال، بہار اور اتر پردیش کی اردو اکیڈمیوں نے بھی انعامات سے نوازا۔

الیاس احمد گدی کے افسانوں کی زبان سلیس ہے لیکن کچھ افسانوں میں انھوں نے علامتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے جس کے سبب ان کے افسانوں کو پہلی قرأت میں سمجھ پانا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'آدمی' میں تیرہ افسانے شامل ہیں جن میں 'آدمی' 'ہارے ہوئے لوگ' 25 مارچ کے بعد کا ایک دن' ایسے افسانوں کے زمرے میں آتے ہیں جنھیں علامتی کہنا مناسب ہے۔ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے 'تھکا ہوا دن' میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ جن میں تھکا ہوا دن، تمکون، مکڑا، چلو بھر خون، 'ابورشن' اور 'سدھ کیا ہوا سانپ' کا شمار بھی علامتی کہانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ مذکورہ بالا کہانیاں فنی اعتبار سے بہت پختہ اور معنی خیز ہیں۔ بہرحال ذیل میں کچھ افسانوں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

افسانہ 'مکڑا'، 'تھکا ہوا دن' میں شامل ایک متاثر کن افسانہ ہے۔ اس کا عنوان ہی علامتی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ 'مکڑا' ایک نہایت کریہہ بدنما سا کیڑا ہے جس کے تعلق سے ذہن میں منفی خیالات ہی آتے ہیں۔ مکڑا جس کی فطرت جال بننا اور اس میں اپنے شکار کو پھانسنا ہے۔ اس جال کے بننے اور پھانسنے کی صفت پر ہی مبنی ہے یہ افسانہ۔ اس افسانے میں ایک شادی شدہ جوڑے کو پیش کیا گیا ہے، جس میں عورت ارچنا کا خاوند جیتندر ایک موذی مرض کا شکار ہے لہٰذا وہ کام نہیں کر سکتا اور گھر میں پڑا اپنی زندگی کے دن گن رہا ہے۔ اس کی بیوی اس کی تیمارداری کرنے میں منہمک ہے اور وہ مایوس ہو کر بھی مایوسی کا اظہار اپنے شوہر کے سامنے نہیں کرتی اُن دونوں کا بیٹا بلونت ہے۔ بلونت کی پڑھائی پیسوں کی کمی کی وجہ سے رک گئی ہے اور اس کا نام اسکول سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کملیش جو جیتندر کا دوست ہے اس کے گھر کی خانہ داری اور تمام دوسری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ غربت و افلاس کے شکنجے میں پھنسا انسان خود کو حالات سے آزاد نہیں کر پاتا اور رفتہ رفتہ حالات کا شکنجہ اُسے جکڑتا چلا جاتا ہے اور انسان اپنی مدافعت کی قوت کھوتا چلا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح مکڑے کے جال میں پھنسا اس کا شکار۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے ایک کینسر زدہ مرد کی بیوی کو اس کے دوست (مکڑا) کے احسان (جال) میں پھنستے اور مدافعت کی قوت ختم ہوتے دکھایا ہے۔ ایک اقتباس اس افسانے سے ملاحظہ ہو:

''کملیش رات میں آیا! شاید ابھی آئے........اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ کملیش کا انتظار ہے۔ وہ چونکی......اس کو؟ نہیں جیتندر کو، یا شاید دونوں کو، یا شاید اس تمام گھر کو، باورچی خانے میں رکھے خالی کنستروں کو، دواؤں کی الماری کو، کملیش جو ایک لفظ نہیں۔ ایک مرد ہے، توانا، خوبصورت، امیر، آنکھوں کی چمک من کو چھلنے لگتی ہے۔ گفتگو کا میٹھا اپنائیت بھرا نرم لہجہ چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اس سے بچنا، بچ نکلنا.....کبھی کبھی اپنی مدافعت کی طاقت پر بھی حیرت ہوتی ہے۔''

افسانے میں ایک مکھی کو مکڑے کے جالے میں پھنس جانے کو بھی بڑے علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ارچنا جو مکڑے سے نفرت کرتی ہے لیکن اسے گھر سے باہر نکال نہیں پاتی کیونکہ جیتندر اسے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اُس کا بگاڑتا ہی کیا ہے۔ کیا لیتا ہے وہ اپنا شکار ہی تو تلاش کرتا ہے۔ اور پھر اس گھر میں مکڑے یا کسی اور جانور کو نہیں مارنا چاہیے جہاں کوئی بڑا مریض ہو۔ ارچنا کملیش کے احسان روپی جال میں خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتی ہے۔ اس بات کو بھی افسانہ نگار نے علامتی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

''کملیش کی آنکھوں میں بڑی نرمی ہے۔ ممتا وہ پگھلنے لگی ہے، ان آنکھوں میں دیکھنا دیکھتے رہنا مشکل لگتا ہے۔ جلدی سے نظر ہٹا کر دیوار کی طرف دیکھتی ہے تو چونک جاتی ہے۔ مکڑے کے جال میں ایک مکھی پھنسی تیزی سے پنکھ چلا رہی ہے۔ کیسے پھنس گئی۔؟ کیسے چھوٹے گی...... مگر مکڑے کی آنکھوں میں بڑی نرمی ہے، بڑی ممتا...... آخر کار ...... آخرکار...... وہ سہم سی گئی۔ دل تیزی سے دھڑ کنے لگا۔ جبھی جیتندر کی آواز نے اُسے گھسیٹ لیا۔ ''لو یہ روپے رکھ لو۔! کملیش روپوں کا بنڈل لیے کھڑا تھا۔ وہ گڑ بڑائی، نہیں وہ روپے نہیں لے گی۔ کسی دوسرے مرد کے ہاتھ سے...... '' آپ رکھ دیجیے تکیے کے نیچے۔!''

غرض یہ کہ افسانہ نگار نے مکڑے کی فطرت کو بطور علامت افسانے کے پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ مکڑا جو کہ ایک مکروہ کیڑا ہے جس کے چاٹ جانے اور اس کے پیشاب کے لگ جانے سے جسم کے اس حصے پر دانے نکل آتے ہیں۔ جو دیکھنے میں بھی بدنما ہوتا ہے اور اس کی فطرت اس سے بھی زیادہ مکروہ ہوتی ہے، جسے افسانہ نگار نے علامتی انداز میں بڑے حُسن اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

خاندان اور معاشرے کے لیے کملیش کی قسم کے مکڑے بدشگون ثابت ہوتے ہیں جو اوپری دکھاوے کے نام پر اپنے جال میں پھانس کر انسانیت کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے مکڑے اپنی کاٹ کے نشانات انسانی جسم پر بدنما داغ کے مانند چھوڑ جاتے ہیں۔

'آدمی' بھی ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں قحط کی صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں عام آدمی تو کیا بڑے بڑوں کے گھروں کے چولہے بھی ٹھنڈے پڑے تھے، اور پیٹ میں آگ لگی تھی۔ اس افسانے میں آدمی کو آدمی کے خول میں رہتے ہوئے اور بعض دفع اس خول سے باہر ہوتے ہوئے بھی دیکھایا گیا ہے کہ کس

طرح ایک آدمی انسانیت سے گری ہوئی حرکت مثلاً جلی ہوئی بیڑی کے ٹکڑے کو بھی اُٹھا کر دو کش مار لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اُسے کئی دنوں سے بیڑی نہیں ملی۔ حالات انسان کو انسانیت سے نیچے گرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایک انسان غربت و افلاس اور بھوک کے سبب کچھ پیسے کمانے اور کچھ بچانے کی تگ و دو میں کن کن حالات اور سانحات سے دو چار ہوتا ہے۔ اور کس کس طرح جدو جہد کر کے دو روٹی کماتا ہے تا کہ پیٹ کی آگ بجھا سکے اور خود کو انسان کے خول میں قائم رکھ سکے۔ ورنہ انسان اور جانور میں فرق ہی کیا۔ جانور کو بھی بھوک لگتی ہے اور انسان کو بھی۔ فرق یہ ہے کہ انسان خود کی تگ و دو سے روٹی لاتا ہے اور جانور دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ گرے پڑے جوٹھے پر گزارا کرتے ہیں اور بس۔ یہ افسانہ اخیر میں ایک سوال قائم کرتا ہے کہ آخر ایک ہی پلیٹ میں انسان کے ساتھ کتے کو کھاتا دیکھ لوگ چونکتے کیوں نہیں۔!

افسانے کے آخری حصے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر اب وہ کتا میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ وہ بے حد پژمردہ اور تھکا ہوا دکھلائی دے رہا ہے۔ شاید بہت سے لوگوں کے پیچھے چلتے چلتے وہ نڈھال ہو چکا ہے۔ میں روٹی لیے ہوئے ایک قدرے اکیلی جگہ میں بیٹھ جاتا ہوں، میرے سامنے ذرا سے فاصلے پر کتا خاموش کھڑا مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے، کچھ ایسی التجا ہے، کچھ ایسی منت ہے کہ میں ہنس پڑتا ہوں۔ '' آجاؤ''۔ کتا ذرا سا جھجکتا ہے۔ اور پھر قریب آ کر میرے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ وہ مریل سا کتا دونوں ایک ہی پتے میں روٹی کھا رہے ہیں، بلکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر سیکڑوں بلکہ ہزاروں راستہ چلتے ہوئے لوگ چونکتے کیوں نہیں۔!

المختصر اس افسانے میں انسان کو اس کے خول سے باہر آنے اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت کر جانے کا واحد سبب غربت و افلاس کو ہی بتایا گیا ہے۔ زمانہ بدلا ہے حالات میں تبدیلی آئی ہے لیکن آج بھی غربت قائم ہے جو آدمی کو انسان بننے نہیں دیتی۔ یہ افسانہ آج کی صورت حال پر بھی صادق آتا ہے۔ آج بھی انسان کو ان حالات سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے کہیں قحط تو کہیں سیلاب تو کہیں بے روزگاری یہ ایسے حالات ہیں جس نے انسان کو وہ مقام آج بھی عطا نہیں کیا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس طرح افسانہ 'آدمی' کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

جیسا کہ اس قبل بھی ذکر آ چکا ہے کہ الیاس احمد گدی کے افسانے علامتی ہوتے ہیں۔ وہ علامتوں کے ذریعے بڑی اور پے چیدہ بات کہنے کا فن جانتے ہیں جنھیں قاری محض ایک قرأت میں سمجھ نہیں پاتا۔ ایسا ہی ایک علامتی افسانہ ہے'' 25 مارچ کے بعد کا ایک دن''۔ جسے سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے ورنہ اس افسانے تک رسائی ناممکن ہے۔ افسانے کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے۔

'' ہر روز نکلنے والا سورج، اس روز ایسا ہوا کہ نہیں نکلا اور ان لوگوں پر جو بے قصور تھے، ایک رات کے بعد دوسری رات مسلط کر دی گئی۔ چنانچہ بہت دھیرے دھیرے اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ '' کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟'' اس کی بیوی نے کہا۔ '' میں نے ایسے دن دیکھے ہیں جنھیں سیاہ کر دیا جاتا تھا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے بڑے بڑے چولہوں پر کولتار ڈال کر دھواں کیا جاتا تھا۔ اور جب یہ دھواں سارے شہر کو ڈھک لیتا تو ایسا اندھیرا چھا جاتا، مانو رات ہو گئی ہو............ مگر ایسا دن جو طلوع ہی نہ ہو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

'تھکا ہوا دن' ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں جو دو قوم کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایک آدمی جس کی آنکھیں چھوٹی مگر بے حد چمکیلی ہیں وہ حاکم طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ جبکہ دوسرا شخص محکوم طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ انگریز کس طرح ہمارے ملک میں آئے اور ہمارے درمیان رہ کر ہمارے ہی لوگوں کے ذریعے ہمیں پر حکومت کی اور ہم پھنستے اور محکوم بنتے چلے گئے۔ اس انسانیت سوز عہد کو ایک چھوٹے سے افسانے میں علامتی انداز میں الیاس صاحب نے بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہم ہندوستانیوں کی بے اعتنائی اور کاہلی نے ہمیں ا

پنے مقام سے گرا کر دوسروں کے قدموں میں جھکا دیا جہاں ہم دوسرے کے استعمال کی چیز بن گئے۔ یہ ایک سانحہ ہے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستانی قوم پر صادق آتا ہے۔ انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' پالیسی کو اپنا کر ہمیں آپس میں لڑا دیا اور بڑی مچھلیاں خود پکڑتے رہے اور ہم چھوٹی مچھلیوں کے شکار میں ہی الجھے رہے۔ اس ضمن میں افسانے سے ایک اقتباس پیش ہے:

''بات در اصل یہ ہے کہ چھوٹی آنکھوں والا اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ بات در اصل یہ ہے کہ شکار سے پہلے آدمی کو دیکھ لینا چاہیے کہ اس کی بنسی، کانٹا، دھاگا سب درست حالت میں ہیں یا نہیں تا کہ بعد میں دھوکا نہ اٹھانا پڑے۔'' ''ایک چھوٹی سی، انگلی بھر کی مچھلی کانٹے میں الجھی اس کے بغل میں آ گری۔ چھوٹی آنکھوں والا ہنسنے لگا۔ تو اس کو غصہ آ گیا۔ اس نے مچھلی کو گالی دی۔ ''چھوٹی آنکھ والے نے تیسری مچھلی پھر پھنسائی۔ پھر سارا وہی عمل، جدو جہد، بھاگ دوڑ پھر کنارے پر چت پڑی ہوئی ایک بڑی مچھلی........ اس بار پھر اسے مچھلی اُٹھانے کے لیے کہا گیا۔ مگر اس بار لہجہ عاجزانہ نہ تھا بلکہ تحکمانہ تھا۔ اب اس میں انکار کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اس نے خاموشی سے اس کے حکم کی تکمیل کی۔ ''تم کو ن سا ٹوپ استعمال کر رہے تھے۔؟ کچھ ہچکچا کر چھوٹی آنکھ

'روشنی' انسانی جذبات کو ابھارنے والا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ دعوت فکر دیتا ہے۔ 'چلو بھر خون' اوہام پرستی پر مبنی افسانہ ہے۔ افسانہ 'اسیری' انسانی زندگی کا جسم نما پنجڑے میں قیدو بند کی کہانی ہے، جسے افسانہ نگار نے بے حد حسّاسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ جدید یت سے متاثر افسانہ ہے، جس میں طوطے کے پنجڑ ے او ر پرانی تصویروں کے استعاروں کے ذریعے انسانی زندگی کی مجبوریوں اور بے بسی کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان اس دنیا میں خود کو بے دست وپا محسوس کرتا ہے۔

والا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں کوئی ٹوپ استعمال نہیں کر رہا تھا۔ ''پھر۔؟ اس کو بے حد تعجب ہوا۔'' میں بڑی مچھلیوں کو پھنسانے کے لئے چھوٹی مچھلیوں'' بیچ میں بڑی مچھلیوں کو پھنسانے کے لیے چھوٹی مچھلیوں کو چارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ جانتے ہو اس سے دوسرے گھاٹوں کی مچھلیاں بھی میرے گھاٹ پر چلی آئیں۔''

درج بالا اقتباس سے ڈیوائڈ اور رول کے انگریزوں کی پالیسی کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جسے افسانہ نگار نے چھوٹی آنکھ والے (انگریز) اور بنسی یعنی انکا رول کے ذریعے پیش کیا ہے۔

افسانہ 'لیڈر' مجموعہ 'آدمی' میں شامل ہے۔ یہ ایک مختصر سا افسانہ ہے۔ الیاس صاحب نے لیڈر کی اس صفت کو پیش کیا ہے کہ وہ کس طرح لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی ترکیب اختیار کرتے ہیں۔ بھاشن دینا، گلا پھاڑ کے چلا کر ہاتھوں کو ہوا میں ہلا ہلا کر اپنی پوری قوت سے صرف اور صرف اپنی طاقت اور لوگوں کے لیے کار آمد ثابت ہونے کا ثبوت دینا مگر زبانی........ یہی ہے لیڈر کی فطرت۔ بہر حال اس افسانے میں بظاہر تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی لیکن اس کے پس پردہ ایک چوٹ ہے عوام پر جو اپنا وقت اور اپنی قوت کو نام نہاد بڑی اور مقبول شخصیات سے ملنے ان کے دیدار کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ جس سے وہ شخصیت تو مشہور ہو جاتی ہے، لیکن عوام کو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

'عزت آرا' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کی زندگی میں سنجیدگی معنی نہیں رکھتی۔ وہ اپنے دل کی سنتی ہے۔ جس سے انسیت ہو جائے اُسے اپنی ذات کی قربانی دے کر بھی قائم رکھتی ہے۔ لیکن فطری لگاؤ کے بھی دائرے ہیں اگر یہ فطری لگاؤ بے دائرہ ہو جائے تو فاشیت کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ عزت آرا جو اس افسانے کا مرکزی کردار اور ہیروئن ہے اس کا تعلق عورت کی اس قماش سے ہے جو جنسی و جذباتی لگاؤ کو سب کچھ سمجھ بیٹھتی ہے اور سماجی و مذہبی زندگی اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس طرح افسانہ ''لذت سنگ'' بھی ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ اس افسانے میں عورت کی نفسیات کی گرہ کشائی کی گئی ہے کہ عورت ہمیشہ توانا مرد کو پسند کرتی ہے۔

افسانہ 'میری کہانی ان کا فسانہ' محبت کرنے والے جوڑے کا آپس میں ایک نہ ہو پانے اور تا زندگی اپنی محبت کو دل کے نہاں خانے میں محفوظ رکھنے کے جذبہ پر مبنی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پہلی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کبھی مرتا بھی نہیں۔ بہر حال اس افسانے میں ایک شادی شدہ جوڑے کی اپنے ماضی کی محبت کو بھول کر اپنی ازدواجی زندگی کو خوش نما بنائے رکھنے کی غرض سے اپنی اپنی سابقہ محبت کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھنے کے انسانی، اخلاقی، معاشرتی

اور سماجی تقاضے کو بحسن وخوبی پیش کیا گیا ہے۔

'روشنی' انسانی جذبات کو ابھارنے والا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ دعوت فکر دیتا ہے۔ 'چلو بھر خون' اوہام پرستی پر مبنی افسانہ ہے۔ افسانہ 'اسیری' انسانی زندگی کا جسم نما پنجڑے میں قیدو بند کی کہانی ہے، جسے افسانہ نگار نے بے حد حسّاسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ جدیدیت سے متاثر افسانہ ہے، جس میں طوطے کے پنجڑے او ر پرانی تصویروں کے استعاروں کے ذریعے انسانی زندگی کی مجبوریوں اور بے بسی کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان اس دنیا میں خود کو بے دست وپا محسوس کرتا ہے۔

درج بالا افسانوں کے مطالعے سے الیاس احمد گدی کے خلاقانہ ذہن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اوسط اور بہترین دونوں قسم کے افسانے لکھے۔ ان کا افسانوی اثاثہ بہت بڑا نہیں تو بہت کم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال اردو افسانہ نگاری میں جس قندیل کو ان کے بڑے بھائی غیاث احمد گدی نے روشن کیا تھا اسے ان کے بعد الیاس صاحب نے تھاما اور آگے بڑھے۔ وقت نے انھیں مواقع نہیں دیے۔ حالات سازگار نہ رہے اور سانسیں بہت مختصر پھر بھی ادب کی اس قندیل نے اپنی روشنی اپنی ذات سے باہر بکھیری اور بکھیرتے ہوئے اپنی آخری منزل کی جانب بڑھ گئے۔ اس طرح نگدھ پوری کا یہ قصہ گو قصہ گوئی کی محفل سونی کر کے ہورلا ڈیہہ کے قبرستان میں 27 جولائی 1997 کو ابدی نیند سو گیا۔

■

Dr. Rizwana Parveen
Alam Ganj, Peerwais Market Maidan
Post: Gulzar Bagh
Distt: Patna-800007 (Bihar)
E-mail:rperween101@gmail.com

شبستاں پروین

'شہاب نامہ' میں ہندوستانی عناصر

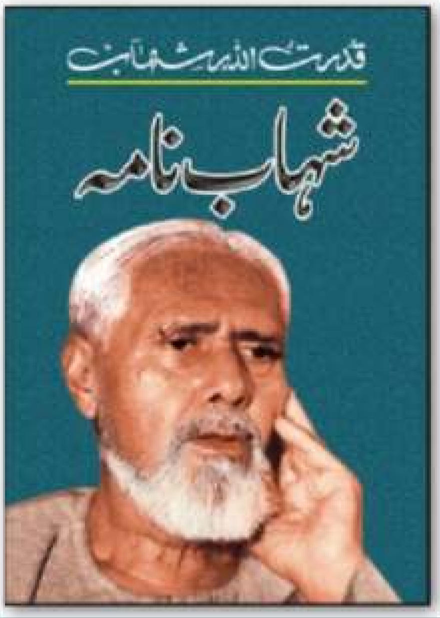

فکشن کے سفر پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہر ایک فکشن نگار کی نظر اپنے ملک میں اس وقت کے ماحول، واقعات کے ساتھ اس کی تہذیب و ثقافت پر بھی پڑتی ہے۔ وہ اپنے ملک اور آس پاس کے ماحول ہی کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتا ہے۔ اردو ادب میں فکشن کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوتی ہے۔ ناول، مختصر افسانہ اور ناولٹ کی بنیاد داستان پر استوار ہے۔ گو کہ اردو ادب میں مذکورہ بالا اصناف کی ابتدا غیر متوقع طور پر نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے پہلے سے ہی زمین ہموار ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب ہندوستان میں سیاسی، سماجی، سائنسی اور جدید تعلیمی بیداری آئی تو وقت کے ساتھ ساتھ داستان نے اپنا چولا بدل لیا۔ مافوق الفطری دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھا۔ ابتدا میں اردو ادب میں دو طرح کے رجحانات ملتے ہیں۔ ایک رومانی رجحان جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم کر رہے تھے اور دوسرا سماجی اصلاحی رجحان جس کی رہبری پریم چند نے کی۔ اول الذکر ادب کو تفریح و تفنن کا سامان سمجھتا تھا جب کہ دوسرا ادب کو مقصدی ادب کے زمرے میں رکھنے کا قائل تھا۔ یعنی ادب کو ایسا ہونا چاہیے جو سماج کا آئینہ دار ہو اور اس کے لیے مفید و کارآمد ہو۔ اسی وقت ترقی پسند تحریک کا دور شروع ہوا۔ یہ دور شاعری کے لیے کیسا بھی رہا ہو لیکن فکشن کے تعلق سے اس تحریک کا زمانہ عہد زریں کہلاتا ہے۔ خاص طور پر افسانے کے لیے یہ دور سب سے بہترین خیال کیا جاتا ہے۔

ترقی پسند دور میں اردو فکشن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ 1960 کے قریب جب ترقی پسند تحریک کمزور پڑ گئی اور جدیدیت کا رجحان سب پر غالب ہوتا چلا گیا تو اس وقت اردو فکشن میں نئی تکنیک، موضوع اور اسالیب شامل ہوئے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ روایت سے ہی جدت کا جنم ہوتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس دوران بھی تمام تخلیق کاروں نے اس موضوع پر خوب لکھا۔ چونکہ روایت سے ہی جدت کا زور ہوا ہے اس لیے ہم یہاں پر قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت 'شہاب نامہ' میں ہندوستانی عناصر کے حوالے سے بات کریں گے، جو 1986 میں ان کے انتقال کے ایک سال بعد یعنی 1987 میں شائع ہو کر مقبول عام ہوئی۔

'شہاب نامہ' اردو ادب میں بے حد مشہور و معروف خودنوشت ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو مختصر نویسی کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے 9/جون 1938 سے باقاعدہ طور پر ایک ڈائری رکھی۔ اس ڈائری میں جوان کے اردگرد واقعہ اہمیت رکھتا تھا، اس کو اس میں شمار کر لیتے تھے۔ ایک دن قدرت اللہ شہاب کے دوست ابن انشا نے ان سے کہا کہ اپنی ڈائری کے راز کو بے نقاب کیجیے اور دلجمعی سے ایک کتاب لکھیے۔ میں تو اس کو پڑھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا۔ لیکن میری روح خوش ہوگی۔ ان کے اصرار پر قدرت اللہ شہاب نے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا اور اس طرح یہ خودنوشت کتابی صورت میں وجود میں آ گئی۔ یہ خودنوشت 'شہاب نامہ' کے عنوان سے ان کے ناولٹ اور افسانوں کے ساتھ اردو ادب میں کافی مشہور و مقبول ہے اور تاریخی، تہذیبی، سیاسی، سماجی و ادبی اعتبار سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ شہاب نامہ قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کے ساتھ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاس ہے۔ یہ 1232 صفحات اور 58 ابواب پر مشتمل ہے۔ پھر بھی قاری اس کی ضخامت کو بھول کر اس کی حسن کاری، طنزیہ و مزاحیہ مفہوم اور اس کے اسلوب کی دلکشی میں کھو جاتا ہے۔ اس میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے گھر کے افراد کے ساتھ بہت سی خاص اور یادگار تصاویر کو شامل کر کے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ ساتھ ہی معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی فراہم کیا ہے۔

'شہاب نامہ' کے کچھ ابواب وہ ہیں جن کو قدرت اللہ شہاب افسانوی شکل میں شائع کر چکے تھے۔ مثلاً نندہ بس سروس، چکور صاحب، صاحب جینا اور میں، بملا کماری کی بے چین روح اور چندراوتی وغیرہ۔ ان ابواب کو ان کے افسانوں سے وابستہ کیا جا سکتا ہے بلکہ خودنوشت کو تحریر کرنے میں بھی قدرت اللہ شہاب کا وہی اسلوب ہے جو ان کے افسانوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس میں بھی افسانوں کی طرح تشبیہات واستعارات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ کرداروں کے ساتھ واقعات کی پیش کش میں بھی افسانوی رنگ موجود ہے۔ ان کو بیان کرنے میں ایسی تفصیلات کو شامل کیا گیا ہے جس سے ان میں شامل شدہ تمام کرداروں کی زندگی کی حقیقت پیش ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے الجھتے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب جب اسلامیہ اسکول کے طالب علم تھے تو اس وقت پورے جموں شہر میں پلیگ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے بہت سے لوگ اس بیماری کی لپیٹ میں آ کر مر چکے تھے۔ یہاں تک کہ قدرت اللہ شہاب کے استاد مولوی صاحب کی اہلیہ کا بھی اس بیماری سے انتقال ہو گیا تھا۔ جموں میں پھیلی اس خطرناک بیماری کے متعلق قدرت اللہ شہاب نے، شہاب نامہ میں تحریر فرمایا ہے:

''ان دنوں جموں شہر میں ہر روز دس پندرہ لوگ طاعون سے مرتے تھے۔ گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ گاہک دوکانوں کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دوکاندار گاہکوں کو شک و شبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے ہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا۔'' [شہاب نامہ، ص 22]

اسکول میں پڑھانے والے مولوی صاحب کی بیگم سے قدرت اللہ شہاب کو کافی لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسکول جانے سے پہلے ان کے گھر جاتے۔ جب کہ قدرت اللہ شہاب کو بازار سے سبزی اور دوسری چیزوں کا خریدنے کا تجربہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ صادقہ بیگم کے لیے آلو، مٹر، دھنیا، گوشت وغیرہ خرید کر لاتے۔ ایک بار قدرت اللہ شہاب صادقہ بیگم کے ساتھ روشن شاہ ولی کے مزار پر نیاز چڑھانے کے لیے بھی گئے۔ وہ شہاب نامہ میں لکھتے ہیں:

''روشن شاہ ولی کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ دور ہی دور سے ان کے مزار کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ سنگ مرمر کے بلند چبوترے پر ایک بڑی سی قبر تھی جس پر سبز غلاف

چڑھا رہتا تھا۔ رات کو سرہانے کئی چراغ جلتے تھے۔ مسلمان تو اندر جھانک کر فاتحہ درود پڑھتے تھے لیکن کئی ہندو ڈوگرے بھی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی چار دیواری پر ہاتھ پھیر کر عقیدت مندی سے مزار کو سلام کیا کرتے تھے۔ میں نے بڑی پھرتی سے صادقہ بیگم کو یقین دلایا کہ میں روشن شاہ ولی کے مزار کا راستہ بخوبی جانتا ہوں اور اسے بڑی آسانی سے وہاں لے جاؤں گا۔'' [شہاب نامہ، ص 27]

پیر روشن شاہ ولی کی زیارت کے بعد جب وہ دونوں وہاں سے لوٹے تو ان کے پاس جو کچھ پیسے بچے تھے وہ صادقہ بیگم نے رگھوناتھ بازار کے نکڑ پر پان والے دوکاندار اور سبز منڈی میں بیر والے کو دے دیے۔ اس وقت زیادہ تر تانگہ ہی سواری کا ذریعہ تھا۔ لیکن اب ان کے پاس کرائے تک کے لیے پیسے نہیں تھے۔

سبزی منڈی، مہاراجہ کے پرانے محلات اور رگھوناتھ بازار کا ذکر شہاب نامہ میں ص 29 پر کیا ہے۔ نندا بس سروس کا ذکر ص 37 سے ص 51 تک کیا ہے۔ نندا ہاؤس اس وقت جموں کی سب سے مشہور و بہترین کپڑے کی دوکان تھی، دوکان کے مالک نندا صاحب اور ان کے ساتھ آٹھ دس ملازم صبح سے شام تک اس کاروبار میں مصروف رہتے۔ یہ کاروبار جب آسمان کی بلندیوں پر پہنچا تو نندا صاحب نے لاہور سے جموں اور جموں سے سری نگر تک ایک منظم بس اور ٹیکسی سروس بھی شروع کر دی۔ جموں میں پہلا سنیما ہال بنانے کا شرف بھی نندا صاحب کو حاصل ہے۔ بقول قدرت اللہ شہاب:

''مہاراجہ ہری سنگھ کی خوشامد میں انھوں نے اس کا نام ہری ٹاکیز رکھا۔'' [شہاب نامہ، ص 39]

جموں میں جب پلیگ کی بیماری تیزی سے چاروں طرف پھیلی تو قدرت اللہ شہاب اسی بس میں جو نندا صاحب نے جموں سے سری نگر کے لیے شروع کی تھی سوار ہو کر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بس میں ان کے ساتھ اور بہت سے مسافر تھے۔ ان مسافروں میں پرنس آف ویلز کالج کا ایک کشمیری پنڈت پروفیسر بھی تھا جو اپنی پنڈتانی کے ساتھ گرمی کی چھٹی گذارنے سری نگر جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بمبئی کے آغا صاحب اور ان کے ساتھ آئی ہوئی ایک خوبصورت پارسی لڑکی بھی ان کی ہم سفر تھی۔ رام نگر شہر سے گذر جانے کے بعد جہاں قدرت اللہ شہاب نے راجہ اور مہاراجہ کے محلات کا تذکرہ کیا ہے وہیں انھوں نے جموں کی مشہور پنج پیر کا بھی ذکر کیا ہے۔

''رام نگر سے ذرا آگے یہ کہہ کر ڈرائیور نے بس کی رفتار احتراماً ہلکی کر دی۔ کیونکہ یہاں پر نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے درمیان 'پنج پیر' کی کہنہ اور بوسیدہ قبریں تھیں۔ کچھ مسافروں نے گردن جھکا کر پنج پیر کو سلام کیا—''

قدرت اللہ شہاب نے لندن میں ہوئے انگریزی مضمون نویسی کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا جس کا بڑا چرچا ہوا اور انھیں ہر طرف سے مبارک بادیں ملیں۔ یہاں تک کہ کالج کے پرنسپل سیوا رام سوری کے بھی بہت سے خط آئے۔ ان خطوط میں ایک خط اس وقت کے مہاراجہ ہری سنگھ کا بھی تھا۔ انھوں نے قدرت اللہ شہاب کی جیت سے خوش ہو کر ایک شام انھیں چائے پر بلایا۔ مہاراجہ کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب نے تحریر فرمایا ہے:

''وہاں پر ایک صاحب نے جو ڈیوڑھی وزیر کہلاتے تھے مجھے از سر نو مہاراجہ کی سرکار میں پیش ہونے کے آداب سکھائے اور ایک آراستہ ویٹنگ روم میں بیٹھا دیا، جہاں دس بارہ آدمی درباری لباس پہنے چندیری چہروں کے ساتھ پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی صبح کے نو بجے سے باریابی کا منتظر بیٹھا ہے کوئی دس بجے سے۔ لیکن سرکار نے ابھی تک بھی یاد نہیں فرمایا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچھ بے صبری دکھائی تو ڈیوڑھی وزیر غصے سے بولے کہ میاں تم کس کھیت کی مولی ہو، یہ دوسرے حضرات جو یہاں بیٹھے ہیں سب کرسی نشین درباری ہیں اور یہ آراستہ و پیراستہ خواتین سرکار کی منظور نظر ہیں۔ تین چار دن سے یہ ہو رہا ہے کہ یہ سب صبح سویرے یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور شام تک انتظار کر کے ہنسی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ تم بھی چپکے سے بیٹھے رہو۔''

قدرت اللہ شہاب جب آئی سی ایس میں کامیاب ہوئے تو اس وقت وہ جموں عجائب گھر کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے روزنامہ ٹریبیون پڑھ رہے تھے۔ اسی اخبار میں انھوں نے اپنا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ عجائب گھر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''باہر عجائب گھر کے وسیع و عریض کمپونڈ میں ریاست جموں و کشمیر کے سرکردہ ڈوگروں کی دو تین ٹولیاں حسب معمول اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔ اسی کمپونڈ میں سنگ مرمر کی دو بڑی تخت نما چوکیاں ایستادہ تھیں۔ سلطنت برطانیہ کے پرنس آف ویلز کسی وقت اپنی سیر و سیاحت کے دوران جموں شہر کو بھی نواز گئے تھے۔ عجائب گھر ان کے مہمان خانے کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اب سر شام ریاست کے سابق دیوان اور وزیر ریٹائرڈ حکام اور عمر رسیدہ ڈوگرہ ان چوکیوں پر بیٹھ کر شہر کے نظارے دیکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے گن گاتے تھے اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس پر زہرناک تبصرے کیا کرتے تھے۔'' [شہاب نامہ، ص 145]

قدرت اللہ شہاب نے 'شہاب نامہ' میں دہرادون، بھاگل پور اور نتھ نگر کے ماحول کا پورا نقشہ آٹھویں باب میں پیش کیا۔ جب ان کی آئی سی ایس کی ٹریننگ دہرادون میں مکمل ہوئی تو اس وقت کے تمام حالات کو بھی قاری کے سامنے لایا گیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب جب اورنگ آباد کے سب ڈویژن کے ایس ڈی او مقرر ہوئے تو اورنگ آباد میں انھیں ہر طرف بدحالی نظر آئی جس کا اظہار انھوں نے مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔ ایس ڈی او کا اردلی شمبھو ناتھ تیواری ہے۔ وہ وہاں کے سبھی رازوں سے واقف ہے۔ وہاں کا ڈپٹی کلکٹر سبھی تھانوں کے افسران کی خوشنودی کے سامان پیدا کرنے میں ماہر ہے۔ وہاں کے بنیے جوتھانیداروں کو خوش رکھنے کے لیے ہر قیمت پر تیار رہتے ہیں اور ان کی آڑ لے کر لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ہر سامان میں ملاوٹ اور بلیک کرنا ان کی عادت میں شمار ہے۔ ایک بار قدرت اللہ شہاب کو ایک تھانیدار کے ساتھ وہیں کے ایک علاقے کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ علاقہ مکھیوں اور مچھروں کے لیے مشہور ہے۔ دونوں کے پاس مچھر دانیاں ہیں لیکن جہاں انھیں چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا ہے وہاں چارپائی تو ہیں لیکن مچھر دانیاں لگانے کے لیے کسی قسم کے ڈنڈے موجود نہیں ہیں۔ مجبوراً قدرت اللہ شہاب مچھر دانی کے بغیر ہی سامنے برآمدے میں لیٹ جاتے ہیں اور تھانیدار اپنی چارپائی پچھلے برآمدے میں بچھا لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کا اس کے نچلے کارندوں کے ساتھ استحصال سامنے آ جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیٹتے ہی مٹر کے دانوں کی طرح موٹے موٹے مچھروں نے چاروں طرف سے زبردست یورش کر دی۔ وہ قطار در قطار بھیں بھیں کرتے آتے تھے اور اس قدر بے رحمی سے کاٹتے تھے جیسے کوئی دہکتے ہوئے انگارے چمٹے سے اٹھا اٹھا کر مسل رہا ہو۔ مچھروں کے حملے سے میرا تو برا حال ہو رہا تھا لیکن عقبی برآمدے سے برابر تھانیدار کے پرسکون خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب میں نے دبے پاؤں اٹھ کر اس کی طرف جھانکا تو دیکھا کہ تھانیدار صاحب کی چارپائی پر ان کی مچھر دانی بڑی آن بان سے تنی ہوئی ہے اور چار مقامی چوکیدار اسے چاروں کونوں سے تھامے بالکل بے حس و حرکت پتھر کے ستونوں کی طرح ایستادہ ہیں۔'' [شہاب نامہ، ص 198]

اس طرح قدرت اللہ شہاب نے اپنے بہترین اور منفرد اسلوب کے ذریعے شہاب نامہ میں ہندوستانی عناصر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

■

Shabistan Parveen
Research Scholar, Dept of Urdu
Chaudhary Charan Singh University
Main Road, Meerut, 200005 - (UP)

پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟
(What is a Personal Computer?)

ہارڈ ڈسک ڈرائیو (Hard Disk Drive)

ہارڈ ڈسک پر ڈاٹا اسٹور کیا جاتا ہے۔ اس میں اسٹور کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور ڈاٹا لکھنے پڑھنے کی رفتار بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک ہارڈ ڈسک میں 100 گیگا بائٹ (Gb) سے لے کر 500 گیگا بائٹ تک ڈاٹا اسٹور کیا جاسکتا ہے۔ ہارڈ ڈسک یا تو اپنے ڈرائیو کے ساتھ کمپیوٹر کی سسٹم یونٹ میں ہی لگی ہوتی ہے یا اسے الگ سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

تصویر C-5.10 ہارڈ ڈسک ڈرائیو

ہارڈ ڈسک ڈرائیو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مقررہ (Fixed) اور بدلنے لائق (Removable)۔ مقررہ ہارڈ ڈسک ڈرائیو میں ڈسک کو بدلا نہیں جاسکتا، لیکن بدلنے لائق ڈسک ڈرائیو میں ہارڈ ڈسک کو ضرورت پڑنے پر نکالا اور بدلا جاسکتا ہے۔ ہارڈ ڈسک بہت قیمتی اور نازک ہوتی ہے، اس لیے بدلنے لائق ہارڈ ڈسک بہت کم پائی جاتی ہے۔ ہارڈ ڈسک کو غبار وغیرہ سے بچانے کے لیے ایک بند ڈبے کے اندر رکھا جاتا ہے۔ تھوڑا سا بھی غبار ڈسک کی سطح کو بری طرح خراب کرسکتا ہے۔ تصویر C-5.10 میں ایک ہارڈ ڈسک ڈرائیو کی تصویر دی گئی ہے۔ اس کی دونوں سطحوں پر ڈاٹا لکھا جاسکتا ہے۔ ہر سطح پر ڈاٹا لکھنے اور پڑھنے کے لیے ایک الگ ریڈ- رائٹ ہیڈ (Read-Write Head) ہوتا ہے۔ تصویر میں صرف ایک ہی ریڈ- رائٹ ہیڈ دکھائی دے رہا ہے۔

ریڈ- رائٹ ہیڈ کا بازو اس طرح کا ہوتا ہے کہ ضرورت کے مطابق وہ ڈسک پر آگے پیچھے چل سکتا ہے۔ ڈسک اپنے محور پر لگاتار گھومتی رہتی ہے۔ اس طرح ریڈ- رائٹ ہیڈ ڈسک کے کسی بھی ٹریک کے کسی بھی سیکٹر پر سیدھے پہنچ سکتا ہے۔

چھوٹے کمپیوٹر، جیسے پی سی میں ہارڈ ڈسک کا سائز بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے ونچسٹر ڈسک (Winchester Disk) کہا جاتا ہے۔ آج کل عموماً ہر پی سی میں ونچسٹر ڈسک ضرور ہوتی ہے۔ یہ ڈسک سسٹم یونٹ میں ہی ایک حصے میں لگا دی جاتی ہے۔ یہ سائز میں اگرچہ کافی چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ڈاٹا بھرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے، جو کہ کئی گیگا بائٹ تک ہوسکتی ہے۔

ہارڈ ڈسک الگ سے بھی جوڑی جاسکتی ہے، لیکن زیادہ تر اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی پی سی میں اگر ہارڈ ڈسک ڈرائیو ہوتی ہے، تو اسے ڈرائیو 'C' کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کو اسٹارٹ (Start) یا بوٹ (Boot) کرنے والے بنیادی پروگرام اور دوسرے سبھی ضروری پروگرام اسی ڈسک میں رکھے جاتے ہیں۔ جیسے ہی کمپیوٹر (پی سی) کا مین سوئچ آن کیا جاتا ہے، ویسے ہی ڈرائیو C سے بوٹ کرنے والا پروگرام شروع ہوجاتا ہے۔

ماؤس (Mouse)

تصویر C-5.11 ماؤس

کسی بھی پی سی میں کی-بورڈ کے ساتھ ساتھ ان پٹ کا ایک اور آلہ ہوتا ہے، جسے 'ماؤس' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ہاتھ میں پکڑا جانے والا ایک چھوٹا سا ڈبہ ہوتا ہے۔ یہ ایک لمبے تار (یا کیبل) کے ذریعے سسٹم یونٹ سے جڑا ہوتا ہے، جیسا کہ تصویر C-5.11 میں دکھایا گیا ہے۔ اس کی مدد سے ہم کی-بورڈ کا استعمال کیے بغیر اپنے پی سی پر بہت سے کام کرسکتے ہیں۔ دراصل یہ کی-بورڈ کا متبادل ہوتا ہے۔

ماؤس ایک برابر (Plain) سطح، جسے ماؤس پیڈ (Mouse Pad) کہتے ہیں، پر ہاتھ سے پکڑ کر کھسکایا جاتا ہے۔ اس کی نچلی سطح پر (یعنی پیڈ کو چھونے والی سطح پر) ایک ربڑ کی گیند ہوتی ہے، جو چاروں طرف پوری آزادی کے ساتھ گھوم سکتی ہے (اب لیزر بیم والے ماؤس بھی آنے لگتے ہیں)۔ اس کی اوپری سطح پر دو بٹن ہوتے ہیں۔ ہم زیادہ تر اس کے بائیں بن کا استعمال کرتے ہیں، لیکن کچھ پروگراموں میں دائیں بٹن کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

وی ڈی یو اسکرین پر ماؤس کی پوزیشن کو دکھانے والا ایک خاص کرسر یا نشان ہوتا ہے، جو اوپر اٹھے ہوئے ترچھے تیر (↖) جیسا ہوتا ہے۔ اسے ماؤس پوائنٹر (Mouse Pointer) کہا جاتا ہے۔ یہ پوائنٹر ماؤس کی حرکت (Movement) کے مطابق ہی حرکت کرتا ہے۔ جب ہم ماؤس کو ہاتھ سے پکڑ کر ماؤس پیڈ پر ادھر اُدھر گھماتے ہیں، تو ماؤس پوائنٹر بھی اس کے ساتھ ساتھ اسی سمت میں گھومتا ہے۔ اس طرح ماؤس کو گھماتے ہوئے ہم ماؤس پوائنٹر کو مانیٹر کی اسکرین پر کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔

ہم ماؤس کے ساتھ کئی قسم کے کام کرتے ہیں، جن کے بارے میں اختصار کے ساتھ نیچے بتایا گیا ہے:

پوائنٹنگ (Pointing): جب ہم ماؤس کو ادھر اُدھر گھما کر ماؤس پوائنٹر کو اپنے ڈیسک ٹاپ کی کسی چیز پر لاتے ہیں، تو اسے پوائنٹ کرنا کہا جاتا ہے۔

کلکنگ (Clicking): جب ہم ماؤس پوائنٹر کو کسی چیز یا جگہ پر لاکر ماؤس کے بائیں بٹن کو ایک بار دبا کر چھوڑ دیتے ہیں، تو اس عمل کو کلک کرنا کہا جاتا ہے۔

ڈبل کلکنگ (Double-Clicking): جب ہم ماؤس کے بائیں بٹن سے جلدی جلدی دو بار کلک کرتے ہیں، تو اس عمل کو ڈبل کلک کرنا کہا جاتا ہے۔

رائٹ کلکنگ (Right-Clicking): جب ہم ماؤس پوائنٹر کو کسی چیز یا جگہ پر لاکر ماؤس کے دائیں بٹن کو کلک کرتے ہیں، تو اس عمل کو رائٹ کلک کرنا کہا جاتا ہے۔

ڈریگنگ (Dragging): جب ہم ماؤس پوائنٹر کو کسی چیز پر لاکر ماؤس کے بائیں بٹن کو دبا کر پکڑ لیتے ہیں اور ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر ہی ماؤس پوائنٹر کو ادھر اُدھر گھماتے ہیں، تو اس عمل کو کھینچنا یا ڈریگ کرنا کہا جاتا ہے۔ ایسا کرنے پر وہ چیز بھی ماؤس پوائنٹر کے ساتھ سرکتی ہے۔

ماؤس کا استعمال ونڈوز پر مبنی آپریٹنگ سسٹم میں ضروری ہو چکا ہے۔ سبھی پروگرام، گیم وغیرہ جو ان آپریٹنگ سسٹم میں چلتے ہیں، ان میں بھی ماؤس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈیسک ٹاپ پبلشنگ (Dest Top Publishing) جیسے کاموں میں بھی ماؤس کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ہم کمپیوٹر کی مدد سے کتابیں، تصویریں، اخبارات وغیرہ تیار کرسکتے ہیں۔

سی ڈی- روم ڈرائیو (CD-ROM Drive)

سی ڈی یا کامپیکٹ ڈسک (Compact Disk)

ایک خاص قسم کی ڈسک ہوتی ہے، جس پر ڈاٹا عموماً ایک ہی بار لکھا جاتا ہے اور پھر اسے جتنی بار چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ریڈ آنلی میموری (Read Only Memory) ہی ہے۔ ان میں عموماً ایسی معلومات اسٹور کی جاتی ہیں، جو مستقل نوعیت کی ہوں یا جن کی ضرورت بار بار پڑتی ہو، جیسے ٹیلی فون ڈائریکٹری، ہوائی جہاز کی پروازوں کے ٹائم ٹیبل، کتابیں، لائبریری کی کتابوں کی فہرست (Catalogue)، قانونی معلومات، فلم، بڑے بڑے پروگرام یا پیکیج وغیرہ۔

تصویر C-5.12 کامپیکٹ ڈسک

ان ڈسکوں پر ڈاٹا اسٹور کرنے کا طریقہ ہارڈ ڈسک سے کچھ الگ ہوتا ہے۔ ہارڈ ڈسک میں ٹریک مرکزی دائروں (Co-central Circles) کی شکل میں ہوتے ہیں، وہیں کامپیکٹ ڈسک کے ٹریک جالے دار (Spiral) ہوتے ہیں۔ تصویر C.5.12 میں ایک کامپیکٹ ڈسک دکھائی گئی ہے۔ اس میں سبھی سیکٹروں کی لمبائی برابر ہوتی ہے۔ ان پر ڈاٹا پڑھنے لکھنے کے لیے لیزر (Light Amplification by Stimulated Emission of Radiation, LASER) تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے انھیں آپٹیکل ڈسک **(Optical Disk)** بھی کہا جاتا ہے۔

تصویر C-5.13 سی ڈی ۔ روم ڈرائیو

سی ڈی پر سے ڈاٹا پڑھنے کا کام ایک خاص آلہ کے ذریعے کیا جاتا ہے، جسے سی ڈی - روم ڈرائیو کہتے ہیں۔ تصویر C-5.13 میں ایک سی ڈی - روم ڈرائیو دکھایا گیا ہے۔ آج کل عموماً سبھی کمپیوٹر کے ساتھ سی ڈی - روم ڈرائیو ضرور ہوتا ہے، کیونکہ سبھی طرح کے سوفٹ ویئر اب سی ڈی پر ہی دستیاب ہوتے ہیں۔

اسکینر (Scanner)

تصویر C-5.14 ہاتھ سے

یہ ان پٹ کا ایک ایسا آلہ ہے، جو کسی کاغذ یا ایسی ہی کسی برابر سطح پر بنی یا چھپی معلومات کو ڈیجیٹل کوڈ (Digital Codes) میں بدل کر کمپیوٹر میں بھیج سکتا ہے، جہاں اس پر مختلف کام کیے جاسکتے ہیں۔ اسکینر چار قسم کے ہوتے ہیں۔ **ہاتھ سے پکڑے جانے والے (Hand-held)، مسطح (Flatbed)، تین زاویائی (3-Dimensional) اور فلم اسکینر (Film Scanner)**۔ تصویر C-5.14 میں ایک ہاتھ سے پکڑا جانے والا اسکینر دکھایا گیا ہے۔ اسے اوپر سے پکڑ کر اس دستاویز کے اوپر دھیرے دھیرے سے کھسکایا جاتا ہے، جسے کمپیوٹر میں بھرنا ہو۔

تصویر C-5.15 فلیٹ بیڈ اسکینر

مسطح اسکینر فوٹو کاپیر کی شکل کے ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی دستاویز کی فوٹو کاپی نکالی جاتی ہے، اسی طرح ایسے اسکینر میں دستاویز کو رکھ کر اس کی امیج (Image) کمپیوٹر میں بھیجی جاتی ہے۔ اس میں جس تصویر کو اسکین کرنا ہوتا ہے، اسے نیچے کی جانب کرکے، یعنی اُلٹا رکھا جاتا ہے۔ تصویر C-5.15 میں ایک مسطح اسکینر دکھایا گیا ہے۔

کمپیوٹر نیٹ ورک (Computer Network)

جب دو یا دو سے زیادہ کمپیوٹر کو آپس میں اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کمپیوٹر کسی دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ ڈاٹا کا لین دین اور وسائل کی حصے داری کرسکتا ہے، تو اس نظام کو کمپیوٹر نیٹ ورک کہا جاتا ہے۔

تصویر C-5.16 ایک عام نیٹ ورک

کسی نیٹ ورک کے کمپیوٹر پاس پاس بھی ہوسکتے ہیں اور دور دور بھی۔ پاس پاس لگے ہوئے کمپیوٹر کو سیدھے کیبل کے ذریعے جوڑا جاتا ہے اور دور دور لگے ہوئے کمپیوٹر کو ٹیلی فون تاروں یا وائرلیس کے ذریعے بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ تصویر C-5.16 میں ایک عام کمپیوٹر نیٹ ورک دکھایا گیا ہے۔

موڈیم (Modem)

تصویر C-5.17 موڈیم

ہمارے کمپیوٹر میں جو ڈاٹا بھرا ہوتا ہے، وہ بائنری (Binary) میں ہوتا ہے، یعنی 0 اور 1 سے بنا ہوتا ہے۔ اس کو آپ عام کیبل میں ہوکر ایک کمپیوٹر سے پاس میں ہی لگے ہوئے دوسرے کمپیوٹر تک آسانی سے اور محفوظ طریقے سے بھیج سکتے ہیں لیکن اسے کافی دور لگے کمپیوٹر تک نہیں بھیجا جاسکتا۔ جب ہمیں کوئی ڈاٹا کافی دور بھیجنا ہو تو موڈیم کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

موڈیم ایک مشین ہے، جو کمپیوٹر میں بھرے بائنری ڈاٹا کو ایسے سگنل میں بدل دیتی ہے، جو ٹیلی فون تاروں سے ہوکر سیکڑوں کلومیٹر دور تک لگے ہوئے کمپیوٹر تک بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دور لگے ہوئے کمپیوٹر سے آنے والے اشاروں کو پکڑ کر انھیں بائنری ڈاٹا میں بدل دیتی ہے۔ دور دور لگے ہوئے دو کمپیوٹروں میں رابطہ قائم کرنے کے لیے دونوں کمپیوٹروں کے ساتھ ایک ایک موڈیم بھی لگایا جاتا ہے، جیسا کہ تصویر C-5.18 میں دکھایا گیا ہے۔

موڈیم کا استعمال نیٹ ورک پر مبنی متعدد کاموں میں کیا جاتا ہے، جیسے انٹرنیٹ (Internet)، الیکٹرانک میل (E-mail)، بینکنگ (Banking)، ریلوے ریزرویشن (Railway Reservation) وغیرہ۔ موڈیم کے ذریعے ڈاٹا بھیجنے اور موصول کرنے کی رفتار کلوبائٹ فی سیکنڈ (Kilobyte per Second, KBPS) میں ناپی جاتی ہے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

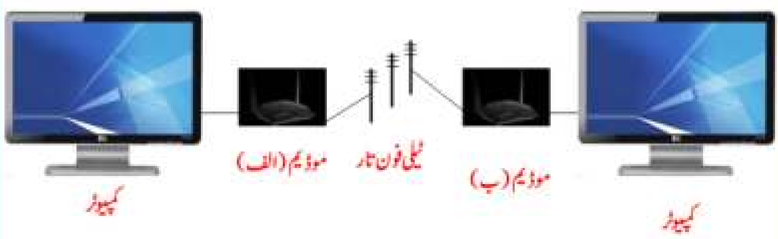

تصویر C-5.18 موڈیم کے ذریعے دو کمپیوٹر جوڑنا

ادبی کوئز

شیخ عمران

(1) رباعی کس زبان کا لفظ ہے؟
(الف) اردو (ب) عربی
(ج) فارسی (د) ترکی

(2) رباعی کا وہ مصرعہ جسے رباعی کی روح کہا جاتا ہے:
(الف) پہلا (ب) دوسرا
(ج) تیسرا (د) چوتھا

(3) رباعی میں زیادہ تر کس قسم کے مضامین قلم بند کیے جاتے ہیں؟
(الف) عشقیہ (ب) اخلاقی
(ج) تاریخی (د) سائنسی

(4) رباعی کے پہلے شعر میں ہوتا ہے۔
(الف) خیال کی ابتدا (ب) ارتقا
(ج) انجام (د) تکمیل

(5) تمام اصناف سخن میں سب سے مختصر صنف سخن ہے؟
(الف) قصیدہ (ب) مرثیہ
(ج) مثنوی (د) رباعی

(6) رباعی کا قدیم نام تھا؟
(الف) فسانہ (ب) ترانہ
(ج) ربا (د) رمل

(7) رباعی کے لیے صرف ایک بحر مختص ہے جو کہلاتی ہے۔
(الف) ہزج (ب) رمل
(ج) متقارب (د) مثمن

(8) کسے بابائے رباعی کہا جاتا ہے؟
(الف) عبدالحق (ب) عمر خیام
(ج) امجد حیدرآبادی (د) انیس

(9) رباعی کی ابتدا ہوئی ہے۔
(الف) ایران سے (ب) دکن سے
(ج) عرب سے (د) یونان سے

(10) ایک مشکل ترین صنف تسلیم کی جاتی ہے۔
(الف) رباعی (ب) مثنوی
(ج) نظم (د) غزل

(11) اکبرالہ آبادی نے اپنی رباعیوں میں کسے طنز کا نشانہ بنایا۔
(الف) غالب (ب) میرتقی
(ج) سرسید (د) اقبال

(12) کس شاعر کو کلیم الشعرائ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
(الف) امجد حیدرآبادی (ب) میرانیس
(ج) دبیر (د) اقبال

(13) شہنشاہ رباعیات کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) عمر خیام (ب) امجد حیدرآبادی
(ج) انیس (د) اکبر

(14) قصیدہ نگاری کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟
(الف) ایران سے (ب) عرب سے
(ج) یمن سے (د) ترکستان سے

(15) قصیدہ کس زبان کا لفظ ہے؟
(الف) عربی (ب) اردو
(ج) ہندی (د) فارسی

(16) قصیدہ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔
(الف) تین (ب) پانچ
(ج) چار (د) چھ

(17) قصیدہ کا پہلا جز کہلاتا ہے۔
(الف) گریز (ب) تشبیب
(ج) مدح (د) دعا

(18) قصیدہ کا باوائے آدم کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) ذوق (ب) سودا
(ج) مصحفی (د) محسن کاکوروی

(19) سودا کو قصیدہ کا نقاش اوّل کس نے کہا؟
(الف) ذوق (ب) میر
(ب) مصحفی (د) بہادرشاہ ظفر

(20) اردو میں ہجویہ قصیدہ کی بنیاد کس نے ڈالی؟
(الف) سودا (ب) ذوق
(ج) غالب (د) مصحفی

(21) انوری وخاقانی کس زبان کے قصیدہ نگار تھے۔
(الف) عربی (ب) فارسی
(ج) اردو (د) ترکی

(22) نعتیہ قصیدہ نگاری کا ایک بڑا نام کون ہے۔
(الف) سودا (ب) محسن کاکوروی
(ج) مصحفی (د) مومن

(23) مدیح خیر المرسلین کس کا لکھا قصیدہ ہے۔
(الف) مصحفی (ب) محسن کاکوروی
(ج) سودا (د) ذوق

(24) قصیدہ مدیح خیر المرسلین کس سنہ میں لکھا گیا۔
(الف) 1870 (ب) 1875
(ج) 1876 (د) 1880

(25) قصیدہ میں جس کی تعریف بیان کی جاتی ہے اسے کہا جاتا ہے۔
(الف) ممدوح (ب) مدوح
(ج) صاحب (د) اہل قصیدہ

(26) 'زہے نشاط اگر کیجیے تحریز' کس کے قصیدہ کا مطلع ہے۔
(الف) سودا (ب) ذوق
(ج) مصحفی (د) محسن

(27) محسن کاکوروی کے استاد کون تھے۔
(الف) داغ (ب) آتش
(ج) امیر مینائی (د) غالب

(28) خاقانی ہند کس شاعر کو کہا جاتا ہے۔
(الف) سودا (ب) ذوق
(ج) غالب (د) مصحفی

(29) بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو کون سا خطاب دیا۔
(الف) نقاش اوّل (ب) انوری
(ج) خاقانی ہند (د) عرفی

(30) مشہور قصیدہ نگار سودا کا مکمل نام کیا تھا؟
(الف) مرزا محمد رفیع (ب) مرزا رفیع
(ج) محمد رفیع (د) رفیع الدین

(31) پہلوانِ سخن کس قصیدہ نگار کو کہا جاتا ہے۔
(الف) مصحفی (ب) ذوق
(ج) غالب (د) سودا

(32) 'ہمارے قصائد کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے' ایسا کس نے کہا؟
(الف) شبلی (ب) حالی
(ج) آل احمد سرور (د) کلیم الدین احمد

(33) ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کس کی بن آئی
یہ کس قصیدہ نگار کا شعر ہے؟
(الف) سودا (ب) محسن کاکوروی
(ج) ذوق (د) غالب

(34) معاشی حالات کی بہتری کے لیے کس شاعر نے قصیدہ لکھا؟
(الف) غالب (ب) سودا
(ج) امجد حیدرآبادی (د) ذوق

(35) نعتیہ قصیدہ نگاری میں کس شاعر نے نام کمایا۔
(الف) ذوق (ب) سودا
(ج) محسن کاکوروی (د) نصرتی

(36) ''اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اوڑھنا اور بچھونا تھا سب بیچ بیچ کھالیا، لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔'' یہ الفاظ کس قصیدہ نگار نے خود کے متعلق کہے؟
(الف) غالب (ب) میر انیس
(ج) مصحفی (د) عمر خیام

(37) کس شاعر کے قصیدوں میں ان کے مزاج کی شکستہ حالی اور مزاج کی افسردگی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔
(الف) ذوق (ب) میر تقی میر
(ج) غالب (د) محسن کاکوروی

(38) کس قصیدہ نگار کو قصیدہ نگاری راس نہیں آئی؟
(الف) غالب (ب) میر
(ج) سودا (د) میر انیس

(39) ''نصرتی نے اپنے قصیدوں میں اس زمانے کی تاریخ قلمبند کردی ہے، تاریخ اور مثنوی کا اتنا خوبصورت اور استوار رشتہ اردو قصیدوں میں اور کہیں نہیں ملتا۔'' نصرتی کے متعلق ایسا کس نے کہا تھا؟
(الف) مولوی عبدالحق (ب) ڈاکٹر محمود الٰہی
(ج) سرسید (د) محمد حسین آزاد

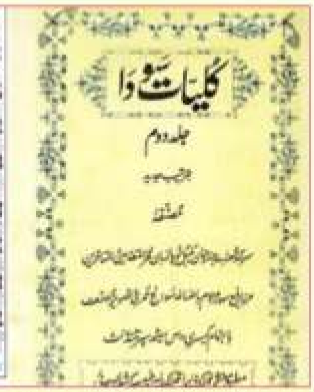

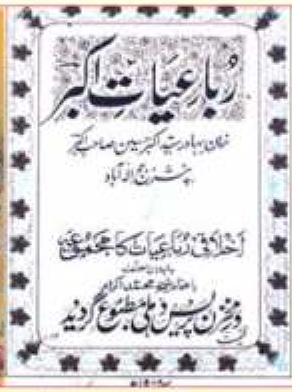

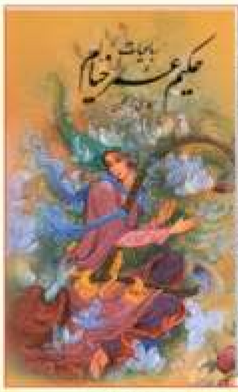

(40) قصیدہ کے زوال کا ایک اہم سبب تھا۔
(الف) شاعروں کی عدم دلچسپی
(ب) بادشاہی نظام کا خاتمہ
(ج) قدیم وفرسودہ روایات کا خاتمہ
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(41) کسی کی تعریف میں لکھا جانے والا قصیدہ کہلاتا ہے؟
(الف) مدحیہ (ب) بزمیہ
(ج) رزمیہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(42) سودا کو قصیدہ کا نقاش اول کس نے کہا ہے۔
(الف) محمد حسین آزاد (ب) عبدالحق
(ج) مصحفی (د) امیر مینائی

(43) ایسا قصیدہ جو راست ممدوح کی تعریف سے شروع ہوتا ہے، کہلاتا ہے:
(الف) خطابیہ (ب) رزمیہ
(ج) ہجویہ (د) بزمیہ

(44) کون سی صنف انگریزی زبان سے اردو میں آئی۔
(الف) مرثیہ (ب) خاکہ
(ج) مثنوی (د) غزل

(45) اردو کا پہلا خاکہ نگار کسے کہا جاتا ہے۔
(الف) مرزا رفعت اللہ (ب) مرزا فرحت اللہ بیگ
(ج) محمد حسین آزاد (د) مولوی عبدالحق

(46) اردو میں لکھا گیا پہلا خاکہ کون سا ہے؟
(الف) نذیر احمد کی یاد میں
(ب) نذیر کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی
(ج) یادِ نذیر (د) گنجے فرشتے

(47) ڈپٹی نذیر احمد اور فرحت اللہ بیگ کا کیا رشتہ تھا۔
(الف) باپ اور بیٹے کا (ب) شاگرد اور استاد کا
(ج) استاد اور شاگرد کا (د) ماموں اور بھانجے کا

(48) جس پر خاکہ لکھا جاتا ہے اُسے کیا کہتے ہیں۔
(الف) خاکہ نگار (ب) اہل خاکہ
(ج) صاحب خاکہ (د) خاکہ پوش

(49) کسے اردو کا ایک اہم خاکہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔
(الف) غالب (ب) میر تقی میر
(ج) مرزا رسوا (د) رشید احمد صدیقی

(50) خاکہ کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟
(الف) بایوگرافی (ب) اسکرپٹ
(ج) ایسے (د) اسکیچ

صحیح جوابات

1. ب	2. د	3. ب	4. الف	5. د
6. ب	7. الف	8. ب	9. الف	10. الف
11. ج	12. الف	13. الف	14. ب	15. الف
16. ج	17. ب	18. ب	19. ج	20. الف
21. ب	22. ب	23. ب	24. ج	25. الف
26. ب	27. ج	28. ب	29. ج	30. الف
31. د	32. ب	33. ج	34. الف	35. ج
36. الف	37. ب	38. الف	39. ب	40. ب
41. الف	42. ج	43. الف	44. ب	45. ب
46. ب	47. ج	48. ج	49. د	50. د

Shaikh Imran
Asst Prof Dept of Urdu
V.N.G.I.A.S.S, Civil Lines
Near RBI SQ Nagpur - 44001 (MS)

تبصرہ وتعارف

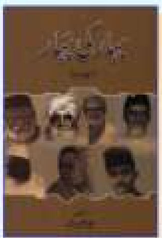

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: پروفیسر اعجاز علی ارشد

صفحات: 242، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ، بہار

'بہار کی بہار' (جلد دوم) پروفیسر اعجاز علی ارشد کا تازہ ترین ادبی کارنامہ ہے۔ اس سے قبل اسی کتاب کی پہلی جلد خدا بخش لائبریری پٹنہ سے طبع ہوکر خاصی مقبول ہو چکی ہے۔ پہلی جلد کو انھوں نے بہار کی مجوزہ ادبی تاریخ کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ یہ پروجیکٹ (اگر مکمل ہو سکا) تو ان شاء اللہ آٹھ یا دس جلدوں میں ہوگا اور اپنی تکمیل شدہ شکل میں کچھ اس نوعیت کا ہوگا کہ جلد اول و دوم میں بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے عظیم آباد کے ادیبوں وشاعروں کا تذکرہ ہوگا جبکہ جلد سوم تا دہم میں بہار کے دیگر مراکز کے شعرا و ادبا کا تذکرہ ہوگا۔ بفضلہٖ تعالیٰ توقع کے مطابق دوسری جلد تاخیر سے ہی سہی مگر بہت خوبصورت اور معیاری شکل میں سامنے آئی ہے اور یہ امید دلاتی ہے کہ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں اس کی تمام جلدیں سامنے آئیں گی اور ہم بہار میں اردو کی ایک جامع اور مکمل تاریخ سے مستفید ہو سکیں گے۔

زیر نظر پروجیکٹ ان کی علمی فتوحات کی ایک کڑی ہے جس کی دوسری جلد میں پروفیسر موصوف نے عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے بیسویں صدی کے تقریباً سو (100) ایسے شعرا و ادبا کا تعارف پیش کیا ہے جن کا ذکر کسی سبب سے پہلی جلد میں نہیں ہو سکا تھا۔ ان میں تقسیم ہند کے بعد ادبی افق پر نمایاں ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ عام طور پر ان ہی شخصیات کا انتخاب کیا گیا ہے جن کی بیسویں صدی میں یا تو کوئی تصنیف منظر عام پر آئی ہے یا جو تواتر کے ساتھ رسائل واخبارات میں لکھتے رہے ہیں۔ 95 افراد تو اس طرح شامل ہیں جبکہ آخر میں 'یہ چاند تارے بھی ہیں ہمارے' کے زیر عنوان پانچ ایسی شخصیات کا بھی ذکر ہے جن کی جائے پیدائش بہار ہی ہے، مگر بوجوہ ان کا ذکر مصنف کے وضع کردہ اصولوں کے برخلاف ہے۔ ان میں رشیدۃ النساء، یگانہ چنگیزی، مناظر احسن گیلانی، سید سلیمان ندوی اور انور عظیم کے نام شامل ہیں۔

تاریخ ادب کے تعلق سے ایسی کتابوں کی سب سے بڑی افادیت یہ ہوتی ہے کہ یہ کتب حوالہ کی کمی کو پوری کرتی ہیں۔ اردو میں سوانحی لغت کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اس لیے کسی محقق کو کسی شخص کے کوائف جاننے کی ضرورت لاحق ہو تو بڑی دشواریاں درپیش ہوتی ہیں۔ اول تو ایک جگہ سارے احوال نہیں ملتے اور ملتے بھی ہیں تو اس قدر اختلاف ماہ و سال کا شکار ہوتے ہیں کہ بے چارہ محقق ایک نئی تحقیق میں الجھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صوبوں یا دبستانوں کے تعلق سے لکھی گئی زیر تبصرہ قسم کی کتابیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ ان کو ترتیب دینے والا شخص اپنے صوبے یا دبستان سے زیادہ واقفیت کی بنا پر نسبتاً درست احوال اور ڈاٹا پیش کرتا ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے بھی اپنی کتاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ پیش کردہ ڈاٹا تحقیقی اعتبار سے معتبر ہو اور اس کے لیے انھوں نے حتی الامکان ان تمام ذرائع سے کام لیا ہے جو کتاب کو کتاب حوالہ کا درجہ دلا سکیں۔ مثلاً زیادہ تر باحیات مصنفین کی تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ''تعلیمی سند کے مطابق ان کی پیدائش فلاں تاریخ کو ہوئی۔'' یہ مصنف کی تحقیقی طریقۂ کار سے آگاہی اور احتیاط کا ثبوت ہے کیونکہ عام طور پر حقیقی تاریخ پیدائش اور تعلیمی سند کی تاریخ میں فرق پایا جاتا ہے۔ مستقبل میں اگر زیر تذکرہ ادیب اپنی حقیقی تاریخ پیدائش کا ذکر بھی کرتا ہے تو پروفیسر ارشد کا بیان غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح حروف تہجی کے اعتبار سے تذکرے کی ترتیب بھی مصنف کے احتیاط، غیر جانب داری اور طریقۂ تاریخ نویسی سے واقفیت کا اظہار ہے۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد نے دبستان عظیم آباد کی تاریخ لکھنے سے قبل اس دبستان کی تشکیل وتعمیر اور انفراد واختصاص کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی جلد میں انھوں نے اس موضوع پر شرح و بسط کے ساتھ ایک مقدمہ ہی لکھ ڈالا ہے، دوسری جلد میں بھی چند ایسے نکات کی نشاندہی کی ہے جو ان کی ناقدانہ نگاہ، وسعت نظر اور محققانہ طرز استدلال کے شاہد ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں آپ ملاحظہ کیجیے:

''دبستان عظیم آباد کی تشکیل وتعمیر سے متعلق کئی نکات پہلی جلد میں پیش کر چکا ہوں۔ یہاں ان باتوں کو دہرانے کا کوئی محل نہیں مگر چند اور وضاحتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ دبستانوں کی علاقائی تقسیم اب اختتام کی طرف جاری ہے۔ اس لیے دوسری ریاستوں کی طرح صوبۂ بہار میں بھی مختلف اسالیب یا طرز فکر کی نمائندگی کرنے والے فنکار اپنی جگہ بنا رہے ہیں مگر نثر نگاروں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد جس طرح یہاں آج بھی فعال ہے اس کو اردو زبان وادب کا فال نیک تصور کرتے ہوئے عظیم آباد کو ایک بڑا ادبی مرکز مان لینا ناگزیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلوب کی سطح پر بہرحال اس ادبی مرکز کی کچھ نہ کچھ انفرادیت رہی ہے اور اس لب و لہجے کو غیر ٹکسالی یا غیر معیاری کہہ کر نظر انداز کر دینے کی جگہ اردو کے مروجہ اسالیب کا حصہ بنا لینے میں ہی

زبان وادب کی بھلائی ہے۔ چونکہ بلاشبہ زبانیں Exclusion اور Elimination سے نہیں Inclusion سے ہی توانا اور ارتقاپذیر ہوتی ہیں۔'' (ص 13)

دوسری خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ نہ ہی محض ایک تذکرہ ہے اور نہ صرف تاریخ۔ اس میں تذکرے اور تاریخ کے ساتھ تنقید کی خوبصورت آمیزش کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ارشد بنیادی طور پر ایک صاحب نظر نقاد ہیں اس لیے مختصر تعارف میں بھی ادیب یا شاعر کے کلام یا تحریر پر تنقیدی رائے دینے سے احتراز نہیں کرتے۔ یہ رائے چند لفظوں یا چند جملوں پر مشتمل ہوتی ہے مگر اپنے اندر جہان معنی رکھتی ہے۔

پروفیسر ارشد نے متعلقہ تمام فن کاروں کو اپنی تنقید کی کھرل میں یکساں طور پر رکھا ہے اور بڑی بے باکی اور غیر جانب داری سے نتائج پیش کیے ہیں۔ ان نتائج کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نہ صرف تاریخ وتنقید کے اصولوں سے باخبر ہیں بلکہ اس کے حدود بھی ان پر آشکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر ارشد کی تازہ کتاب (دو جلدوں پر مشتمل) تاریخی اور تنقیدی بصیرت سے مالا مال ہے اور دبستان عظیم آباد کی ایک جامع اور مکمل تاریخ پیش کرتی ہے۔

کلیات اکبر الہ آبادی، جلد سوم (رباعیات وقطعات)

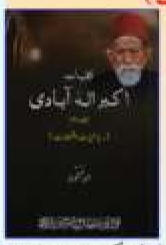

مرتب: احمد محفوظ

صفحات: 378، قیمت: 170 روپے

رابطہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: منور حسن کمال، بیت الراضیہ، G5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

اکبرالہ آبادی کی فکری بصیرت سے پُر طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا ایک زمانہ دلدادہ رہا ہے۔ جب کوئی اکبر کی شاعری کا جائزہ لیتا ہے تو علی الخصوص اس بات کا خیال ضرور رکھتا ہے کہ اکبر کی شاعری کا نہج تبدیل نہ ہوجائے۔ اکبر نے اپنی ظریفانہ شاعری سے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری سے قوم کی سوچ کو بیدار کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ کہیں قوم کی آخری میراث اور سہارا 'ایمان' بھی برطانوی سامراج کے مکروفریب میں الجھ کر اپنی قوت ایمانی نہ کھودے۔

اکبرالہ آبادی تعلیم کے زبردست مؤید تھے۔ وہ قوم کے ہر نوجوان کو تعلیم کے رتھ پر سوار دیکھنا چاہتے تھے۔ اکبرالہ آبادی کے یہاں قوم کے تعلیمی نتائج پر شاعری کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں اگر اکبرالہ آبادی کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو اُن کے بہت سے اشعار آج کے دور کے حالات پر ناصحانہ یا ناقدانہ طنز سے مملو نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات پر غوروفکر کی بھی ضرورت ہے کہ اکبر کی فکری بصیرت سے جو لوگ متاثر ہوئے انھوں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مادّی وسائل کی ریل پیل نے باپ بیٹے میں جو دوری پیدا کردی ہے وہ دور ہو اور حصول کا جلوہ برقرار رہے۔

پیش نظر کتاب کلیات اکبرالہ آبادی، جلد سوم، رباعیات وقطعات پر مشتمل ہے۔ اس کے مرتب معروف محقق اور شاعر ڈاکٹر احمد محفوظ ہیں۔ اُن کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ اردو سے ہے۔ احمد محفوظ معتبر ناقد اور جدید شاعر کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شعروادب کے میدان میں اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے انھیں گہرا شغف ہے۔ انھوں نے اکبرالہ آبادی کی رباعیات وقطعات کو سنوار کر پیش کرنے میں حتی المقدور کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے۔

اکبرالہ آبادی کے کلام کی ترتیب وتدوین میں احمد محفوظ نے خصوصیت سے اس بات کا التزام رکھا ہے کہ تمام غزلیں ردیف وار شائع کی جائیں۔ فردیات جو گزشتہ حصے میں شامل ہیں اُن میں بھی یہی اہتمام کیا گیا تھا۔ اب تیسری جلد جو رباعیات و قطعات پر مشتمل ہے اُس میں بھی وہی التزام پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ قاری کو کسی ردیف کا کوئی شعر تلاش کرنا ہے یا کوئی قطعہ، رباعی تلاش کرنی ہے تو وہ اُسے فوراً مل جائے گی اُسے تمام جلدوں کے صفحات کھنگالنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ڈاکٹر احمد محفوظ نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ متن کی اغلاط سے پاک کلام شائع کیا جائے۔ ورنہ پرانے اور قدیم نسخوں میں کہیں کہیں متن کی اغلاط نے قاری کو اُلجھن میں مبتلا کردیا ہے۔ کلیات اکبر کی ان جلدوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان میں اردو کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی اکبرالہ آبادی کے کلام کو شائع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جہاں آج اردو کے پڑھنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں ہیں وہیں دیوناگری رسم الخط میں بھی شاعری پڑھنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ اُن کے قطعات و رباعیات کے چند نمونے پیش ہیں:

بدبو مرے گھر میں نہ اے شرابی پھیلا — ہے تیرا دہن نجاستوں کا تھیلا
ہر لحظہ طلب شراب کی ہے تجھ کو — ہر دم تیرے منھ سے نکلتا ہے 'مے لا'

آخری مصرعہ میں اکبرالہ آبادی نے تھیلا کے ساتھ 'مے لا' کو باندھ کر ایک جدّت پیدا کی ہے یقیناً یہ انھیں کا حق ہے۔ قوم کے بچوں کے نام انھوں نے کئی جگہ بہت سادہ اور دلکش استعاروں میں مثبت پیغام دینے کی کوشش کی ہے:

تحصیل علوم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت — محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی

اکبرالہ آبادی نے مذہب کے سلسلے میں بہت سے اشعار، رباعیات اور قطعات قلم بند کیے ہیں، اور اپنی بات کو ثابت بھی کیا ہے۔ درج ذیل قطعہ دیکھیں:

جو ہم کو برا کہتے ہیں معذور ہیں اکبر — حق یہ ہے کہ ہم بھی انھیں اچھا نہیں کہتے
ہم حضرت عیسیٰ کا ادب کرتے ہیں بے حد — لیکن انھیں اللہ کا بیٹا نہیں کہتے

اُمید ہے کہ اکبرالہ آبادی کے سابقہ کلیات، جلد اوّل اور جلد دوم کی طرح کلیات سوم، رباعیات اور قطعات کا بھی اس کے شایانِ شان استقبال کیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ھیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ھیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

سرسید شناسی

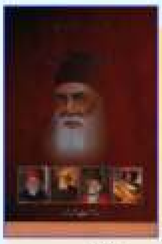

سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین

مصنف/ ناشر: راحت ابرار
صفحات: 104، قیمت: 150 روپے
مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8
شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

سرسید احمد خاں (پ: 17 اکتوبر 1817 و: 28 مارچ 1898) کے تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور سماجی افکار اور علمی امتیازات سے دنیا کا ایک بڑا حصہ واقف ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی جیسی بڑی زبانوں میں بھی ان کے تعلق سے تھوڑا بہت مواد موجود ہے۔ ان کا شمار انیسویں صدی کی اہم شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید کے تعلق سے اردو میں بہت سی کتابیں، مقالے اور رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں اور آج بھی تفہیم سرسید کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں ملیالم، تمل، تیلگو، مراٹھی، بنگلہ، کنڑ، اڑیہ، گجراتی اور ڈوگری وغیرہ وغیرہ میں سرسید پر کتنا مواد ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سرسید احمد خان کے دو سو سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے بھی کچھ کتابیں اور رسالے حالیہ دنوں میں شائع ہوئے ہیں جن میں سہ ماہی 'فکر و نظر' علی گڑھ کا سرسید نمبر اور راحت ابرار کی کتاب 'سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین' قابل ذکر ہیں۔

راحت ابرار کو افکار سرسید سے خصوصی شغف ہے اور اس تعلق سے ان کے مضامین ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تازہ ترین کتاب میں سرسید کے اہم معاصرین کو اپنا محور و مرکز بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں کچھ غیر مسلم معاصرین کو بھی شامل کیا ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے سرسید کے شدید نظریاتی اختلافات بھی رہے ہیں مگر سرسید کے شخصی تعلقات پر ان کا اثر نہیں پڑا۔ یہ سرسید احمد خان کی کشادہ نظری اور وسعتِ ظرفی تھی کہ انھوں نے ان اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اپنے ہم عصر دانشوروں کے بارے میں کلماتِ خیر ہی کہتے رہے۔

اس کتاب میں تقریباً 16 معاصرین کا ذکر ہے جن میں گارساں دتاسی، راجہ رام موہن رائے، دادا بھائی نوروجی، سر سریندر ناتھ بنرجی، کیشب چندر سین، سوامی دیانند سرسوتی، لالہ لاجپت رائے، راجہ شیو پرساد، بھارتیندو ہریش چندر، راجہ شمبھو نرائن، راجہ جے کشن داس، مرزا اسداللہ خاں غالب، اکبر حسین اکبر الہ آبادی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مرزا غلام احمد قادیانی جیسی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔

راحت ابرار نے ان تمام معاصرین کے حوالے سے تفصیلات درج کی ہیں اور ان کے امتیازات سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے ممتاز فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے ہی سب سے پہلے سرسید کی اہم تصنیف 'آثار الصنادید' کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک گارساں دتاسی کا علی گڑھ سے گہرا رشتہ تھا۔ انھوں نے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں بھی بہت مثبت رائے دی ہے۔

سرسید کے ایک اہم معاصر راجہ رام موہن رائے بھی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ستی کی رسم کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے مغلیہ دربار سے وابستہ تھے اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سفیر بن کر انگلینڈ بھی گئے تھے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور سنسکرت پر اچھی نظر رکھنے والے راجہ رام موہن رائے نے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ سرسید سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ دونوں میں قدرِ مشترک بات تھی کہ اصلاحی تحریک کے لیے جہاں سرسید نے تہذیب الاخلاق کا سہارا لیا وہیں راجہ رام موہن نے بھی صحافت کو اپنا ذریعہ بنایا۔

دادا بھائی نوروجی بہت معروف سیاست داں تھے۔ انگلینڈ کی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہونے والے یہ پہلے ہندوستانی تھے۔ ان کا بھی سرسید سے بہت گہرا رشتہ تھا۔ سرسید نے ان کا علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا تھا۔ باوجودیکہ دادا بھائی نوروجی کانگریس کے صدر تھے اور سرسید کانگریس کے شدید مخالف تھے مگر دادا بھائی نوروجی سرسید کو مکمل طور پر محبِ وطن اور راشٹر وادی سمجھتے تھے۔

سر سریندر ناتھ بنرجی کلکتہ میں انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ راشٹر گرو کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اور سرسید احمد خان کے درمیان بڑے اچھے روابط تھے۔ سرسید نے انھیں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں مدعو بھی کیا اور بنرجی بھی سرسید کی علمی خدمات کے معترف تھے۔

سرسید کے ایک معاصر کیشب چندر سین بھی تھے جو برہمو سماج کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ برٹش حکومت کے وفادار اور برٹش سرکار کو قدرت کا نایاب تحفہ سمجھتے تھے۔ سرسید نے بابو کشیب چندر کی بھی بہت تعریف کی ہے کہ انھوں نے فرسودہ رسوم کی پابندی کو توڑا اور اپنی قوم کی مخالفت سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ان کے انتقال پر بھی سرسید نے تعزیتی شذرہ لکھا جس میں ان کی قابل قدر خدمات کو سراہا۔ کیشب چندر سین بھی سرسید کو ہندوستان کا جاں نثار تسلیم کرتے تھے۔

سوامی دیانند سرسوتی سے بھی سرسید کے بڑے گہرے مراسم رہے ہیں جبکہ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی ہی وہ شخصیت تھی جس نے ستیارتھ پرکاش جیسی کتاب تحریر کی جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی لیکن سرسید نے ان کی موت پر بھی بہت اچھے کلمات کہے اور انھیں نیک اور درویش صفت آدمی قرار دیا۔

لالہ لاجپت رائے جو پنجاب کیسری کے نام سے معروف تھے۔ ان کے والد عربی فارسی کے معلم تھے اور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی تحریروں کے شیدائی تھے۔ لالہ لاجپت رائے کے والد منشی رادھا کرشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک مولوی استاد کے بلند کردار کو دیکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے کانگریس کی تحریک سے وابستہ تھے لیکن سرسید کے تئیں اچھے خیالات رکھتے تھے۔

راجہ شیو پرساد اردو، ہندی، سنسکرت اور فارسی کے ممتاز عالم اور دانشور ہی نہیں بلکہ اردو کے ایک اہم شاعر تھے۔ ان کا تخلص وہبی تھا اور ان کا مجموعہ 'کلیاتِ وہبی' کے نام سے شائع بھی ہوا ہے۔ سرسید سے ان کے بہت ہی اچھے مراسم تھے۔ یہ اور بات کہ اردو ہندی تنازعے کی وجہ سے دونوں کے درمیان اختلافات بھی تھے۔ سرسید احمد خان نے ورنا کولر یونیورسٹی کی جب بات کی تھی تو راجہ شیو پرساد نے ہی اس کی مخالفت کی تھی اور انھوں نے ہی اتہاس تمر ناشک جیسی کتاب بھی تحریر کی تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی سے فرقہ پرستی کی بنیاد پڑی اور علاحدگی پسندی کے رجحان کو فروغ ملا۔ شیو پرساد نے آئینہ تاریخ نما کے عنوان سے اس کا اردو ایڈیشن بھی شائع کیا۔ یہ سرسید احمد خان کے بڑے مخالف تھے۔ ہر موقعے پر انھوں نے سرسید کی مخالفت کی مگر جب راجہ شیو پرساد کا انتقال ہوا تو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور یہ لکھا کہ ایسے مشہور اور نامی لوگوں کا دنیا سے اٹھ جانا بلاشبہ افسوس و رنج کا مقام ہے۔

بھارتیندو ہریش چندر بھی ایک مشہور شخصیت ہیں جنھیں جدید ہندی نثر کا معمار کہا جاتا ہے۔ اردو میں ان کا تخلص 'رسا' تھا۔ یہ ہندی ادب کی نہ صرف اہم شخصیت ہیں بلکہ یہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے قلم کاروں میں بھی شامل تھے۔ ان کا ایک مضمون 'ہندوؤں کی قانونی

وراثت' کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی شائع ہوا۔ یہ بھی اردو ہندی تنازعے میں سرسید کے مخالف ہوگئے جبکہ سرسید چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج میں سنسکرت اور ہندی کی تدریس کی خدمات بھارتیندو ہریش چندر ہی انجام دیں لیکن انھوں نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ راحت ابرار نے ان کے تعلق سے ایک بہت اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جدید ہندی نثر میں سادہ زبان لکھنے کا جو اسلوب اختیار کیا وہ سرسید کی اردو نثر سے تاثر کا نتیجہ تھا۔

راجہ شمبھو نرائن سنگھ سے سرسید کے بہت اچھے مراسم رہے ہیں۔ جب سرسید بنارس میں تھے تو ان سے مراسم اور گہرے ہوگئے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے سنگ بنیاد کی تقریب میں راجہ شمبھو نرائن بھی موجود تھے اور اس میں انھوں نے مدد بھی کی تھی۔ انھوں نے اپنے والد دیو نرائن سنگھ کی یاد میں پندرہ سو روپے کا عطیہ دے کر ایک بورڈنگ ہاؤس بھی بنوایا۔ ایم او کالج کی چہار دیواری پر ان کا نام کندہ ہے۔ غازی پور کے اسکول کا سنگ بنیاد بھی راجہ دیو نرائن سنگھ نے ہی رکھا تھا۔ سرسید سے ان کا رشتہ آخری وقت تک قائم رہا۔

راجہ جے کشن داس بھی انہی شخصیتوں میں ہیں جو سرسید سے نہ صرف قربت رکھتے تھے بلکہ سرسید کی سائنٹی فک سوسائٹی سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے بھی سائنٹی فک سوسائٹی کی عمارت کے لیے عطیہ دیا۔ ان کا نام بھی کتبے میں درج ہے۔ سرسید کو ان سے بڑی محبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کی رسم راجہ جے کشن داس کی گود میں بٹھا کر ہی ادا کی۔ اتنی قربت کے باوجود اردو ہندی لسانی تنازعے کو لے کر دونوں میں اختلافات بڑھ گئے تھے۔ خاص طور پر ہنٹر کمیشن میں انھوں نے بھی ہندی والوں کا ہی ساتھ دیا۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود راجہ جے کشن داس کے انتقال پر نہ صرف مدرسۃ العلوم میں ایک دن کا سوگ منایا گیا بلکہ ایم او کالج میں چھٹی کا اعلان بھی کیا گیا۔ انہی کی یاد میں ایک ہاسٹل سلیمان ہال میں تعمیر کیا گیا۔

ان غیر مسلم معاصرین کے علاوہ راحت ابرار نے غالب، اکبر الہ آبادی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مرزا غلام احمد قادیانی کے تعلق سے بھی کچھ تفصیلات درج کی ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے سرسید کے مراسم بہت اچھے تھے۔ سرسید احمد خان نے جب 'آئین اکبری' ترتیب دی تو غالب سے بھی انھوں نے تقریظ لکھوائی مگر سرسید نے اس تقریظ کو اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔

اکبر الہ آبادی کا شمار سرسید احمد خان کے مخالفوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کو اپنی تنقید کا نشانہ بھی بنایا مگر علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوران اکبر بھی سرسید کے مشن سے متاثر ہوئے اور انھوں نے سرسید کی کوششوں کو سراہا مگر ان کے مغرب زدہ خیالات کو کبھی قبول نہیں کیا۔

مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید دونوں ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے دونوں میں بڑی قربت تھی مگر سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی میں نظریاتی اختلافات تھے۔ اس کے باوجود سرسید مولانا قاسم نانوتوی کی علمی عظمتوں کے معترف تھے۔ انھوں نے اپنے تعزیتی نوٹ میں لکھا تھا کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے بھی سرسید کے اچھے مراسم تھے جبکہ وہ بھی علی گڑھ مدرسے کی مالی معاونت پر سخت تنقید کرتے تھے اور سرسید کے نظریات سے انھیں اختلاف بھی تھا۔ مگر مولانا کے انتقال پر انھوں نے بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی بھی سرسید احمد خان کے ہمعصر تھے لیکن ان کے مذہبی افکار و نظریات سے کبھی متفق نہیں ہوئے۔ ایم او کالج کے لیے انھوں نے بلا اختلاف مذہب و مسلک چندے کی درخواست کی تھی اور مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی اس میں شامل کیا تھا۔

سرسید احمد خان نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ''ان کے بارے میں زیادہ کد و کاوش فضول ہے''۔ سرسید نے ہمیشہ علم کی قدر کی اس لیے تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ اہل علم و دانش کی قدر کرتے رہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان ایک وسیع النظر شخص تھے۔ انھوں نے اپنے مخالفین کی خدمات کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا جبکہ آج ذرا سے اختلاف کی بنیاد پر لوگ اپنے معاصرین کا ذکر خیر تو کیا ان کے نام و نشان کو بھی مٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

سرسید کے دو سو سالہ جشن ولادت کے موقعے پر راحت ابرار کی یہ کتاب ایک بہترین خراج عقیدت ہے۔ شافع قدوائی کے اس خیال سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ''یہ کتاب سرسید شناسی کا ایک نیا باب وا کرتی ہے۔''

تحقیق و تنقید

خسرو اقلیم سخن (امیر خسرو)

مصنف: ڈاکٹر عبداللطیف حیدری

صفحات: 260، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی ڈی ایل ایف کالونی غازی آباد

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

امیر خسرو ایسے ہی دیدہ ور ہیں جو صدی میں نہیں بلکہ ہزاروں سال میں پیدا ہوتے ہیں۔ خسرو ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔ ان پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف حیدری کی کتاب 'خسرو اقلیم سخن' بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ جس میں مصنف نے خسرو کی شخصیت کے کچھ مخفی گوشوں کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

تاہم ایک ایسا موضوع جس پر بہت سی کتابیں آچکی ہوں، اس میں ایک نئے پہلو کو تلاش کرنا واقعی دشوار کن مرحلہ ہے لیکن عبداللطیف صاحب نے کافی حد تک اپنے موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور خسرو کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی ہے۔ اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب سوانحی خاکہ ہے، جس میں مصنف نے خسرو کے سوانحی کوائف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حیات و شخصیت کے مختلف گوشوں اور رفتار زمانہ سے نبرد آزما گونا گوں کیفیتوں کا جائزہ معاصر تاریخ کی روشنی میں لینے کی کوشش کی ہے۔ خسرو کے اباء و اجداد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جائے پیدائش کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے اور مشہور ناقدین کی آراء سے بحث کرتے ہوئے ان کی جائے پیدائش یو پی کو قرار دیا ہے اور خسرو کی پیدائش 652ھ بمطابق 1254 بتائی ہے۔

دوسرا باب امیر خسرو کی شاعرانہ حیثیت اور ادبی کمالات پر محیط ہے، جس کے تحت خسرو کو قادر الکلام اور مجمع صفات ثابت کرنے کے لیے جہاں مصنف نے ہندوستان کے بڑے بڑے محققین و ناقدین عبدالماجد دریابادی، پروفیسر نور الحسن انصاری، شبلی نعمانی اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے بیان کو کوڈ کیا ہے وہیں ایرانی محققین، ادبا اور شعرا سعید نفیسی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، مشہور شاعر ظہوری اور حافظ کے ان بیانات کو بھی درج کیا ہے۔ جس میں ان حضرات نے خسرو کی ہمہ جہت شخصیت کا لوہا مانا ہے۔ مصنف نے خسرو کی ان تمام خوبیوں پر بھی گفتگو کی ہے، جو انھیں ایک مسلم الثبوت استاذ ایک ممتاز ادیب، ایک با کمال شاعر کے مقام پر فائز کرتی ہیں۔

تیسرا باب 'امیر خسرو کی تخلیقات ایک سماجی و تاریخی دستاویز' ہے جس میں مصنف نے خسرو کی تخلیقات سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ سماجی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب کی ابتداء میں خسرو کی مثنویوں مثنوی قران السعدین، مثنوی مفتاح الفتوح، مثنوی دول رانی وخضر خان، مثنوی نہ سپہر اور مثنوی تغلق نامہ کا ذکر کیا ہے اور مثنوی کی مختصراً کہانی بھی بیان کی ہے اور کس عہد میں لکھی گئی اس کی معلومات بھی فراہم کی ہے۔ مذکورہ مثنویات کے علاوہ ان مثنویات پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو خسرو نے نظامی گنجوی کے جواب میں 'خمسہ امیر خسرو' کے نام سے تحریر کی ہیں۔ ان میں نظامی کی مثنوی 'مخزن الاسرار' کے جواب میں لکھی گئی خسرو کی مثنوی 'مطلع الانوار'، نظامی کی مثنوی 'خسرو شیریں' کے جواب میں 'شیریں خسرو'، نظامی کی مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' کے جواب میں لکھی گئی مثنوی 'مجنوں لیلیٰ'، 'سکندر نامہ' کے جواب میں تحریر کی گئی مثنوی 'آئینہ سکندری' اور پیکر مثنوی 'ہفت بہشت' کے جواب میں قلم بند کی گئی خسرو کی مثنوی 'ہشت بہشت' کی خصوصیات سے بھی قاری کو روشناس کرایا ہے اور کون سی مثنوی کتنے اشعار پر مشتمل ہے اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مصنف نے خسرو کے پانچوں دواوین 'تحفۃ الصغر'، 'وسط الحیات'، 'غرۃ الکمال'، 'بقیہ نقیہ' اور 'نہایت الکمال' پر بھی طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اور کون سے دیوان میں کتنی غزلیں، کتنی رباعی، کتنے قصیدے اور کتنے قطعات وغیرہ ہیں پر بھی بات کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف خسرو کے چوتھے دیوان 'بقیہ نقیہ' کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: ''اس میں غزل، قطعہ، رباعی کے علاوہ قطب الدین مبارک شاہ، الماس بیگ اور تاج الدین دبیر کے نام قصیدہ کے علاوہ دیگر مباحث پر کل 63 قصیدے شامل ہیں۔ دیوان میں شامل رمضان اور عید سے متعلق مضمون سے اس عہد کی تمدنی، معاشرتی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔''

خسرو کی نثری تخلیقات 'اعجاز خسروی'، 'خزائن الفتوح یا تاریخ علائی' اور 'افضل الفوائد' کا بھی تعارف پیش کیا ہے اور علم موسیقی اور ہندوی شاعری پر خسرو کی دسترس کو بھی ظاہر کیا ہے۔

چوتھا باب 'امیر خسرو کا فکر و فن (دواوین کے تناظر میں)' ہے جس کے تحت مصنف نے خسرو کی جوانی سے لے کر عمر کے آخری پڑاؤ تک کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ خسرو کے پانچوں دواوین میں شامل غزلیات، قطعات، ترجیعات، رباعیات اور قصائد کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے بعد پانچویں دیوان 'نہایت الکمال' کی شاعری کو زیادہ پختہ قرار دیا ہے۔ مصنف نے خسرو کے ان قصائد کو ادبی نقطۂ نگاہ سے کمزور بتایا ہے جو انھوں نے امراء و سلاطین کی مدح سرائی میں تحریر کیے ہیں لیکن ان کی سماجی اور تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا ہے۔ خسرو کی شاعری میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلی کا ذکر بھی بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے اور خسرو کی شاعری کے فنی و فکری امتیازات کو بھی اجاگر کیا ہے۔

عبداللطیف نے خسرو کے دواوین سے کچھ غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ جس طرح سے مصنف نے خسرو کی دیگر تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اگر پہیلیوں کا ذکر بھی تفصیل سے ہوتا تو اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی۔ یوں تو مصنف نے خسرو کی شاعری اور حالات زندگی کی عکاسی کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے لیکن اکثر مقامات پر تذکیر و تانیث اور واحد جمع کی غلطیوں نے عبارت کو بوجھل کر دیا ہے۔ مثال کے طور:

(1) اس سفر میں خسرو کا دوست مشہور شاعر حسن سنجری بھی ان کے ہمراہ تھے۔

(2) خسرو کی حیثیت ہر دور میں اہمیت کا حامل رہی۔

(3) ان پر ایک اور ہی دھن سوار تھا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 'خسرو اقلیم سخن' ایک اہم کتاب ہے۔ توقع ہے کہ یہ امیر خسرو پر تحقیقی کام کرنے والوں اور طالب علموں کے لیے ایک اہم کتاب ثابت ہوگی اور خسرو کی زندگی سے متعلق تشنہ پہلوؤں کی طرف قارئین کی نگاہ مرکوز کرنے میں کامیاب رہے گی۔

جدید شاعری کی مستحکم آواز شہریار

مصنف: محمد شاہد صدیقی علیگ

صفحات: 336، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت 2016

ناشر: آل انڈیا اردو تعلیمی گھر، لکھنؤ، یوپی

مبصر: صبا عنبرین، 5078، پھاٹک باز، حوض قاضی، دہلی 6

یہ کتاب مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی نے 2007 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی اب کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ مصنف نے نہ صرف شہریار کی غزلوں اور نظموں کا جائزہ پیش کیا ہے بلکہ انھوں نے شہریار کی مفصل سوانح حیات بھی پیش کی ہے جس سے شہریار کی تفہیم کے نئے در وا ہونے کی امید نظر آتی ہے۔ یہ کتاب مصنف کی عرق ریزی اور تحقیقی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے جو ادب کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

جدید شاعری کی بنیاد مغرب کے زیر اثر محمد حسین آزاد اور حالی نے رکھی تو اقبال نے اسے فکر و فلسفہ سے استحکام بخشا۔ اسی دور میں حسرت، فانی، اصغر، فراق، جوش، اور اختر شیرانی نے رومانی طرز تکلم اختیار کرتے ہوئے اپنے جمالیاتی نظریہ کو پیش کیا تھا۔ ان میں بعض کے یہاں انقلابی گونج ہے اور کسی کے یہاں یاسیت اور محرومی دکھائی دیتی ہے۔

1935 میں مارکسی انقلاب کے زیر اثر ترقی پسند نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ غزل میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس عہد میں فیض، مجاز، مجروح، ساحر، اور جاں نثار اختر نے غزل کو نیا آہنگ عطا کیا، جو موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی دوران تقسیم ہند کے بعد پیش آنے والے مسائل نے غزل کو نیا موڑ دیا۔ اس عہد میں جو لوگ ہندوستان اور پاکستان کے تئیں رواداری اور برادرانہ جذبہ رکھتے تھے انھیں ملک گیر سطح پر سیاسی تفریق نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بعض لوگوں کو حالات کے بموجب پاکستان جانا پڑا جبکہ ان کا دل ہندوستان میں تھا ایسے حالات میں انھوں نے اپنے وجود کو کھویا ہوا محسوس کیا اور وطن کی کسک کو اپنی شاعری میں اجاگر کیا۔ بالخصوص ناصر کاظمی اس دور میں اہم مثال کی طرح سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی ناصر کے نقش قدم پر چل کر کلاسیکی روایات کو استوار کیا۔ کلام ملاحظہ ہو:

اہل وفا کو شوق شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

آج ان پیڑوں کا سایہ ہو گیا ہم پر حرام
کل جنھیں سینچا تھا ہم نے آنسوؤں کی نہر سے

اس روایات کی بھرپور عکاسی اس دور میں نرم لہجے کے حامل شاعر شہریار کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں تک اس عہد میں ترقی پسند نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اقدار کو برتنے کا تعلق ہے تو شہریار نے اس ضمن میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ جتنے ترقی پسند ہیں اس سے زیادہ جدیدیت کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ طبیعتاً مارکسزم کے علمبردار ہیں تو اس لیے انھیں ترقی پسند اور جدیدیت کی بیچ کی کڑی کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جمالیاتی قدروں کی جہاں پاسداری ہے وہاں سلیس زبان میں عوامی مسائل کا تذکرہ بھی ہے۔

ان میں عوامی مسائل کا تذکرہ بھی ہے۔ وہ جس قدر شاعرانہ انفرادیت کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی قدر سرمایہ فطرت کی حفاظت کرنے کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ جہاں ان کے یہاں نرم لب و لہجہ نمایاں ہوتا ہے وہاں وہ استفہامیہ اور استعجابی انداز اختیار کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ شہریار اپنی غزلوں اور نظموں میں جدت طرازی کو پیش نظر رکھتے ہیں تاہم ان کے کلام میں تکرار بہت ہے جو ابتدا سے انتہا تک برقرار رہتی ہے اور بعض اوقات ان کی فنی اقدار کے تعین میں پریشانی کا باعث بنتی ہے۔

اس کتاب کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ شہر یار کی شاعری کو ان کے معاصرین کے شاعرانہ کلام اور ان کے کلام کے محاسن کے تقابلی موازنے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے نہ صرف شہر یار کی شاعری بلکہ اس پورے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملے گی جہاں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں ہی اپنی اپنی بقا کے لیے سرگرداں نظر آتی ہیں۔

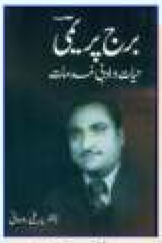

برج پریمی : حیات وادبی خدمات

مرتب: ڈاکٹر پریمی رومانی
صفحات: 192، قیمت: 400 روپے
ناشر: رچنا پبلی کیشنز، تیمپیا 1/3 نصیب نگر جانی پور جموں توی
مبصر: سعید اختر اعظمی

چار دہائی قبل جب تحقیق کے لیے مواد کی یکجائی عہد حاضر کی طرح سہل نہ تھی ایک کشمیری نوجوان نے متنازعہ افسانہ نگار کے فن و شخصیت کو، ہم وطن ہونے کے سبب، موضوع بنایا کہ وہ کشمیری النسل تھا اور اسے اپنے کشمیری ہونے پر فخر بھی تھا۔ یہ متنازعہ افسانہ نگار تھا سعادت حسن منٹو اور اُس پہ تحقیق کرنے کا بیڑا برج پریمی نے اٹھایا تھا۔ یہ مقالہ تلاش و تحقیق کے مرحلے سے گزرتا ہوا 1976 میں برج پریمی کو ڈاکٹر کے اعزاز سے سرفراز کر گیا۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اسے قارئین تک پہنچنے میں بھی دس سال لگ گئے۔ تب تک کتنے ہی رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہو چکے تھے اور منٹو شناسی کا نیا باب قائم ہو چکا تھا۔ انھوں نے منٹو پر اپنی تحقیق کی بعض نئی جہات کو اپنی دوسری کتاب 'منٹو کتھا' میں پیش کیا۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر قمر رئیس نے یہ اعتراف کیا کہ منٹو پر ایسی جامع کتاب اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی اور ناول نگار کشمیری لال ذاکر اپنے ایک درجن ناولوں کو قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔

'برج پریمی: حیات وادبی خدمات' ڈاکٹر پریمی رومانی کی اپنے والد محترم کے فن کے حوالے سے ترتیب دی گئی دوسری کتاب ہے۔ 'برج پریمی: شخصیت اور فن' تیرہ سال قبل منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں برج پریمی (برج کرشن ایمہ ولادت: 1935، وفات 1990) کے انتقال کے بعد 16 مضامین، افسانوں کا جائزہ، تصانیف پر گفتگو اور تعزیتی قرارداد کی شمولیت تھی۔ حالیہ کتاب میں سابقہ حوالوں کو مزید استحکام بخشا گیا ہے۔ شخصیت وفن، منٹو، مشاہیر ادب کے خطوط، مضامین کشمیر، تحقیق وتنقید، فکشن نگاری اور خاکہ نگاری پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں یہاں جمع کردی گئی ہیں۔ فن و شخصیت کے تحت پروفیسر محمد اسداللہ وانی، حمیدہ معین رضوی، دیپک بدکی اور ڈاکٹر چمن لال بھگت نے اظہار خیال کیا ہے۔ برج پریمی نے فرضی نام 'ییگ دیپ' سے ایک روزنامہ میں مستقل کالم 'قاشیں' لکھا جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ انھوں نے پروفیسر عبدالقادر سروری کے ساتھ مل کر اہم پروجیکٹ پر کام کیا جو تین حصوں پر مشتمل 'کشمیر اور اردو' کے نام سے بالغ نظر قارئین کے روبرو ہوا۔ اس پروجیکٹ کے دوران انھیں کشمیری ادبا و مشاہیر سے ملنے اور اُن کی صحبت میں رہ کر تحقیق کے اسرار و رموز سیکھنے کا موقع ملا۔

'سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے' اور 'منٹو کتھا' منٹو شناسی کے دو پہلو ہیں جن پر برج پریمی نے خاطر خواہ تحقیق کی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، مظہر امام، محمد ایوب واقف، ڈاکٹر چمن لال بھگت اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریریں شامل کتاب ہیں۔ جب اس موضوع پر کتاب کی اشاعت ہوئی تھی تو یقیناً اسے حرف آخر کا درجہ حاصل تھا۔ عہد حاضر میں جب کہ تحقیق ہفت افلاک کے کناروں کو چھو رہی ہے پھر بھی اس کو بنیادی درجہ دینے کے سبب اسے قطعاً فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ منٹو نے آسکر وائلڈ کے ڈرامہ 'ویرا' کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کا موضوع اشتراکیت ہے۔ منٹو نے 'بغیر عنوان کے' نام سے ایک ناول لکھا تھا جو بعد میں کسی اور نام سے شائع ہوا۔ 'تکلیف' نامی ناول چند ابواب تک لکھا گیا جو تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی تحریر میں انکشاف کیا ہے کہ جب 1991 میں جگدیش چندر ودھاون کی کتاب 'منٹو نامہ' اُن کے ہاتھ لگی اور اس کا مطالعہ انھوں نے کرنا شروع کیا تو ایسا لگا جیسے یہ تحریر کچھ مانوس سی ہے۔ جب انھوں نے برج پریمی کی 'سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے' کے اوراق کھنگالے تو علم ہوا کہ یہ تو حرف بہ حرف اسی کی نقل ہے۔ اس سرقہ عظیم پہ جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

'مشاہیر ادب کے خطوط برج پریمی کے نام' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اور پروفیسر قدوس جاوید کے تاثرات ہیں۔ ان خطوط کی حیثیت غالب یا ابوالکلام کے خطوط جیسی نہیں ہے۔ برج پریمی نے جن اہل ادب کے نام مراسلات لکھے ان کا مقصد منٹو سے متعلق معلومات کا حصول تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کے ایک خط میں یہ وضاحت موجود ہے۔ 'منٹو افسانہ نویس بہت بڑا تھا، لیکن اس کا ایک بھی ڈرامہ اے ون نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ افسانے پر بہت محنت کرتا تھا، ڈرامہ تو وہ سیدھا ٹائپ کر دیتا تھا۔ منٹو ہر ہفتے ڈرامہ لکھتا تھا۔ صبح ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھتا تھا اور شام تک ایک ڈرامہ ٹائپ کر دیتا تھا۔ منٹو کے ڈرامے بھی اسٹیج نہیں کیے جاتے تھے۔' عبدالقادر سروری نے اپنے خط میں انکشاف کیا ہے کہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں منٹو کے ڈرامائی مضامین کے مجموعے کا ایک نسخہ موجود ہے جس کا عنوان 'جنازے' ہے۔ اس میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ چنگیز خاں کی موت، تیمور کی موت، قلوپطرہ کی موت، نپولین کی موت، بابر کی موت، شاہ جہاں کی موت، ٹیپو کی موت، راسپوٹین کی موت۔

'کشمیریات' پر ڈاکٹر پریمی رومانی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، شاہباز راجوری اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ برج پریمی کو کشمیر کے ذرے ذرے سے عشق تھا جو ان کی نگارشات سے بھی ظاہر ہے۔ ان کی بے وقت موت کی وجہ فراق کشمیر تھی۔ ادبی خدمات کے حوالے سے کشمیر کے دو پریمیوں میں پہلا نام برج پریمی کا ہی ہے۔ 'برج پریمی کی افسانہ نگاری' کا جائزہ موتی لال ساقی، نور شاہ اور سرتاج بدو نے لیا ہے اور واضح کیا ہے کہ انھوں نے پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کی تقلید کی اور اُن کی طرح اپنا نام باکمال کہانی کاروں کی صف میں شامل کر لیا۔ 'برج پریمی کی خاکہ نگاری' میں ڈاکٹر محمد اختر نے اُن کے تمام خاکوں کا جائزہ لیا ہے جن میں اکبر جے پوری، شیخ محمد عبداللہ، پریم ناتھ بجاج، کشپ بندھو اور سوم ناتھ سادھو کی شمولیت ہے۔

'برج پریمی: شخصیت اور فن' کے بعد 'برج پریمی: حیات وادبی خدمات' کے ذریعے ڈاکٹر برج پریمی کے فکر وفن کا جائزہ بخوبی لیا گیا ہے۔ والد محترم کے لیے پریمی رومانی کا یہ بہترین خراج تحسین ہے۔

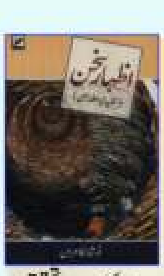

اظہار سخن (تنقیدی مضامین)

مصنف: نوشاد کامران
صفحات: 144، قیمت: 200/روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، گھیر مناف، امروہہ

اظہار سخن، نوشاد کامران کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل چودہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی کا پیش لفظ اور پروفیسر شبنم حمید اور ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری کے تبصروں کے ساتھ ہی 'حرف آغاز' کے نام سے نوشاد کامران کا کتاب کے مشمولات اور غرض وغایت پر مختصر تعارف ہے۔

اظہار سخن کے پہلے دو مقالے اپنے موضوع کی اہمیت وافادیت کے سبب بہت اہم

مقالے ہیں بالخصوص پہلا مقالہ بعنوان 'تحقیق اور اس کے مسائل' میں نوشاد صاحب نے بڑی کارآمد باتیں وضاحت اور بے باکی کے ساتھ کہی ہیں خاص طور پر ان کے یہ جملے:

تحقیق صرف اور صرف حق کی تلاش اور جستجو کے لیے کی جانی چاہیے نہ کہ کسی مالی منفعت، روزگار کے لالچ یا کسی عہدے پر فائز ہونے کی غرض سے، جن حضرات کو دولت اور شہرت عزیز ہے انھیں اس جاں کاہی کے چکر میں نہ پڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ (اظہار سخن ص 22-21)

اس کتاب کا دوسرا اہم ترین مقالہ 'افہام وتفہیم کی نئی فضا' ہے جس میں انھوں نے پوری صاف گوئی کے ساتھ موجودہ دور میں ہماری یونیورسٹیز کی جانب سے ہو رہے تحقیقی کاموں پر اپنی رائے دی ہے۔ میں پوری طرح ان کی آراء سے متفق ہوں، ان کا یہ مقالہ تمام پی. ایچ. ڈی. کرنے والے طلباء وطالبات اساتذہ کو مہمیز کرتا ہے کہ انھیں بغور پڑھنا چاہیے کیونکہ تحقیق ایک مسلسل ریاض چاہتی ہے۔

'اظہار سخن' میں نوشاد کامران کے دوسرے مقالات 'علی عمران: ابن صفی کا ایک لافانی کردار'،'لالہ مادھورام جوہر، ایک مطالعہ'،'ٹیڑھی لکیر، ایک خط مستقیم یا خط منحنی'،'امراؤ جان ادا اپنے معاشقوں کے آئینے میں' قصہ اور تاریخ (ہندی سے ترجمے) 'تعلیم اور غیر رسمی تعلیمات، اقبال کی نظر میں'،' ثاقب لکھنوی، کلاسیکی روایت کا شاعر'، 'خواب اور خلش (جاں نثار اختر کے حوالے سے) 'نطق وصدا' (علی سردار جعفری کے حوالے سے) صدائے عندلیب برشاخ شب ایک متوازن نظریہ'،'عزیز نبیل' خوب سمندر کے حوالے سے 'بکھرے ہوئے رنگ' (ماہر عبدالحئی کے حوالے سے) عناوین شامل ہیں وہ بھی شخصی اور تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں اس طرح کے مضامین پر کوئی بھی شخص اپنے الگ اختلافی تنقیدی نظریات پیش کرسکتا ہے۔ اگرچہ یہ کام کسی مختصر سے تبصرے میں ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری پر ان کا مقالہ تنقیدی کم مدحیہ زیادہ ہے۔ ان مضامین میں نوشاد کامران نے جہاں جہاں اپنے نظریات پیش کیے ہیں ان میں ایک توازن ضرور ہے اور بقول شمس الرحمن صاحب فاروقی انھوں نے اپنے ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔

جناب نوشاد کامران کی تصنیف 'اظہار سخن' کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب میں تازہ وارد ہیں مگر قلم میں جرأت بے باکی خوب ہے جو ان کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ کتاب کے مکمل مطالعے سے یہ بھی احساس ہوا کہ ابھی نوشاد کامران صاحب کی زبان پر گرفت کمزور ہے۔ آپ نے عصمت چغتائی کے مشہور ناول 'ٹیڑھی لکیر' پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جس سے ان کی محنت اور عرق ریزی کا پتہ چلتا ہے۔ عصمت چغتائی کے مطالعے میں ان کی یہ رائے ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس ناول میں بیان کردہ واقعات موتی کی سی آب وتاب رکھتے ہیں مگر ان موتیوں کو جس دھاگے میں پرویا گیا ہے وہ اگرچہ ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے مگر جگہ جگہ سے گانٹھ لگا کر لمبا کیا گیا ہے'' (اظہار سخن ص 60)

جبکہ 'امراؤ جان ادا' کے معاشقوں پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے دوسرے ناقدین ادب کے زیادہ حوالے پیش کیے ہیں، جو مناسب نہیں۔ تنقید نگار کو مدلل طریقوں سے صرف اپنی ہی بات کہنی چاہیے دوسروں کے حوالوں سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور طوالت کا دور نہیں۔

شمس الرحمن فاروقی صاحب نے نوشاد کامران کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں، میرا ان کے لیے مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ خود کو تحقیق وتنقید کا ہی مرد میدان بنائیں۔ ہماری اردو زبان میں شاعر تو ہزاروں لاکھوں ہیں مگر اچھے محقق اور تنقید نگاروں کی کمی ہے۔ آپ کو اللہ تعالی نے یہ صلاحیت دی ہے اس کو تھوڑے ریاض سے بہت نکھارا جاسکتا ہے۔

مکتوبات

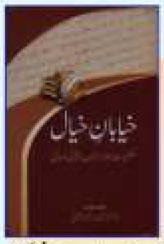

خیابان خیال: مکتوبات مولانا طیب عثمانی ندوی

ترتیب وتہذیب/ ناشر: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

صفحات: 232، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: گلشن، 529، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

مولانا طیب عثمانی صاحب بیک وقت ایک ادیب، نقاد، اور ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ یہ 1930 میں بمقام سملہ، ضلع اورنگ آباد، بہار میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اسی لیے خصوصاً طلبا کی انجمن 'الاصلاح' سے وابستگی، 'دار الکتب' اور 'دار الاخبار' سے دلچسپی بڑھتی گئی اور بچوں کے لیے رسائل 'غنچہ' بجنور سے، 'پھول' لاہور سے اور 'پیام تعلیم' دہلی میں ان کے مضامین تواتر سے شائع ہونے لگے۔ پھر شعور میں بالیدگی آئی تو تحریکِ اسلامی کے اخبار 'الانصاف' الہ آباد میں دینی وسیاسی مضامین لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ غالباً یہی وہ زمانہ تھا جب ادب اسلامی کی ابتداء ہو چکی تھی۔ کراچی سے 'چراغ راہ'، حیدرآباد سے 'انوار' اور میرٹھ سے 'معیار' جیسے ادبی رسائل شائع ہو رہے تھے۔ پھر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اعلی تعلیم حاصل کی۔ اور ندوہ کے عہد طالب علمی ہی میں (1952-53 کے درمیان میں) ادبی وتنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز ہوا۔ 1960 میں رامپور سے 'دانش' اور 1967ء میں ٹانڈہ سے 'دوام' نکالا تو آپ ادارہ ادب اسلامی کے تاسیسی ارکان میں شامل ہوکر ادب اسلامی کی تنظیم وتحقیق میں پوری طرح سرگرم ہوگئے۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور بحیثیت مدیر 'نقیب'، پھلواری شریف سے وابستہ رہے۔ پھر 'نئی نسلیں' لکھنؤ میں بحیثیت معاون مدیر منسلک رہے۔ اور اس کے بعد ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا میں بحیثیت معلم 1957 تا 1988 اپنی خدمات انجام دیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'خیابان خیال' مولانا طیب عثمانی ندوی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے بیٹے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے مرتب کیا ہے۔ مولانا طیب عثمانی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے یہ خطوط ملک کی مختلف شخصیات جن میں بزرگ اساتذہ، ملت کے قائدین، جماعت کے ذمے داران تحریکی رفقاء، ادبی برادران ورسالے کے مدیران اور ملت کے نوجوان اور عزیز واقارب، کے نام متنوع موضوعات پر علمی وادبی، ملی واجتماعی، سماجی، سیاسی، تعزیتی اور گھریلو مسائل پر خطوط تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی نظریات کو پیش کرنے کے لیے اپنے خطوط کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کتاب میں پہلا باب ملی واجتماعی خطوط پر مشتمل ہے۔ اس میں گیارہ خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط میں انھوں نے ملک میں آزادی کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی مسائل، اور جارحانہ فرقہ پرستی کے خلاف امن وشانتی محبت وسلامتی کا اسلامی پیغام لے کر میدان میں نکلنے کی تلقین کی ہے۔ ملت کے دینی، تعلیمی اور معاشی استحکام کے تعمیری پروگرام کے ساتھ فرقہ پرستوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے اور ملک کی اکثریت کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان خطوط کے ذریعے انھوں نے اصلاح معاشرہ میں رشد وہدایت، اور دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیا ہے۔

دوسرا باب علمی وادبی خطوط پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں کل باسٹھ 62 خطوط ہیں۔ ان خطوط میں انھوں نے زندگی میں نراج وانتشار اور بے راہ روی، بے چینی کے ادب وتہذیب پر پڑ رہے گہرے اثرات بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'آج کا انسان اس بڑھتی

ہوئی مادیت سے اکتا چکا ہے اور اپنے خول میں بند ہو گیا ہے، یہ زندگی سے فرار ہے، جسے اس نے خودشناسی اور معنویت کی تلاش کا نام دے رکھا ہے، حالانکہ یہ بے معنی، معنویت اور اپنی ذات میں کھوئے ہوئے رہنا، دراصل زندگی سے فرار ہے، بے یقینی اور کسی مثبت نظریے تک ان کی نارسائی کی علامت ہے، جس کی جدید ادب آج نمائندگی کر رہا ہے۔ضرورت ہے کہ آج کے ادب میں براہِ راست ایمان ویقین کی بات کی جائے اور اخلاقی وروحانی اندازِ نظر کے ساتھ ایک جامع نظریہ ونظامِ اقدار اور کامل نظامِ حیات کا مژدہ سنایا جائے۔خودشناسی کے ساتھ جہاں شناسی اور خداشناسی آج کے انسان کی اپنی ضرورت ہے۔ جسے ہم کو آج کے بھٹکے ہوئے ادب وتہذیب کے درمیان پورے زور اور قوت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔'اس حصے میں وہ عام طور پر مکتوب نگار کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے علمی وادبی انہماک، سماجی سرگرمیوں، مختلف ادبی مباحث، ناقدانہ گفتگو، ادباء وشعراء کے کلام پر تبصرہ اور معاصرین سے متعلق اپنی رائے کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں۔

تیسرا باب تعزیتی ودینی خطوط پر مشتمل ہے۔ یہاں کل 17 خطوط درج ہیں جو انھوں نے اپنے عزیز واقارب کی فوتگی پر ان کی مغفرت کی دعا اور لواحقین کو صبر کی تلقین کی ہے۔ اور کتاب کا باب چہارم 'گھریلو ومتفرق خطوط' پر مشتمل ہے۔ جس میں 22 خطوط شامل ہیں۔ اس حصے میں انھوں نے اپنے بیٹے اور عزیز دوستوں سے خط وکتابت کی ہے اور انھیں نیک مشوروں سے نوازہ ہے۔ اور آخر میں 'عکس تحریر' کے نام سے چند خطوط پیش کیے ہیں جو طیب عثمانی صاحب کے قلمی نسخوں کے نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طیب عثمانی صاحب کا انداز تحریر بہت دلکش ہے۔ وہ ہر موضوع کو قلمبند کرنے کی صلاحیت اور بات سے بات پیدا کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا رشاد عثمانی اپنے والد صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' آپ جب عالم خیال میں قلم لے کر بیٹھتے اور حال دل سنانے کے لیے خطوط کا سہارا لیتے تو آپ کے قلم سے ادب وفن اور فکر وخیال کے گہر ہائے آبدار نکلتے تھے۔ آپ کے خطوط میں فکر وخیال کی بلندی، زبان کی دلکشی اور رعنائی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' یہ خطوط مضامین کے لحاظ سے اپنے عہد کے حادثات، واقعات، شخصیات اور افکار ومسائل کے سچے ترجمان ہیں اور جس میں قوم وملت کی بھلائی کا جذبہ صاف جھلکتا ہے۔

ڈراما

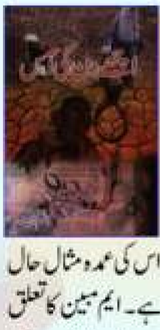

اچھے دن کی آس

مصنف: ایم مبین

صفحات: 136، قیمت: -/100، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: رحمانی پبلی کیشنز 1032 انصار روڈ، اسلام پورہ، مالیگاؤں

مبصر: عمران عراقی

موجودہ اردو فکشن اپنے سماجی سروکار سے کس قدر باخبر ہے اس کی عمدہ مثال حال ہی میں شائع ایم مبین کے ڈراموں کا مجموعہ 'اچھے دن کی آس' ہے۔ ایم مبین کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔ تا حال ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور ایک ناول شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے، ناول اور کہانیوں کے ساتھ سائنس فکشن بھی لکھتے ہیں۔ پیش نظر کتاب 'اچھے دن کی آس' ایم مبین کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 10 ڈرامے شامل ہیں، جن میں پانچ طبع زاد ڈرامے ہیں جب کہ ایک ڈرامہ 'جڑیں' مرحوم مظہر سلیم کے افسانے پر مبنی ہے اور چار یک کرداری ڈرامے سعادت حسن منٹو کے افسانے پر مبنی ہیں۔

اپنی بات کے تحت ایم مبین نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہائی اسکول اور جونیئر کالج کے علاوہ پرائمری سطح کے اسکولوں میں بھی اس طرح کے عصری مسائل پر مبنی ڈرامائی مقابلے ہوتے ہیں، جس کے پیش نظر یہ ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ جناب ایم مبین لکھتے ہیں'' ہر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی جلتا ہوا عصری مسئلہ ہے، جو عام طور پر اس سطح کے ڈرامہ مقابلوں کے محبوب موضوعات ہوتے ہیں''۔ چلیے صاحب اسکول اور کالج کی ضرورت کے تحت ہی صحیح اس طرح کے عصری مسائل کو براہ راست ڈرامے کے ذریعے پیش تو کیا گیا ہے۔ ورنہ حال تو یہ ہے کہ اردو فکشن کی دونوں مقبول اصناف (افسانہ اور ناول) اس طرح کے موضوعات سے فی الحال کوسوں دور معلوم ہوتی ہیں۔ گزشتہ برسوں میں ہندوستانی معاشرے نے جس طرح سے کروٹ لی ہے اس کے لیے زمین ہموار کرنے میں سیاست نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ پورے ملک میں ایک الگ طرح کی بحث چھیڑی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے اس کے اثرات ادب پر بھی ہونے ہیں۔ اس کے اشارے تو اردو فکشن میں گاہے بگاہے ملتے ہیں لیکن براہ راست افسانہ یا ناول میں اس طرح کے سلگتے عصری مسائل کی جھلک دیکھنے کو کم ہی ملتی ہے۔

یہ ڈرامے موجودہ دور کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں جس طرح سے ہندوستانی معاشرے میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر تبدیلی آئی ہے، ان تبدیلیوں کو مجموعے کے ابتدائی پانچ ڈرامے بخوبی پیش کرتے ہیں۔ پہلا ڈراما 'نیا قانون' گئوکشی اور دلت مسائل پر مبنی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی منظرنامے پر 'گئو' کو ایک آلہ کار کے طور پر کس طرح استعمال کیا گیا ہے اور اس کے پس پشت اقلیتی فرقوں کو جس طرح سے نشانہ بنایا گیا ہے اور انھیں پریشان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی بہترین عکاسی 'نیا قانون' کرتا ہے۔ دوسرا ڈراما 'چائے کی دکان' سیاسی اقتدار اور عوام کی سوجھ بوجھ پر مبنی ایک بہترین ڈراما ہے۔ گو کہ یہاں عوام کی سوجھ بوجھ کے اثرات منفی ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ ہندوستانی عوام خصوصاً اقلیتی فرقہ کس قدر بے یقینی میں مبتلا رہتا ہے اور ایک طبقہ اپنی مفاد پرستی میں کس طرح دیگر فرقوں کے اعتماد کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس صورت حال کو ایم مبین نے ڈرامے کی شکل میں بہترین طریقے سے پیش کیا ہے۔

'اچھے دن کی آس' ہندوستانی کسانوں کے مسائل پر مبنی عمدہ ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے کسان کے مسائل کو عصری تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو ہندوستان کا تقریباً 70 فیصد کسان زراعت کے پیشہ کو اختیار کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی معیشت کو زراعت پر مبنی کہا گیا ہے۔ لیکن اسی ملک کے کسانوں کو اور ان کے مسائل کو محض سیاسی مفاد پرستی کے باعث نظر انداز کیا جاتا ہے۔ گو کہ گزشتہ برسوں میں کسان اور زراعت کے مسائل ملک کے سلگتے موضوعات میں شامل ہونے کے باوجود، نہ تو زراعت میں خاطر خواہ بہتری آئی اور نہ ہی کسانوں کی خودکشی کے واقعات کی روک تھام میں سیاست دانوں کی جانب سے کوئی ٹھوس قدم اٹھایا گیا۔ 'اچھے دن کی آس' انھیں مسائل کو پیش کرتا ہے۔ 'باپو کی آتما' ایک طرح کا نظریاتی ڈرامہ ہے۔ باپو یعنی مہاتما گاندھی نے جن نظریات اور اصولوں کی بنیاد پر ہندوستان کو سنوارنے اور سجانے کی کوشش کی نیز ملک کو آزادی دلانے میں قربانیاں دیں، انھیں نظریاتی پہلوؤں کو بالائے طاق رکھ کے موجودہ سیاست داں اور عوام، ملک کو تباہ کرنے کی کوشش کرنے میں لگے ہیں۔ ہندوستان کی اس صورت حال کو اگر گاندھی جی براہ راست اپنی چشم بینا سے دیکھتے، تو ان

پر کیا گزرتی؟ گاندھی جی نے جن اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کا جو خواب دیکھا تھا، انھیں بکھرتے ہوئے دیکھ کر کتنی تکلیف ہوتی۔ 'باپو کی آتما' کے ذریعے اسی احساس کی ترجمانی کی گئی ہے۔

معاصر اردو فکشن پر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ آج کا فکشن، خاص طور سے افسانہ اور ناول، اس طرح کے موضوعات سے بہت دور ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ایم مبین صاحب نے گئو رکشا، دلت مسائل، سیاسی مفاد پرستی، کسانوں کے مسائل جیسے موضوعات کو اپنے ڈراموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

شاعری

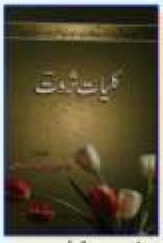

کلیات ثروت

مرتب: ڈاکٹر جاوید نسیمی

صفحات: 512، قیمت: 400 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: امتیاز رومی، روم نمبر 142، کاویری ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی

رامپور کو اردو شعر و ادب کے حوالے سے ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کے باذوق نوابوں نے علم و ادب کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ چنانچہ یہاں کی خاک سے بڑے بڑے ادیب و دانشور نے جنم لیا۔ اس شہر کے بارے میں غالب نے کہا: رامپور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر / کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم / رامپور آج ہے وہ بقعہ معمور کہ ہے / مرجع و مجمع اشراف نژاد آدم... سید درویش احمد ثروت کا تعلق اسی دبستان کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں بیعت و ارادت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان کے والد حضرت سید غلام محی الدین خود بھی ایک اچھے شاعر اور منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے۔ نیز ان کا تخلص تھا۔ چنانچہ شعر و شاعری ان کو وراثت میں ملی۔ اس کے باوجود موتی میاں ثروت حضرت محمود رامپوری سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے، جو داغ دہلوی کے جانشین تھے۔ زیر تبصرہ کلیات انھیں کے صوفیانہ خیالات کا اظہار ہے جو شعری پیرائے میں ڈھل کر موتی بن گئے۔

صوفیا نے رموز عشق و معرفت کی ترسیل کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے ہی اردو شاعری میں ان کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ حضرت موتی میاں ثروت قادری بھی انھیں صوفی شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مضامین تصوف کو باندھنے کے لیے شاعری کی اور اسرار طریقت و معرفت کو شعر کی مختلف ہیئتوں میں بیان کیا۔ ڈاکٹر جاوید نسیمی نے ثروت صاحب کے جمیع کلام کو 'کلیات ثروت' کے نام سے یکجا کر کے بڑا اہم کام کیا ہے۔ چوں کہ درویش احمد ثروت قادری واقعی درویش صفت انسان اور صاحب بیعت و خلافت بزرگ تھے، اس لیے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے:

ان پہ مرمٹنے کو کہتے ہیں حیات ابدی — اللہ اللہ خیالات یہ دیوانوں کے

نہ کر واعظ ہمارے سامنے بے کار کی باتیں — ہمیں تو لطف دیتی ہیں نگاہ یار کی باتیں

تمنا ہے دم آخر زباں پر اے میری ثروت — خدا کی حمد ہو اور احمد مختار کی باتیں

آغاز کلام سے قبل دیباچے کے علاوہ سید اسلم میاں، جناب عبدالہادی خاں کاوش، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، جناب عتیق جیلانی سالک، جناب شعائر اللہ خاں وجیہی، جناب عزیز بقائی اور جناب نفیس صدیقی کے مضامین و تاثرات پیش کیے گئے ہیں، جن سے ثروت صاحب کی شخصیت اور شاعری پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ ثروت صاحب کے والد نیز صاحب کے بیشتر کلام عدم توجہی کی بنا پر ضائع ہو گئے۔ بچے کھچے کلام کو کلیات ثروت کے آغاز میں تبرکات نیز کے عنوان سے محفوظ کر لیا گیا۔ اس کے بعد ثروت صاحب کا مجموعہ کلام 'نقش پارینہ' اور دیگر کلام کو 'نقش نو' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی انھوں نے شاعری کی ہے جو 'بادہ شیراز' کے نام سے شامل کلیات ہے۔ ثروت صاحب نے تقریباً جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے غزلیں، قطعات، نظمیں، نعت و مناقب کے علاوہ سہرے اور تاریخیں بھی کثرت سے کہی ہیں۔ ان کی غزل گوئی کے حوالے سے ڈاکٹر شریف احمد قریشی لکھتے ہیں:

'حضرت ثروت قادری کی غزلیات کا انداز خالص روایتی و کلاسیکی ہے۔ انھوں نے غزل کی مروجہ لفظیات و علامات جیسے نشیمن، قفس، گلستاں، آشیاں، آشیانہ، صیاد، زلف، مژگاں، گیسو، لب، رخسار، شمع، پروانہ، ناصح، زاہد، دیوانہ، جنوں، گل، بلبل، خزاں، بہار، قاتل، مقتل، بسمل، ہجر، فراق، وصال، بت، کعبہ، مے، میخانہ، حشر، محشر، رقیب، عدو، دامن، گریباں وغیرہ کے ذریعے معاملات حسن و عشق کے علاوہ مختلف احساسات و کیفیات کو نہایت دل کش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق انسان کے دکھ درد کے احساسات، روایت کی پاسداری اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی چاہت کا نام ہے'۔

ثروت صاحب دراصل شاعر سے پہلے صوفی ہیں اور اپنے صوفیانہ خیالات ہی کے اظہار کے لیے انھوں نے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ چناں چہ عشق و محبت اور تصوف و معرفت ان کے بنیادی موضوعات ہیں۔ نعت و منقبت کے علاوہ قطعات، نظموں اور غزلوں میں بھی مضامین تصوف خوب ملتے ہیں۔ سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ میں کیفیات دروں کا بیان ان کے کلام کو مزید حسن بخشتا ہے۔ تشبیہ و استعارے میں دور کی کوڑی لانے سے گریز ان کا خاصہ ہے۔ مختصر اور طویل دونوں بحروں میں بڑی آسانی سے انھوں نے اپنے جذبات کی ترسیل کی ہے جن سے قاری محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر بھی ہوتا ہے۔

کلیات ثروت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک کہنہ مشق اور قادرالکلام صوفی شاعر کے کلام پر مشتمل ہے، جس میں متصوفانہ خیالات اور داخلی واردات کو شعری پیکر میں نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ گرچہ انھوں نے بیشتر صنف میں طبع آزمائی کی ہے تاہم حمد و نعت اور منقبت سے انھیں زیادہ لگاؤ ہے۔ تاریخی قطعات بھی انھوں نے کثرت سے لکھے ہیں جو ان کی قادرالکلامی پر دلالت کرتے ہیں۔ 'کلیات ثروت' کو تزئین و ترتیب اور تحقیق و تدوین کے مراحل سے گزار کر ڈاکٹر جاوید نسیمی نے دیدہ زیب ٹائٹل پیج کے ساتھ شعر و ادب کے شائقین کی خدمت میں پیش کیا۔ امید ہے کہ ثروت صاحب کا کلام شعر و ادب کا ذوق اور تصوف سے شغف رکھنے والے افراد کے لیے سامان تسکین ہوگا نیز جاوید نسیمی کی یہ کاوش اردو کی متصوفانہ شاعری میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔

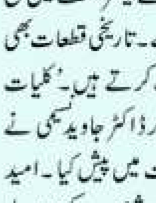

میر رنگ

شاعر/ ناشر: نصیر پرواز

صفحات: 144، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: احد پرکاش، راجیو نگر، کوہ فضا، بھوپال 462001

"میر کا رنگ تو رنگ ہے لیکن نصیر پرواز کی پرواز کا بھی آہنگ ہے۔"

(احد پرکاش)

اردو کے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے میر کی عظمت اور غزل کو تسلیم کیا ہے۔ میر کی زبان ان کا لہجہ، ان کی فکر آسمانِ ادب پر ہمیشہ چھائی رہے گی۔

میر رنگ نصیر پرواز کی نئی غزلوں کی کتاب ہے۔ ان غزلوں کی مدت تخلیق پچھلے 60 سالوں پر محیط ہے۔ یہ کتاب ان کے ذہنی ارتقا کی دستاویز بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک عجیب طرح کا ڈر اور مایوسی کا احساس بھی نمودار ہوتا ہے۔

غم دوراں، غم جاناں اور زندگی سے بیزاری کا اظہار کچھ شعروں میں اس طرح ہوتا ہے گویا ان کی اپنی ایک انفرادیت جو انھیں دیگر شعرا سے الگ کرتی ہے اور آپ کو اس صدی کا سچا اور کھرا شاعر بناتی ہے۔

میر رنگ کتاب میں نصیر پرواز صاحب کی بحر متقارب کی غزلیں ہیں جو اپنی تہذیبی قدروں کی حفاظت کرتے ہوئے میر کی زبان اس کے آہنگ کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ وہ بحر ہے جسے ہمارے بیشتر شعرا نے نہیں اپنایا۔

نصیر پرواز صاحب عملی طور پر کسی بھی تحریک کسی بھی خیمے سے کبھی وابستہ نہیں رہے باوجود اس کے ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہیں اور نصیر پرواز صاحب کو اپنا پسندیدہ اور استاد شاعر مانتے ہیں۔ ہندی اور اردو کے پل کے روپ میں بھی ان کی شہرت ان پر پھول برساتی رہتی ہے۔ میر رنگ کا رنگ ایک طرح سے بابائے غزل میر کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے لیکن ان کے اس رنگ میں خالص نصیر پرواز کا بھی آہنگ اور جلوہ نمایاں نظر آتا ہے جو ہندوستان کی سچی غزل کو پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

آج قدم قدم پر ہزاروں مسائل ہیں۔ آدمی شانتی کی کھوج میں بھٹک رہا ہے۔ آج انسان کو سکون کی چند سانسیں بھی میسر نہیں۔ آپ ان غزلوں میں اس بھٹکتے ہوئے انسان کو بھی دیکھ سکتے ہیں اسے اپنی روایات سے انحراف نہیں ہے مگر وہ اپنی بے بسی اپنی بے چینی اور اپنی خواہشات کا بھی اعتراف کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے۔ یہی انفرادیت اس کتاب کی جان ہے۔

سوز دل اور بچپن کی سوغات بہت سارے شعروں میں کبھی کرنوں کی شکل میں تو کبھی جگنوؤں کی شکل میں قارئین کو متاثر کرتی ہے:

رہِ وفا کا ایک مسافر سوزِ دل بھی رکھتا ہے
جو بھی ننگے پاؤں چلے گا ساتھ اسی کے ہو لے گا
جانے کب پیغام ملے گا اس کو کھلی ہواؤں کا
جانے کب معصوم پرندہ اڑنے کو پر تولے گا
میں نے ساری عمر حفاظت کی ہے سوکھے دامن کی
جب بارش کی بات کرے گا اپنا جسم بھگو لے گا

——

بیتا بچپن اپنے سائے رکھتا ہے جب پلکوں پر
تتلی کو پھولوں سے اڑانا کتنا اچھا لگتا ہے
کاش مرے بچپن کے ساتھی پھر سے مل جائیں پرواز
باغوں سے امرود چرانا کتنا اچھا لگتا ہے

——

چند کتابیں کیا پڑھ لی ہیں میرے عہد کے بچوں نے
خود کو تو پہچان نہ پائے دنیا کو پہچان گئے

نیا آہنگ اور جدت کی روشنی بھی کچھ سروں میں دھوپ کی طرح کن کنی لگتی ہے۔

کچھ شعر تو ایسے ہیں کہ دماغ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور میر کے لہجے میں نئی شاعری کا گلستان ہوتا ہے:

اپنے کھلے پروں سے پنچھی پیڑ نہیں باندھا کرتے
جو دریا پر رکھا ہوا ہے وہ سایہ بہتا کب ہے
کم سے کم پیاسی سطحوں میں اتنی تو سچائی ہو
طلب کروں جب بھی دو قطرے دریا گہرا ہو جائے

——

آنگن آنگن ویرانی ہے بستی بستی سناٹا
میرے گھر سے اٹھا لے گیا آخر میرے سائے کون
جب بھی اپنا جسم ٹٹولا جب خود کو سوچا پرواز
کوئی میرے اندر چیخا سب کچھ تیرا میرا کیا؟

اس کتاب میں آپ کو ایسے اور بھی اشعار ملیں گے جو میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ میر کے رنگ کو نصیر پرواز صاحب نے اپنے رنگ سے جو سرخروئی کا جواز تلاش کیا ہے اسے آپ ہر لحاظ سے لاجواب کہیں گے، شرط کہ آپ اس کتاب کو ڈوب کر پڑھیں۔ میر تو آپ کو یاد آئیں گے ہی لیکن نصیر پرواز کی پرواز کو بھی آپ بھلا نہیں سکیں گے۔

مختصر تبصرے

فکر

شاعر: اطہر اعظمی

صفحات: 156 / قیمت: 200 روپے

اردو شاعری کی روایت بہت قدیم ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی کتاب منظر عام پر آتی رہتی ہے۔ اور یہ کسی بھی کامیاب زبان کے زندہ رہنے کی بہترین مثال ہے کہ اس زبان میں زندگی کے تمام نشیب و فراز کی ترجمانی کی جاسکے۔

زیر تبصرہ کتاب 'فکر' اطہر اعظمی کی ہے۔ اس سے پہلے 'درد' کے نام سے ایک اور مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کتاب کے اندر کل 98 غزلیں، 9 نظمیں اور ایک قطعہ کے ساتھ منظوم سوانح عمری شامل ہے۔ کتاب میں شامل غزلوں کی بات کی جائے تو یہ غزلیں انسانی زندگی کے بہت قریب ہیں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے قاری کے اندرونی جذبات کے ساتھ ساتھ بیرونی حوادث کی بھی بہترین ترجمانی کی ہے۔ اور ان غزلوں کو قاری کے دل سے قریب کر دیا ہے۔ کسی بھی شاعر کے لیے نقطۂ عروج اس وقت اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب کہ خود بھی وہ قاری کے ساتھ محظوظ ہو۔ اور اس کی اپنی شخصیت قاری سے الگ نہ ہو سکے۔ بعض غزلوں میں شاعر نے اتنی شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ دی کہ 'سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'۔ ایک طرف اس میں حالات حاضرہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے تو دوسری طرف کئی اہم مسائل کی طرف قاری کے ذہن کو موڑنے کی کوشش کی گئی۔ پورے مجموعے کے مطالعے سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ 'فکر' ہمیں فکری جہات کی طرف دعوت دیتی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں صفحات کی ترتیب میں کچھ خامیاں ہیں امید ہے آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

ترانۂ جاوید

شاعر:عبدالمتین جامی

صفحات: 160 / قیمت: 200 روپے/ ناشر :ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

زیر تبصرہ کتاب 'ترانۂ جاوید' عبدالمتین جامی کی ہے، جن کا بیشتر وقت جنگلوں میں گزرتا ہے کیوں کہ ان کا کام کاج ہی کچھ ایسا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عبدالمتین صاحب کو اردو زبان وادب سے اتنا لگاؤ ہے کہ وہ اس کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ صنف رباعی کو استادوں کا فن مانا جاتا ہے۔ اور رباعی کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اگر غزل کو حسن وعشق کی زبان مان لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا کہ رباعی میں پوری کائنات سمٹ کر آجاتی ہے۔ اس کتاب کے اندر رباعیوں کے ذریعے زندگی کے مختلف فلسفوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ جامی نے اس مجموعے میں فلسفۂ حیات، تصوف، طنز ومزاح، دنیا کی دلفریبی، ساغر ومینا ہر ایک کو موضوع سخن بنایا ہے۔

بعض رباعیوں میں تو پیکر تراشی اور علامات واستعارات کا بہترین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ کچھ رباعیاں ایسی ہیں کہ ان میں اڑیسہ کی تہذیبی وثقافتی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اس کتاب کے اندر ہائیکو اور ترائیلے کی بھی مثالیں پیش کی ہیں اور نہایت ہی عرق ریزی سے ان کو برتا گیا ہے۔ آخر میں ایک بات کہتا چلوں کہ رباعی کے تمام اجزا، پر ہی نہیں بلکہ اس کے چوبیسوں اوزان وبحور پر شاعر کو مکمل گرفت ہے اسی لیے امید ہے کہ رباعیوں کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں سنگ میل ثابت ہوگا۔

رہگزر

شاعر: ڈاکٹر انوار انصاری

صفحات: 124 / قیمت: 200 روپے/ ناشر :ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

غزل اپنی غنائیت، حسن وعشق، اور واردات قلبی کے بیان کی وجہ سے بے حد مقبول صنف ہے اور اس صنف میں روز بروز نت نئے تجربات کیے جارہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی بڑی شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ کبھی اسے شاعری کی آبرو کہا گیا تو کبھی مغموم دلوں کا ترجمان یہاں تک اس صنف نے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔

زیر تبصرہ کتاب 'رہگزر' ڈاکٹر انوار انصاری کی تخلیقی کدو کاوش ہے جسے انھوں نے نہایت ہی عرق ریزی سے شاعری کے لوازمات کو برتتے ہوئے قاری کے سامنے زندگی کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ انھوں جمالیاتی احساس کی بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں محبوب کے خدوخال کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک طرف تشبیہ اور استعارہ کے ذریعے محبوب کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش ہے تو دوسری طرف کنایے میں وہ کچھ کہا گیا ہے جو محبوب بے پروا کی نشانی ہے۔ اس کتاب کے اندر کل 47 غزلیں ہیں جب کہ ایک حمد نعت اور منقبت کے ذریعے نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ اس غزلیہ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مشکل تشبیہات واستعارات اور ادق الفاظ کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو اشعار کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

پوری کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعری آسان اور زود فہم زبان میں کس طرح سے کہی جاسکتی ہے۔ سیاسی، سماجی موضوعات کو بھی شاعر نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ہندو پاک کے عوام میں پیار ومحبت اور ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی جتانے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس کتاب میں شامل تمام نظموں اور غزلوں میں ایک پیغام دیا گیا۔ محض شاعرانہ پن یا تفنن طبع سے احتراز کیا گیا۔ امید ہے ادبی دنیا میں اس گراں قدر کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا جس کی یہ مستحق ہے۔

تجربات حیات

شاعر: ماسٹر نثار احمد

صفحات: 168 / قیمت: 100 روپے

زیر تبصرہ کتاب 'تجربات حیات' ماسٹر نثار احمد کی زندگی کی روداد ہے جسے انھوں نے غزلیہ رنگ وآہنگ میں قاری کے سامنے پیش کردیا ہے۔ اس کتاب سے پہلے ان کی کئی دیگر تصانیف اور شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں 'راہ اعتدال' اور 'گاؤں سے دلی کی اور' کافی مقبول ہیں۔ اس کتاب میں شامل تمام غزلیں ردیف وقوافی کی عمدہ عکاس ہیں۔ ساتھ ساتھ شاعری کی تہذیبی جڑوں کی عمدہ ترجمان ہیں جیسا کہ خود شاعر کہتا ہے 'شاعری بھی ایک دستاویز ہوتی ہے ایک تحریر ہوتی ہے'۔ کتاب میں شامل تمام کلام کا اگر باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ شاعری دراصل دلی کیفیات اور وفور جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر نے اپنے تمام کلام میں ماضی کی روداد اور مستقبل کے خطرات سے قاری کو آگاہ کیا ہے۔ کہیں کہیں شاعر نے طنز ومزاح کے پھول بھی برسائے ہیں۔ جس سے قاری ماضی کی یادوں میں کھوسا جاتا ہے۔ ماسٹر نثار احمد کی غزلوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں تنوع، رنگارنگی اور عزم وحوصلہ کی نایاب مثالیں ملتی ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ غزلوں کا یہ مجموعہ دھڑکتے دلوں کی صدا اور مغموم دنیا کے لیے تریاق ثابت ہوگا۔

برگدنامہ

شاعر: ڈاکٹر چمن آہوجہ

صفحات: 240 / قیمت: 250 روپے/ ناشر :ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

زیر تبصرہ کتاب 'برگدنامہ' اردو کے مشہور شاعر اور بہترین مصنف ڈاکٹر آہوجہ کی شعری تخلیق ہے۔ جسے انھوں نے زندگی کے ایک لمبے تجربے اور آخری نچوڑ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں 'نورنگی شام' کا ذیلی عنوان قائم کرکے مختلف جہات سے قاری کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں 'شام زندگی' کے تحت استعارہ اور کنایوں کی روشنی میں زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ تیسرے حصے میں 'حقیقت منتظر' کے نام سے ان یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی گئی جسے شاعر نے اپنی زندگی میں محسوس کیا ہے۔ جب کہ چوتھے حصے میں 'قطعات' کے عنوان سے انسانی زندگی کے نشیب وفراز، اتار چڑھاؤ کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ حادثہ اس کا اپنا ہے۔ اس بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ کتاب شاعر کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات وحادثات کی دستاویز ہے۔ جسے انھوں نے کتابی شکل میں یکجا کردیا ہے۔ اس شعری مجموعے کے حوالے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کتاب کی افادیت واہمیت آنے والے وقتوں میں دوگنا ہوجائے گی۔ کتاب کا ٹائٹل اور سرورق نہایت ہی عمدہ ہے۔

مبصر: اسعد اللہ

1444/45، فیاض گنج، آزاد مارکیٹ، پرانی دہلی۔ 6

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

کونسل سوشل سائنس کی کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: اکثر اردو زبان کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو مذہبیات اور اردو ادب تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اس میں کسی حد تک سچائی ہے لیکن عالمی تناظر میں اردو کی معنویت کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو بھی دیگر زبانوں کے مقابلے میں علمی زبان بن سکتی ہے۔ اس لیے کونسل سوشل سائنس کی ایسی نادر و نایاب کتابیں جس کی اشاعت سوڈیڑھ سو سال پہلے ہو چکی تھی اس کی افادیت اور معنویت کو دیکھتے ہوئے اسے پھر سے اشاعتی صورت میں لانا چاہتی ہے، جس سے اردو کی نئی نسل استفادہ کر سکتی ہے۔ ایسی کتابوں کی دوبارہ اشاعت میں نہ پریشانیاں ہیں اور نہ ہی کاپی رائٹ کا مسئلہ۔ اس کے علاوہ عصری مسائل جیسے موضوعات کو بھی کتابچے کی صورت میں کونسل منظر عام پر لانا چاہتی ہے تاکہ آج کے مسابقاتی دور میں ہمارے بچے پیچھے نہ رہ جائیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو قارئین کا ایک بڑا طبقہ براہ راست انگریزی کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکتا اور نہ ان کے پاس قوت خرید ہے۔ اس حوالے سے کونسل سوشل سائنس کی کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کے عہد میں ادبی تخلیق سے زیادہ سائنسی و سماجی مضامین کے ترجموں کی ضرورت ہے کیونکہ ترجمے کے ہی ذریعے آج کے زمانے کے نئے علوم وفنون اور موضوعات و مسائل سے اردو قارئین متعارف ہو سکتے ہیں۔

اس پینل کی صدارت ڈاکٹر محترمہ سیدہ سیدین حمید نے کی۔ انھوں نے پینل کی کارکردگی کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ اس موقع پر کچھ نئی تجاویز کو بھی پینل کی مدد سے منظوری دی گئی۔ پروفیسر رضوان قیصر نے کہا کہ اردو والوں کو بھی ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس سے اردو قارئین کے علم میں اضافہ ہو سکے اور ان پر روایت پرستی کا جو لیبل لگا ہے اس سے نجات مل سکے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پچھلے دو سالوں میں کونسل کی اچھی کارکردگی رہی ہے۔ اس موقع پر جناب نریش ندیم نے کہا کہ کونسل کے اس اقدام سے نہ صرف اردو قارئین کو

فائدہ ہوگا بلکہ اردو کے دائرے میں بھی مزید وسعت ہوگی۔

اس میٹنگ میں ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید، پروفیسر ایم ایچ قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، محترمہ عذرا عابدی، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر مظفر اسلام، ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، جناب نریش ندیم، جناب سجاد عالم رضوی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محترمہ ذیشان فاطمہ، محمد شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 اگست 2017

23 تا 31 دسمبر شولاپور میں اردو کتاب میلہ

شولاپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام گذشتہ کئی سال سے مہاراشٹر کے مختلف شہروں

میں تاریخی کتاب میلوں کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ اسی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے امسال 23 تا 31 دسمبر اردو کتاب میلے کا انعقاد ہوگا۔ اس ضمن میں قومی کونسل کے ذمے داران شاہ نواز خرم اور فیروز عالم نے شولاپور کا دورہ کیا اور بزمِ غالب شولاپور، کل ہند اردو ادبی کانفرنس، خدمتِ خلق آرگنائزیشن آف انڈیا کے علاوہ شہر کے مختلف اداروں کے ذمے داران سے تبادلہ خیال کیا۔ شاہ نواز خرم نے کہا کہ ''میلے کا اصل مقصد قارئین تک کتابوں کی رسائی ہے جبکہ میلہ کے علاوہ قومی کونسل کی جانب سے مختلف کورسیز، سمینار اور ادبی و ثقافتی پروگراموں کے لیے مدد کی جاتی ہے۔'' کتاب میلے کے انعقاد میں دلچسپی رکھنے والے اداروں کے ذمے داران نے میلے کی کامیابی کا یقین دلایا۔ فیروز عالم نے کونسل کی کارکردگی اور اردو کتاب میلے کے متعلق رہبری کرتے ہوئے کہا کہ شہر کے تمام ادارے مل جل کر کتاب میلے کو کامیاب بنائیں۔

اس ضمن میں پہلی میٹنگ بزم غالب میں منعقد ہوئی جس میں موسیٰ خان، انور کمشنر، اعجاز منظور عالم، ڈاکٹر ہارون رشید باغبان، اشفاق زید، شفیع کیپٹن، محمود نواز، عبدالشکور شعور اور آصف اقبال وغیرہ موجود تھے۔ دوسری میٹنگ کل ہند اردو ادبی کانفرنس میں ہوئی جس میں ایڈوکیٹ یو این بیریا، نظام الدین شیخ، اخلاق شیخ، فضل شیخ، ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار، جعفر باگی، سید اقبال اور رفیق اڑتے وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اگست 2017

202 طلباء و طالبات کو تقسیمِ اسناد

میل وشارم: سی عبدالحکیم کالج [خودمختار] میل وشارم

تامل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا علاقائی مرکز قائم ہے۔ جہاں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس، فارسی سرٹیفکیٹ کورس، کمپیوٹرڈپلوما کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جاری ہے جس میں امسال 42 طلباء و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج اور 125 طلباء و طالبات نے سرٹیفکیٹ ان فنکشنل عربک اور 25 طلباء نے کمپیوٹرڈپلوما کی اسناد حاصل کیں۔

اس سلسلے میں ایک شاندار اجلاس 2 اگست 2017 میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے کی صدارت جناب الحاج ایس ضیاء الدین احمد، جنرل سکریٹری میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک اور نعتِ شریف سے ہوا۔ پرنسپل جناب ڈاکٹر ایس اے ساجد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر صاحب صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر، این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر انوار اللہ حاجی، سکریٹری وکرسپانڈنٹ، اسلامیہ کالج (خودمختار)، وانمباڑی نے جلسہ سے خطاب فرمایا اور مہمانِ اعزازی محترمہ ڈاکٹر پی این سدھا، پرنسپل ڈی کے ایم کالج فار ویمن، ویلور نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت جناب افتخار احمد استاد، این سی پی یو ایل نے کی۔ کامیاب طلباء و طالبات کو جناب الحاج ساہوکار نثار احمد، صدر میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے اسناد تقسیم کیں۔ جلسے میں عمائدین شہر اخبار و رسائل اور الکٹرانک میڈیا کے صحافی اور نامہ نگار خاصی تعداد میں شامل تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، کوآرڈی نیٹر، صدر شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، 16 اگست 2017

ڈاکٹر اسلم پرویز کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشست

نئی دهلی: نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ 6 ستمبر صبح 8 بج کر 40 منٹ پر سابق استاد جواہر لعل نہرو یونیورسٹی پروفیسر اسلم پرویز کا ان کی رہائش گاہ ترکمان گیٹ پر انتقال ہوگیا۔ وہ کم و بیش 83 سال کے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی نشا اور ایک بیٹا نوید ہیں۔ موصوف نے ایم اے تک کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی تھی، بعد ازاں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی زیرِ نگرانی بہادر شاہ ظفر پر نہایت پر مغز مقالہ تحریر کیا جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ بعد میں وہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشاء پر ان کی کتاب کو بھی ادبی حلقے میں خوب سراہا گیا۔ غالبیات سے متعلق ان کے مضامین کا مجموعہ 'گنجینۂ معنی کا طلسم' اور متفرق مضامین کا ایک مجموعہ 'تحریریں' کے علاوہ اردو ادب کے لیے لکھے گئے اداریوں کا مجموعہ 'پہلا ورق' اور ہندی میں شائع ایک شعری مجموعہ 'چندن کا پیڑ' ان کے باقیات میں شامل ہیں۔ مرحوم نے سب سے پہلے ذاکر حسین کالج سے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ بعد ازاں جے این یو چلے گئے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک کل وقتی ناقد و ادیب تھے اسی لیے سبکدوشی کے بعد بھی انجمن ترقی اردو کے معیاری مجلّہ 'اردو ادب' کی ذمے داری بحیثیت ایڈیٹر سنبھال لی اور اس معیاری رسالے سے آخری وقت تک وابستہ رہے۔ موصوف کے انتقال نے پوری اردو دنیا کو غمزدہ کردیا ہے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مرکزی دفتر میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام ہوا جس میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے جملہ اراکین کی موجودگی میں مرحوم سے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک مشفق استاد اور نہایت سنجیدہ و وضع دار ادیب و شاعر کے علاوہ نہایت منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی اور ان کے چشمۂ فیضان سے فیضیابی کا سلسلہ 4 دہوں تک پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے مرحوم کے سانحۂ ارتحال کو اردو زبان و ادب کا ناقابل تلافی خسارہ قرار دیا اور ان کے پسماندگان سے ہمدردی ظاہر کی نیز مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 ستمبر 2017

کونسل کے تعاون سے

محبوب نگر میں یک روزہ سمینار

محبوب نگر: ملک کی تعمیر نو کے لئے نظم ونسق عامہ کا کردار اہمیت کا حامل ہے نظم ونسق عوام کو بہتر خدمات اور سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر رجبہ رتنم وائس چانسلر پالمورو یونیورسٹی محبوب نگر نے ایم وی ایس گورنمنٹ ڈگری و پی جی کالج محبوب نگر شعبہ نظم و عامہ کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے منعقدہ یک روزہ قومی سمینار سے کیا انھوں نے مزید کہا کہ قانون حق اطلاعات بھی عام شہریوں کے لیے انتظامی جوابدہی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ پروفیسر سعید عبدالمنیم پاشاہ صدر شعبہ سیاسیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے خطاب میں کہا کہ حکومت کی سرگرمیوں کا مرکز شہری ہوتے ہیں اور نظم ونسق شہریوں کو بہتر خدمات فراہم کرتا ہے چنانچہ حکومت اور نظم ونسق کی سرگرمیوں میں جتنا زیادہ اضافہ ہوگا شہریوں سے بھی حکومت کا تعلق بڑھے گا اکیسویں صدی ٹکنالوجی کی صدی ہے اس صدی میں نظم ونسق عامہ میں بھی نئے رجحانات فروغ پا رہے ہیں جن میں شہریانہ، آفات سماوی کا انتظامیہ، بہتر حکمرانی، الکٹرانک حکمرانی اور عوامی کردار و دیگر شامل ہیں بہتر حکمرانی اور موثر نظم ونسق کسی بھی حکومت کی اولین ذمہ داری ہوتی ہیں انھوں نے مزید کہا کہ رشوت خوری ایک عالمی مسئلہ ہے رشوت خوری کے خاتمہ کے لیے بھی نظم ونسق عامہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وی گیتا نائیک کنوینر سمینار نے افتتاحی کلمات ادا کیے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جی یادگیری نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر بی رجبہ رتنم، وائس چانسلر پالمورو یونیورسٹی، محبوب نگر نے سمینار کے سوونیر کا رسم اجرا انجام دیا۔ سمینار کا کلیدی خطبہ پروفیسر پارتھا سارتھی ڈائرکٹر علاقائی مرکز برائے شہری و ماحولیاتی مطالعات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے پیش کیا۔

سمینار میں چار ٹکنیکل اجلاس منعقد ہوئے جس کی صدارت ڈاکٹر کنیز ظہرہ، صدر شعبہ نظم ونسق عامہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ڈاکٹر عبدالقیوم ایسوسی ایٹ پروفیسر نظم ونسق عامہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد ڈاکٹر امریندر ریڈی، نائب ڈائرکٹر علاقائی مرکز برائے شہری و ماحولیاتی مطالعات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، للت کمار شعبہ نظم ونسق عامہ عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ ان چار اجلاسوں میں 50 سے زیادہ مقالے پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں اسنادات تقسیم کیے گئے۔ اس سمینار میں اساتذہ، اسکالر اور طلباء و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ مسٹر روی کمار معاون کنوینر، وینکٹ ریڈی، ڈاکٹر عزیز سہیل، آفرین سلطانہ، سرپی چی نائیڈو نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر گیتا نائیک کے شکریہ پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عبدالعزیز سہیل، ایم وی ایس ڈگری کالج، محبوب نگر، 12 ستمبر 2017

افسانے کی قرأت: تفہیمی اور تعبیری حکمت عملی

سرینگر: نظامتِ فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے زیرِ انتظام شیخ العالم یادگاری سالانہ خطبے کا 9 ستمبر 2017 اہتمام کیا

گیا ہے۔ یہ اس نوعیت کا تیسرا خطبہ تھا جسے امسال اُردو کے معروف اور ممتاز نقاد و دانشور اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر قاضی افضال حسین نے پیش کیا۔ علامہ اقبال لائبریری کے ابن خلدون آڈیٹوریم میں منعقد اس تقریب میں مقرر نے 'افسانے کی قرأت: تفہیمی اور تعبیری حکمت عملی' کے عنوان سے خطبہ پیش کرتے ہوئے فنِ افسانہ کی قرأت سے وابستہ مختلف جہات پر مدلل بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ افسانہ کسی بھی دوسری صنف سے کمتر نہیں ہے بلکہ افسانہ نگار کو ادب کا نوبل انعام بھی تفویض ہوا ہے۔ پروفیسر افضال کے خطبے کے بعد حاضرین نے صحت مند بحث کی۔ اس تقریب کی صدارت معروف فکشن نگار اور سابق صدر شعبۂ اُردو پروفیسر منصور احمد منصور نے کی۔ ناظمہ نظامتِ فاصلاتی تعلیم پروفیسر نیلوفر خان نے ادارے کا مفصل تعارف پیش کیا اور مہمانِ خصوصی اور دوسرے حاضرینِ مجلس کا استقبال کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر عرفان عالم نے انجام دی۔ جب کہ مہمان کا تعارف اور تقریب پر شکریے کی تحریک ڈاکٹر الطاف انجم نے پیش کی۔ اس تقریب کے دوران سلیم سالک کی کتاب 'اردو افسانہ: مزاج و منہاج' کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ اس موقعے پر جناب ناصر مرزا، پروفیسر مشتاق احمد، ڈاکٹر طارق چستی، جناب جاوید احمد بچو، جناب حبیب اللہ شاہ، ڈاکٹر محمد اشرف لون، ڈاکٹر شاہ فیصل، اصغر رسول، سلیم سالک، بشارت شمیم، ڈاکٹر معروف شاہ کے ساتھ ساتھ طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ واضح رہے کہ اس خطبے کی مالی معاونت قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی نے کی۔

روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' سری نگر، 8 ستمبر 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

جامعہ ہمدرد نے یونانی میڈیسن میں بہترین کام کیا ہے: ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد نے علم وتحقیق

سمیت مختلف میدانوں میں باہمی تعاون اور اپنی ایجادات واختراعات کے میدان میں مشترکہ تبادلہ کے لیے آپس میں ہاتھ ملایا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چانسلر اور منی پور کی گورنر نجمہ ہپت اللہ کی پہل اور صدارت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ ایک اہم اجلاس میں مذکورہ چاروں یونیورسٹیوں کے سربراہان کے درمیان بات چیت کے بعد اس بارے میں آگے بڑھنے اور لائحہ عمل متعین کرنے کے لیے غور وخوض کیا گیا۔ چانسلر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اے گریڈ یونیورسٹی بنانے کا ان کا خواب ہے اور یہ پہل اس میں مددگار ثابت ہوگی۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کے سابق ایگزیکیٹو وائس چانسلر اور پرووسٹ پال جوزیف ڈونیر نے کہا کہ ہندوستان کی ان تینوں یونیورسٹیوں میں بہت کچھ خاص ہے۔ ماس کمیونیکیشن کے لیے جامعہ کا ایم سی آر سی، فارمیسی کے لیے جامعہ ہمدرد تو انجینئرنگ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی معروف ہے اور ہم سب مختلف میدانوں میں ایک دوسرے کا تعاون کر سکتے ہیں۔ چانسلر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ یہ ہمارے لیے خوش قسمتی کا لمحہ ہے کہ چار یونیورسٹیوں کے سربراہان ایک اہم اور باہمی تعاون پر تعلیم کی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کے لیے آج متحد ہوئے ہیں۔ مشترکہ تعاون کے خیال کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جامعہ ہمدرد نے یونانی میڈیسن میں بہترین کام کیا ہے اور بہت سی ایجادات کی ہیں، ہم بھی ان کی ان کوششوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایم سی آر سی آج ملک میں اولین درجہ بندی کا ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ، جامعہ کے انجینئرنگ اور الیکٹرانک محکموں میں بھی بہت اچھا کام ہوا ہے۔ اسی طرح جامعہ نے شمسی توانائی کے شعبے میں بھی اچھا کام کیا ہے۔

طارق منصور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کہا کہ ان کی یونیورسٹی مکمل طور پر رہائشی ہے۔ حال ہی میں اس یونیورسٹی نے انٹرنیشنل لرننگ سینٹر کھول دیا ہے۔ اس کا انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ عالمی سطح پر مشہور ہے۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر سید احتشام حسنین نے بتایا کہ اس کا فارمیسی شعبہ ہندوستان میں سب سے بہتر شعبوں میں سے ایک ہے۔ یونانی فارمیسی میں اس نے بہت سے اہم ایجادات کیے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اگست 2017

جشن بھارت

نئی دھلی: ملک کی 71ویں آزادی کے موقعے پر انڈین ہیریٹیج اینڈ ہیلتھ کیئر کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'سالانہ جشن بھارت' منایا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی وزیر برائے اقلیتی امور (حکومت ہند) سید مختار عباس نقوی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر فائنس سکریٹری اشوک لواسہ اور محترمہ نوول لواسہ کے ذریعے کیمرے میں قید کی گئی ملک کے مشہور مقامات کی تصویری نمائش کا افتتاح بھی مہمانانِ خصوصی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔

جھارکھنڈ کے سابق گورنر سید سبط رضی کی سرپرستی میں منعقد ہونے والے اس سالانہ جشن میں ممتاز شاعرہ پروفیسر مینو بخشی کی کتاب 'موج سراب' مہمانان کو پیش کی گئی، پروفیسر مینو نے حب الوطنی پر مبنی غزلیں بھی پیش کیں جس کے بعد ملکہ ترنم انیتا سنگھوی نے 'اے میرے وطن کے لوگو' گیت پیش کیا، بعد میں صوفیانہ کلام اور کئی غزلیں بھی پیش کرکے ناظرین سے داد وتحسین حاصل کی۔

تقریب کے روح رواں پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے خطبہ استقبالیہ میں ملک کی آزادی اور عصر حاضر میں گنگا جمنی تہذیب کے فروغ پر اظہار خیال کیا۔ کابینہ وزیر مختار عباس نقوی نے اس طرح کی تقریبات کے اہتمام کو عہد حاضر کی ضرورت بتایا۔ جشن بھارت کی اس اہم تقریب میں ملک کے ممتاز کارڈیولوجسٹ ڈاکٹر نریش ترہن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد اور ممتاز شاعرہ محترمہ مینو بخشی کو مہمانان کے دست مبارک سے 'فخر ہند ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ مہمانان کا خیر مقدم گلدستہ پیش کرکے کمشنر نجیب اشرف چودھری، حیدر کمال نقوی، علی عابدی امروہی نے کیا جبکہ اختتام پروگرام پر اشیخ رضا زیدی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اگست 2017

تحقیقی مضامین کیسے لکھیں' پر ورکشاپ

نئی دهلی: تدوین ایک سائنس ہے۔ ہندوستان کو

اچھے مصنف، بہترین محقق اور ماہر تخلیق کاروں کی ضرورت ہے۔ ماضی کے مقابلے میں ریسرچ آج جتنی آسان ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انجینئرنگ ہال میں ڈاکٹر ذاکر حسین سینٹرل لائبریری کی جانب سے منعقد ایک ورکشاپ کے افتتاحی پروگرام میں خطاب کے دوران مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کیا۔ ورکشاپ کا موضوع 'تحقیقی مضامین کیسے لکھیں اور شائع کیے جائیں؟' تھا۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی کی حیثیت سے نیچرل سائنس کے ڈین پروفیسر شریف احمد بھی موجود تھے۔ پروفیسر طلعت احمد نے طلبا اور محققین کو تلقین کرتے ہوئے کہا کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ لکھنا اہم نہیں ہے بلکہ کم مگر بہت اچھا لکھنا اہم ہے جو شائع ہو تو نہ صرف ہنگامہ برپا کرے بلکہ لوگوں کو سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور کرے۔ اس موقعے پر آزاد محقق ڈاکٹر پائل کمار نے تحقیقی مضامین کس طرح لکھے جائیں اور اس کی اشاعت کو کیسے ممکن بنایا جائے، اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس درمیان سوال جواب کا بھی سیشن رکھا گیا جس میں طلبا نے ان سے سوالات کیے اور ڈاکٹر پائل کمار نے طلبا کو تسلی بخش جوابات دیے۔ ڈاکٹر پائل کمار نے طلبا سے سوالات بھی کیے اور اطمینان بخش جواب دینے والے طلبا کو انعام سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے لائبریرین ڈاکٹر ایچ جے عابدی نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری محققین کے لیے یک بہترین جگہ ہے جہاں وہ اپنی علمی و ادبی تشنگی بجھا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مختلف علوم و فنون سے متعلق رسائل و جرائد کو بھی آن لائن کر دیا ہے جس سے صرف جامعہ کے ہی طلبا نہیں بلکہ باہر کے شائقین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس ورکشاپ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علاوہ دہلی یونیورسٹی اور جے این یو کے طلبا بھی موجود تھے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اگست 2017

دهلی:

معاصر اردو افسانے پر مکالمہ

نئی دهلی: معاصر اردو افسانے سے جہاں پروشٹ کی آواز غائب ہو چکی ہے وہیں عصری موضوعات کی نمائندگی کا فقدان، زبان و بیان کی غلطیاں اور فنی رکھ رکھاؤ میں کمی کی وجہ سے اردو افسانے سے قاری کا رشتہ قائم نہیں ہو رہا ہے۔ یہ بات مقررین نے کہی۔ آج کل کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے 'معاصر اردو افسانے پر مکالمہ' کے موضوع پر آواز چیری ٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام معروف افسانہ نگار خورشید حیات کی تقریب پذیرائی کی صدارت کرتے ہوئے اور اپنے مقالے 'اردو افسانے کی صورتِ حال' میں عصری افسانوں سے متعلق خدشات اور وسوسے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ آج کے افسانوں میں واقعات کی کھتونی ہوتی ہے۔ کوئی ایسا کردار سامنے نہیں آرہا ہے جو ہماری یادداشت کا حصہ بن جائے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے نئے لکھنے والوں کے یہاں زبان و بیان کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ آج کے مدیران کے لیے معیاری افسانوں کا انتخاب ایک بڑا مسئلہ ہے۔ عصری موضوعات کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ جدید دنیا کی ٹکنالوجی نے لکھنے والوں کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ حقانی القاسمی نے خورشید حیات کے اسلوب پر بات کی اور ان کی زبان کے حوالے سے کہا کہ ان کے مضامین، ان کے افسانوں کی تخلیقی خواہش کا ہی اظہاریہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس نوع کے مکالمے عصری ادب کی سمت و رفتار کا تعین کرتے ہیں۔ خورشید حیات جو ریلوے میں اعلیٰ افسر بھی ہیں، نے اس موقعے پر اپنا افسانہ 'پہاڑ ندی عورت' پیش کیا۔ معروف ادیبہ نسترن فتیحی نے عصری افسانوں کے مزاج پر بات کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خان محمد آصف، معروف صحافی ڈاکٹر زین شمسی، ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خان محمد رضوان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس سمپوزیم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جے این یو کے ریسرچ اسکالرز کے علاوہ ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر عبدالحئی، ڈاکٹر احمد خان، ڈاکٹر زاہد ندیم، ڈاکٹر جاوید حسن، معین قریشی، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، عابد انور، ڈاکٹر نشاط حسن، ڈاکٹر اسعد، ڈاکٹر تسیم احمد، احتشام فلاحی، شکیل الرحمٰن اور شاداب شمیم نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 اگست 2017

اردو کی نئی بستیاں: ایک جائزہ

نئی دهلی: نادی الطلبہ جامعہ اسلامیہ سنابل کے شعبۂ ثقافت کے زیر اہتمام 'اردو کی نئی بستیاں- ایک جائزہ' کے موضوع پر گذشتہ شام بعد نماز مغرب جامع مسجد عمر بن خطاب جامعہ اسلامیہ سنابل میں افتخار راغب کا اہم محاضرہ ہوا جس میں صدارت کے فرائض معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز جامعہ کے طالب علم عبدالصمد انیس احمد کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد مولانا فضل الرحمٰن ندوی مشرف نادی الطلبہ جامعہ اسلامیہ سنابل نے محاضر محترم کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اردو کی سرگرمیوں کے تعلق سے ڈنمارک، لندن، جرمنی اور چین میں اردو کی کئی تنظیموں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ امریکہ کے ہر شہر میں لوگوں نے اردو کی تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ قطر میں 24 گھنٹے اردو میں پرگرام ہوتا ہے اور قطر، سعودی عرب وغیرہ میں اردو کے اخبارات بھی نکلتے ہیں۔ اس موقعے پر موصوف نے سامعین کے سوالوں کے جوابات بھی دیے۔ نشست کے فوراً بعد شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اگست 2017

اترپردیش:

'اردو ادب اور پریم چند' پر سمینار

آگرہ: تاج نگری میں مشہور اردو ہندی زبان کے ادیب منشی پریم چند کے یوم پیدائش پر 32 روزہ پروگرام کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اس کے تحت گذشتہ کئی روز سے شہر کے مختلف مقامات، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں پروگرام ہو رہے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک سمینار 'اردو ادب اور پریم چند' کے عنوان سے موتی کنج جمنا کنارے واقع دارا شکوہ لائبریری میں منعقد کیا گیا۔ سمینار میں مہمان خصوصی کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر طارق چھتاری اور

پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے شرکت کی۔ سمینار کی صدارت سید اجمل علی شاہ نے کی اور نظامت ڈاکٹر نسرین بیگم نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ ادب دنیا کو شامل کرنے کا کام کرتا ہے۔ پریم چند کا ادب بھی محبت کی بات کہتا ہے۔ پریم چند کا ادب ہندی یا اردو والوں کے لیے نہیں بلکہ دل والوں کے لیے عظیم ادب ہے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ پریم چند کا ادب ہماری زندگی میں تبدیلی لاتا ہے اس لیے وہ زندہ ادب ہے۔ پروفیسر برجیش چندر نے کہا کہ اس سمینار کے لیے داراشکوہ لائبریری کا انتخاب کیا گیا کیونکہ داراشکوہ سیکولر تھے۔ دارا نے اسی جگہ ویدوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ وہیں انل شکلا نے پروگرام کی تفصیل بیان کی۔ پروگرام کی نظامت کررہی ڈاکٹر نسرین بیگم نے منشی پریم چند کے اردو میں لکھے گئے ادب کی تفصیلی جانکاری دی۔ اجمل علی شاہ نے کہا کہ پریم چند کا ادب ہندی یا اردو کا ادب نہیں بلکہ عام لوگوں کا ادب ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر اکھلیش شروتری، جیوتسنا رگھوونشی، یوگیندر دوبے، شاہد ندیم، اختر وارثی، ماہر اکبرآبادی اور احمد وغیرہ موجود رہے۔ امیر احمد نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اگست 2017

سرسید: علم الکلام کے بانی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف شیعہ تھیولوجی میں بین الاقوامی سمینار 'سرسید علم الکلام کے بانی' میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے معروف اسکالر ڈاکٹر

مظفر حسین سید نے کہا کہ سرسید احمد خاں علم کلام کے موجد یا بانی نہیں ہیں۔ علم الکلام پہلے سے موجود تھا، انھوں نے کہا کہ دورِ عباسی میں یونانی فلسفہ کے حملے کے بعد وہاں کے علما نے حالات کو بہتر کرنے کے لیے اور عالم اسلام کو شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کو ایجاد کیا تھا، سرسید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس علم کو ہندوستان میں لاکر مروج کیا اور عام فہم الفاظ سے سمجھایا تاکہ عام لوگ بھی اس سے واقف ہوسکیں، انھوں نے کہا کہ سرسید کے بعد ان کے رفقا میں شریک مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی نے اس مہم کو آگے بڑھایا، علامہ شبلی نے دو کتابیں اسی موضوع پر لکھیں جس سے علم الکلام نے ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کے سبھی مدارس میں علم الکلام نصاب کا حصہ ہے جو پہلے نہیں تھا۔ معروف عالم دین مولانا کلب جواد نے کہا کہ عام طور پر کہا گیا کہ مولانا شبلی نعمانی جدید کلام کے بانیوں میں ہیں لیکن آج سمینار میں یہ بحث ہورہی ہے کہ اس سے قبل سرسید نے علم کلام کی شروعات کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اسی ضمن میں ہمارے خاندان کے تاج العلما علی محمد نے بھی علم الکلام پر کئی تصانیف لکھی ہیں اس لیے ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ کون بانی تھا کیونکہ سمینار میں اسی پر گفتگو ہورہی ہے، مولانا کلب جواد نے کہا کہ البتہ سرسید کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سائنس اور مغربی ایجادات کو بنیاد بنا کر قرآن اور اسلام کو سمجھنے کی تلقین کی۔ اردو اکادمی (مسلم یونیورسٹی) کے ڈائریکٹر پروفیسر راحت ابرار نے کہا کہ سرسید ہندوستان میں جدید فکر کے بانی تھے، انھوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید محسوس کررہے تھے کہ جب تک ہم اسلام کو فطرت سے اور قدرت سے شامل نہیں کریں گے تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ شعبہ قانون (مسلم یونیورسٹی) کے استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ سرسید احمد خاں کا ماننا تھا کہ صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ قرآن آسمانی کتاب ہے اور اللہ کا کلام ہے بلکہ ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ واقعی اس میں ایسی خوبیاں ہیں جو صرف اللہ کے کلام میں ہوسکتی ہیں۔ شعبۂ دینیات کے استاد ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے کہا کہ آج دانشورانِ قوم وملت کو اسلام کی صحیح تعلیم مذاہب عالم کے لوگوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار میں تقی رضا برقی، ڈاکٹر محب الحق، پروفیسر سمیع اختر، پروفیسر سعود عالم قاسمی، پروفیسر ظفر صدیقی، ڈاکٹر مشتاق تجاوری، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر عبیداللہ فہد، ڈاکٹر ندیم اشرف اور ڈاکٹر شائستہ پروین وغیرہ نے اپنے مقالات پڑھے، اس موقعے پر بڑی تعداد میں اساتذہ وطلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 ستمبر 2017

بہار:

اسمارٹ فون پر اب اردو میں بھی وائس ٹائپنگ کی سہولت

دربھنگہ: اب اردو زبان اور اردو رسم خط میں بھی اسمارٹ فون کے لیے گوگل وائس ٹائپنگ کی سہولت دستیاب ہوگئی ہے۔ اہل اردو کے لیے یہ خبر حیرت واستعجاب کی تو بالکل نہیں لیکن انتہائی خوشی ومسرت کی ضرور ہوگی کہ اب لوگوں کو واٹس ایپ، فیس بک ٹوئٹر جیسی سوشل میڈیا اور ای میل پر اردو زبان اور اردو رسم خط میں اپنا پیغام، خبر یا مضمون تحریر کرنے کے لیے ہاتھ کا استعمال نہیں کرنا ہوگا۔ اب وہ اپنے اسمارٹ فون پر منہ سے اپنا پیغام بولیں گے اور ان کی اسکرین پر ان کی باتیں تحریری شکل میں نمودار ہوتی چلی جائیں گی۔ اسے تحریر الصوت (وائس ٹائپنگ) کہتے ہیں۔ یہ کوئی عجوبہ نہیں ہے۔ دیگر یورپین زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی اور دیگر دکنی زبانوں میں بھی یہ سہولت دستیاب تھی۔ اردو میں ابھی تک یہ سہولت دستیاب نہیں تھی لیکن اہل اردو اس تعلق سے ناامید نہیں تھے کیونکہ انھیں امید تھی کہ جب دائیں سے بائیں لکھی جانے والی زبانوں عربی اور فارسی اور دیگر یورپین زبانوں میں یہ سہولت دستیاب ہے تو اردو میں بھی یہ سہولت ضرور دستیاب ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو میں بھی اب یہ سہولت ملنے لگی ہے۔ یہ سہولت اہل اردو کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ خاص طور سے صحافت اور تصنیف وتالیف کے کام سے وابستہ افراد کے لیے اس سے بڑی سہولت ہوگی۔ فی الحال کئی طرح کی کمیاں ضرور ہیں لیکن امید ہے کہ جلد ہی یہ کمی بھی دور ہوجائے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اگست 2017

تلنگانہ

تعمیر شخصیت، فکر اقبال کی روشنی میں

حیدرآباد: ''اقبال ایک آفاقی شاعر تھے۔ ان کی فکر کو کسی خطہ ارض، ملک یا علاقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت، بھائی چارہ

اور یکجہتی کا پیغام دیا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جناب ضیاء الدین نیر، نائب صدر اقبال اکادمی حیدرآباد نے 'تعمیر شخصیت فکر اقبال کی روشنی میں' کے موضوع پر اقبال اکادمی آڈیٹوریم میں منعقدہ سمینار میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ اقبال چاہتے تھے کہ نوجوان کی شخصیت غیرت وحمیت کے ساتھ حرکت وعمل کا پیکر ہو۔ وہ تن آسانی کی بجائے جفاکشی وشجاعت کو اپنا شعار بنائیں۔ وہ گفتار کے نہیں کردار کے غازی بنیں۔ نوجوان کسی بھی قوم کا اصل اثاثہ ہوتے ہیں۔ نوجوان اپنی شخصیت میں کلام اقبال کی روشنی میں تبدیلی لائیں۔ بلند عزائم، جرأت وہمت پیدا کریں۔ جناب ضیاء الدین نیر نے اقبال اکادمی کے حیدرآباد میں قیام اور اس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اہل علم خصوصاً نوجوانوں پر زور دیا کہ وہ اقبال اکادمی کی وسیع وعریض لائبریری جس میں زائد از ایک لاکھ کتابیں ہیں سے استفادہ کریں۔ معروف بین الاقوامی دانشور ڈاکٹر جعفر حسین قریشی، ڈائرکٹر اقبال اکادمی لندن نے یورپ وامریکہ میں اقبال پر ہونے والی تحقیق وفکر اقبال کی ترویج وتبلیغ کے لیے جاری سرگرمیوں سے مطلع کیا۔ انھوں نے کہا کہ مغرب میں اقبال اور اقبالیات پر بہت کام ہو رہا ہے۔ ترکی میں اقبال بہت مقبول ومعروف ہیں۔ کئی یونیورسٹیز اور تعلیمی ادارے اقبال پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر مجید بیدار، سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ نے فکر اقبال کے لیے جاری سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کام ہو رہا ہے لیکن اسے اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'قاصد' دہلی، 20 اگست 2017

اردو نصاب کے آن لائن ویڈیو

نظام آباد: تلنگانہ وآندھرا کے سبھی ڈگری کالجوں میں اردو زبان دوم مطالعہ ادب حصہ اول ودوم کے نصاب اور شرح پر مبنی آن لائن ویڈیو اسباق ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج کالج کی جانب سے تیار کیے گئے ہیں۔ ان اسباق کی خاص بات یہ ہے کہ ویڈیو میں نصابی نظموں اور غزلوں کے متن کے ساتھ سوال جواب کی شکل میں متن کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ اسکرین پر جواب کے متن کے ساتھ پیچھے سے درست تلفظ کے ساتھ متن کو پڑھ کر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ طلباء ان ویڈیوز کو آن لائن یا آف لائن ڈاؤن لوڈ کرکے اپنے فون یا کمپیوٹر پر پڑھ سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کے طلباء کی جانب سے انٹرنیٹ اور فون کا استعمال بڑھتا جارہا ہے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے محسوس کیا کہ طلباء کے ذوق کی مناسبت سے اردو نصاب اور اس کی شرح کو ویڈیوز کی شکل میں پیش کردیا جائے۔ یہ ویڈیوز شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد کی ویب سائٹ girrajcollegeurdu.blogspot.in اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کے یوٹیوب چینل aslam faroqui پر اور گری راج کالج کی ویب سائٹ ggcnzb.ac.in شعبہ اردو پیج پر دستیاب ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، نظام آباد، تلنگانہ، 13 اگست 2017

راجستھان:

ساحر لدھیانوی: کچھ یادیں کچھ باتیں

جودھپور: جودھپور میں راجستھان اردو اکادمی کے زیر اہتمام 'ساحر لدھیانوی: کچھ یادیں کچھ باتیں' کے

عنوان سے دو روزہ کل ہند سمینار کا انعقاد ہوا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت معروف شاعر شین کاف نظام نے کی، جبکہ افتتاح مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر اختر الواسع نے کیا۔ مہمان ذی وقار کے طور پر راجستھان سنسکرت اکادمی کی صدر ڈاکٹر جیا دوے شریک ہوئیں۔ اس کے علاوہ معروف صحافی راج کمار کیسوانی، معروف شاعر اور صحافی چندر بھان خیال بھی موجود تھے۔ راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین اشرف علی جلجی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا جبکہ نظامت معظم علی نے کی۔ اس موقعے پر معروف شاعرہ ملکہ نسیم اور لوکیش ساحل نے ساحر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر جیا دوے نے کہا کہ وہ ساحر سے بہت متاثر رہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان کوئی بھی ہو وہ ہمارے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ چندر بھان خیال نے ساحر کو یاد کرتے ہوئے راجستھان اردو اکادمی کو مبارکباد دی کہ اس نے اتنے بڑے سمینار کا اہتمام کیا۔ راج کمار کیسوانی نے ساحر کی فلمی زندگی سے متعلق ان گنت واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ساحر کی شاعری کو خراج عقیدت پیش کیا۔ شین کاف نظام نے ساحر لدھیانوی کو بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھیں علم کو فلم اور فلم کو علم بنانے میں ملکہ حاصل تھا۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خطاب میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ساحر نئی نسل کے دلوں کی دھڑکن تھے۔ وہ فیض کے بعد ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مقبول بھی تھے۔ ساحر نے عورت کے استحصال کے خلاف اپنی شاعری کا موثر استعمال کیا۔ وہ جنگ کا مخالف اور امن کا نقیب تھا۔ دو روزہ سمینار میں پروفیسر صغیر افراہیم علی گڑھ، پروفیسر صفدر امام قادری پٹنہ، پروفیسر انور ظہیر انصاری بڑودہ، ڈاکٹر خالد اشرف دلی، ڈاکٹر حسین رضا خان جے پور، ڈاکٹر ثروت النساء خاں اودے پور، ڈاکٹر نغمہ پروین کانپور، ڈاکٹر شبنم خان جے پور اور غزال ضیغم لکھنؤ سمیت مقامی ادیبوں اور دانشوروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اس سمینار کی اختتامی نشست کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر شین کاف نظام شریک ہوئے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے ساحر کی زندگی اور تخلیقی کاموں پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اگست 2017

کرناٹک:

17 واں کل ہند مشاعرہ

بنگلور: اردو زبان دنیا کی میٹھی زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا ادب اور شاعری نہ صرف دلوں کو چھو لینے والی ہے بلکہ انقلاب برپا کرنے والی صفت رکھتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کرناٹکا اردو چلڈرنس اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر حافظ کرناٹکی نے کیا۔ وہ گذشتہ شب کوتک مارٹ کے اشتراک سے اسٹار ایونٹ کے زیر اہتمام منعقدہ 17 ویں کل ہند مشاعرہ سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرہ چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ آج اس ہال میں مخصوص لوگوں کو مدعو کیا گیا ہے جنھیں اردو زبان و ادب سے بے حد لگاؤ ہے۔ انھوں نے محمد رفیع دھارواڑ کر اور ان کی ٹیم کی ستائش کی اور کہا کہ انھی کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ یہ کامیاب محفل منعقد ہو پائی ہے۔ حافظ کرناٹکی نے کہا کہ سامعین ذی فہم ہوں اور منتظمین کے ساتھ چلیں تو ہر مشاعرہ نہ صرف کامیاب ہوگا بلکہ اردو زبان کی ترقی کا ضامن بھی ہوگا۔ انجم باپوڑی کی توصیف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر کا مجموعہ کلام کی رسم اجرا بنگلور سے عمل آنا ہم کرناٹک والوں کے لیے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے انجم باپوڑی کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ آپ یونہی اپنی خدمات جاری رکھیں اور بنگلور کے شائقین اردو کی پذیرائی کرتے رہیں۔

مہمان خصوصی ریاستی وزیر برائے حج وشہری ترقیات

آر روشن بیگ نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مشاعرے اردو زبان کا تہذیبی ورثہ ہیں۔ انھیں باقی رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس موقعے پر ریان ایجوکیشنل سوسائٹی آف انڈیا کے صدر حیدر علی خان نے کہا کہ آج اردو زندہ ہے تو اسکولوں کی بدولت نہیں بلکہ مدرسوں کی بدولت زندہ ہے۔ ہمیں مدرسوں کے ساتھ سرکاری اسکولوں اور دیگر کانونٹوں میں بھی اردو زبان کا ایک سبجیکٹ رکھنے پر دباؤ ڈالنا ہوگا اور اس طرح ہم اردو کو قائم رکھ سکتے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 7 اگست 2017

مہاراشٹر:

ممبئی میونسپل کارپوریشن کے اسکولوں میں اردو کا بول بالا

ممبئی: ممبئی میں میونسپل کارپوریشن کے زیر اہتمام پرائمری، اپر پرائمری اور سیکنڈری جماعتوں کے طلبا کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے اور اردو میڈیم کے بچوں نے مراٹھی کے اسکولوں اور بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے جو کہ اردو داں طبقے کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کا انکشاف اور کسی نے نہیں شیوسینا لیڈر اور ممبئی کے میئر وشواناتھ مہاڈیشور نے کیا ہے اور مسلمان مادری زبان پر فخر کرتے ہیں، حالانکہ اردو ایک قومی زبان ہے اور اس کی مٹھاس کے قائل ہیں۔ واضح رہے کہ بی ایم سی کے تحت میونسپل اسکولوں میں ہندی، مراٹھی، اردو، انگریزی، گجراتی، سمیت جنوبی ہند کی کنڑ، تیلگو اور تمل زبانوں کے بچے زیر تعلیم ہیں اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں میں ہے جبکہ حیرت انگیز طور پر اردو زبان کے طلبا کی تعداد مراٹھی مادری زبان کے طلبا سے زیادہ ہو چکی ہے کیونکہ مراٹھی داں طبقہ بھی بچوں کو انگریزی میڈیم سے تعلیم دلانے کو ترجیح دے رہا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ مراٹھی والے انگریزی میڈیم کی دوڑ میں اور آگے نکلنے کے چکر میں ہیں اور اپنی زبان اور ثقافت کو نظر انداز کر رہے ہیں، جس کا الزام اردو داں طبقے پر عائد کیا جاتا ہے۔

ممبئی میونسپل کارپوریشن میں ہندی، انگریزی اور اردو جیسی قومی زبانوں کے ساتھ مراٹھی اور علاقائی زبانوں کے بچے بھی زیر تعلیم ہیں۔ میئر کا کہنا ہے کہ مراٹھی داں طبقہ انگریزی ذریعہ تعلیم کو ترجیح دیتا ہے جبکہ اردو والوں کا ایک بڑا طبقہ اردو ذریعہ تعلیم کو ترجیح دیتا ہے جن میں متوسط اور پسماندہ طبقے شامل ہیں۔ بی ایم سی کے اعداد و شمار کے مطابق ممبئی شہر میں اردو میڈیم کے 201 اسکولوں میں طلبا کی تعداد امسال ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے اور دوسرے نمبر پر ہندی ذریعہ تعلیم کے بچے ہیں جن کی تعداد تقریباً 81 ہزار پہنچ گئی اور تیسرا نمبر 61 ہزار طلبا کے ساتھ انگریزی میڈیم کے بچوں کا ہے اور حیرت انگیز طور پر مراٹھی میڈیم بچوں کی تعداد صرف 47 ہزار 940 پہنچی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ مراٹھی کے ان اسکولوں میں پانچ سال قبل بچوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی لیکن انگلش میڈیم کے چکر میں والدین نے انھیں بی ایم سی کے اسکولوں میں بھیجنا چھوڑ دیا ہے۔ ماہر تعلیم سلیم الوارے کا کہنا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ حال میں اردو کو روزگار سے وابستہ کرنے کی کوشش میں اضافہ ہوا ہے اور مہاراشٹر ایک ایسا صوبہ ہے جہاں پرائمری سطح سے اعلیٰ تعلیم اردو سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے اور ہمیں صرف کالجوں اور یونیورسٹی کی سطح پر طلبا کی تعداد بڑھانے کے لیے حکمت عملی تیار کرنا چاہیے، جس کا فقدان ہے۔ اردو اسکول میں بچوں کی تعداد میں اضافہ ایک پر مسرت لمحہ ہے اور اسے فروغ دینے کی کوشش جاری رہنا چاہیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 21 اگست 2017

مدھیہ پردیش:

اندور میں یادِ شاداں اندوری کے تحت سمینار اور عالمی مشاعرہ منعقد

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی نے بھی مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کا صوبے کے ادیبوں/ شاعروں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اور یاد میں ان سے متعلق شہر میں جاکر خراج عقیدت پیش کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس سلسلے میں ابھی تک جبل پور میں پنالال شریواستو نور، اجین میں کاشف الہاشمی، گوالیار میں جاں نثار اختر کی یاد میں تقریبات منعقد کی جاچکی ہیں۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے 19 اگست 2017 کو اندور میں 'یادِ شاداں اندوری' کا انعقاد ہوا۔ مدھیہ بھارت ہندی ساہتیہ سمیلن میں شاداں اندوری پر سمینار ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر عتیق اللہ، دلی نے فرمائی۔ شاداں اندوری کی شخصیت، حیات وفن پر ڈاکٹر صادق، دلی، جناب وسیم افتخار انصاری، گوالیار اور جناب عزیز اندوری، اندور نے مقالے پڑھے۔ جناب رشید اندوری، اندور نے سمینار کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر شاداں اندوری پر ایک مضمون نگاری مقابلہ منعقد ہوا جس میں مختلف اسکولوں کے 51 اسٹوڈنٹس نے مقابلے میں حصہ لیتے ہوئے اپنے مضمون پیش کیے۔ تمام مضامین اس سلسلے میں تشکیل کی گئی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیے جنھیں چیک کرنے کے بعد طوبیٰ نوشین انصاری، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول کو پہلا انعام روپے 2,000 سلمہ خان، الفلاح پبلک اسکول کو دوسرا انعام روپے 1,500، علیشہ، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول اور انم انصاری الفلاح پبلک اسکول کو ایک ہزار روپے ایک ہزار روپے کے تیسرے انعام کے ساتھ ٹرافی اور سبھی حصہ لینے والوں کو سرٹی فکیٹ دیے گئے۔

شام کو عالمی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جناب عتیق انظر (قطر)، جناب شکیل اعظمی (ممبئی)، جناب عقیل نعمانی (رامپور)، جناب جوہر کانپوری (کانپور)، جناب لیاقت جعفری (جموں، محترمہ شبینہ ادیب (کانپور)، جناب عزم شاکری (گنج ڈنڈوارہ) مقامی شعرا، جناب صابر صہبا، جناب ظہیر راز، جناب نوح عالم، جناب تشنج راحت، محترمہ نادیہ مسند، جناب شاہ نواز انصاری، جناب عمران یوسف زئی، جناب تجدید ساقی، جناب حنیف دانش اور جناب سرفراز نور نے کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت عتیق انظر نے اور نظامت منصور عثمانی نے فرمائی۔

پریس ریلیز: سکریٹری ایم پی اردو اکادمی، بھوپال، 23 اگست 2017

اعزاز و اکرام:

80 فیصد سے زائد نمبرات والے بچوں کو انعام

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک تقریب کے دوران ڈاکٹرس، وکلا، سماجی کارکنان، صحافی و دیگر میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا، ساتھ ہی بارہویں جماعت میں 80 فیصد سے زائد نمبر لانے والے بچوں کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر آئی سی سی کے چیئرمین سراج الدین قریشی، شیخ احمد الحسان (یو اے ای) اے سی پی (نارتھ)، راجندر سنگھ گوتم جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر سابق کونسلر عشرت جہاں، گلوکار شنکر ساہنی، فیشن ڈیزائنر گنی کپور، فلمی ڈائریکٹر دیویندر نیگی اور پنڈت پنکج جیسوانی نے شرکت کی۔ پروگرام کی روح رواں نکیتا شرما نے مہمانان کا گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا۔ ذرائع کے مطابق راجد حانی کے مختلف اسکولوں و اکادمیوں کے بچوں نے رقاصی، گلوکاری، ریمپنگ شو (ماڈلنگ) اور

سلیم صدیقی کا شعری مجموعہ 'تمہارے بعد' کا رسم اجرا

پلے شو پیش کر کے ناظرین سے داد و تحسین حاصل کی۔ اس موقعے پر سراج الدین قریشی نے سبھی بچوں کی جانب سے پیش کیے گئے پروگراموں کی ستائش کی، ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ بہتر مستقبل کے لیے لازمی ہے کہ خوب شوق و جذبے کے ساتھ محنت کریں۔ عشرت جہاں اور راجندر سنگھ گوتم نے اپنے خطاب میں بچوں کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ ایمانداری اور محنت کے بعد کسی بھی شخص کو کامیابی سے نہیں روکا جاسکتا ہے۔ اختتام پر تقریب کے کنوینر فخر الدین انصاری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 اگست 2017

تقریری مقابلہ میں اعزاز

پورنیہ: اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام اردو زبان حوصلہ افزائی منصوبہ کے تحت گذشتہ 26 جولائی کو ارریا ہائی اسکول میں مختلف موضوعات پر گریجویٹ، انٹر اور میٹرک و عالم و مولوی و فوقانیہ کے طلبا و طالبات کا تقریری مقابلہ کرایا گیا جس کے نتائج کا اعلان ججوں نے کردیا ہے۔ ضلع ایجوکیشن افسر اشوک کمار مشرا نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ اس تقریری مقابلہ میں کالجوں، اسکولوں اور مدرسوں کے ضلع بھر کے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس مقابلہ میں اول، دوئم، اور سوئم آنے والے طلبا و طالبات کو نقد انعامات دیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مقابلہ کے نتائج کا اعلان کردیا گیا ہے۔ گریجویشن میں ارریا کالج کی ساجدہ فرحین نے فرسٹ، مہیلا کالج فاربس گنج کی آراستہ مدرسہ اسلامیہ گیاری کا منتظر حسین، چپلس کالج کی ثمینہ ناز نے سکنڈ اور راحت عمران مدرسہ اسلامیہ یتیم خانہ ارریا و سلیمان احمد، نور فاطمہ مدرسہ اسلامیہ گیاری اور واجدہ ترنم مدرسہ اسلامیہ فاربس گنج نے تھرڈ پوزیشن حاصل کی ہے جن میں فرسٹ آنے والے کو پانچ ہزار ایک سو روپے، سکنڈ کو چار ہزار ایک سو اور تھرڈ آنے والے کو 31 سو روپے نقد انعام دیے جائیں گے۔ اس طرح مولوی انٹر میں فرسٹ آنے والی علیشہ فاطمہ گرلس ہائی اسکول ارریا کو فرسٹ پوزیشن، گرلس ہائی اسکول کی روزی رحمانی، نعت زریں گرلس ہائی اسکول نرپت گنج، منظر عالم مدرسہ نورالہدیٰ صندل پور کو سکنڈ پوزیشن حاصل ہوئی ہے۔ محمد دلشاد عالم ہائی اسکول اداباب مدرسہ اسلامیہ گیاری محمد حامل مدرسہ مدینۃ العلوم کمدا اپا کرسا کانٹا اور شفیع کنیز مدرسہ اسلامیہ گیاری کو تھرڈ پوزیشن حاصل ہوئی ہے۔ ان میں فرسٹ آنے والے کو 4 ہزار ایک سو، سکنڈ کو تین ہزار، ایکسو اور تھرڈ کو 2 ہزار روپے دیے جائیں گے۔ جبکہ میٹرک اور فوقانیہ کی کماری انیتا گرلس ہائی اسکول ارریا کو فرسٹ، محمد نافع خاں کیریئر گائڈ اکادمی ارریا محمد امین، مدرسہ نعمانیہ ڈومریا جوکی ہاٹ محمد اوقاف آزاد اکادمی نے سکنڈ اور نصر اقبال آئیڈیل اکادمی تبسم پروین آزاد اکادمی طوبہ فردوس گرلس ہائی اسکول ارریا اور بی بی نعیمہ نے تھرڈ پوزیشن حاصل کی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اگست 2017

اجرا:

مائی سویٹ ہوم

نئی دہلی: جامعہ ہمیشہ سے ہی بچوں کے اندر تخلیقی صلاحیت و پروان چڑھانے کے لیے مختلف طریقے سے ہمت افزائی کرتا رہا ہے۔ مائی سویٹ ہوم کی شکل میں ثمینہ مشرا اور شیر نادستور نے ایک اچھی کوشش کی ہے جس سے بچوں کے اندر ہمت پیدا ہوگی اور مستقبل میں وہ اس سے حوصلہ لے کر بہتر کارکردگی انجام دے سکیں گے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بچوں کی تخلیقات مائی سویٹ ہوم کے اجرا کے موقعے پر پرو وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بچے سماج کا مستقبل ہیں اور آگے کی ذمے داری انھیں کے کاندھوں پر پڑنے والی ہے اس لیے بچوں کی ہمت افزائی بے حد ضروری ہے، اسی لیے جامعہ اپنے قیام کے اوّلین دنوں سے ہی تعلیمی اور اس قسم کے ثقافتی پروگرام کا انعقاد کرتا رہا ہے جس سے طلبا کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوسکیں۔ طلبا کو ایسے مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس موقعے پر ایک مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں ثمینہ مشرا اور شیر نادستور کے علاوہ پونم بترا اور ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سیدہ نے کتاب کو سماج کا عکاس قرار دیا اور کہا کہ اس کے ذریعے صرف ایک عہد کو ہی سمجھنے میں مدد نہیں ملے گی بلکہ اس کے ذریعے معاشرے اور حالات کے بدلتے ماحول کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر پونم بترا نے کہا کہ یہ کتاب محض چھوٹے بچوں کی کہانی نہیں ہے بلکہ ان کی سوچ، فکر اور منزل کی تلاش کا پرتو ہے جس سے بچوں کی نفسیات اور ان کے داخلی اور خارجی حالات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ثمینہ مشرا دستاویزی فلم ہدایت کار جبکہ شیر نادستور ایک معروف قلم کار ہیں۔ پروگرام کی نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ آؤٹ ریچ پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر مکیش رنجن نے انجام دی جس میں بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سوسائٹی کی جنرل سکریٹری پروفیسر باراں فاروقی اسکولی بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 اگست 2017

تمہارے بعد

نئی دہلی: کوئی بھی زبان حکومت کے تحفظ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ زبانوں کو اس کے بولنے اور پڑھنے والے زندہ رکھتے ہیں لہٰذا یہ کہنا قطعی درست نہیں ہے کہ اردو زبان دم توڑ رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ پروفیسر اخترالواسع نے غالب اکادمی میں معروف شاعر اور صحافی سلیم صدیقی کے شعری مجموعہ 'تمہارے بعد' کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ ادبی و تعلیمی تنظیم اور ورکنگ جرنلسٹ کلب کے زیر اہتمام اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد اس تقریب کی صدارت سپریم کورٹ کے وکیل شاہد علی ایڈوکیٹ نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹرل کے صدر سراج الدین قریشی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر وائس آف امریکہ کے دہلی بیورو چیف سہیل انجم نے سلیم صدیقی کی شاعری کے حوالے سے مقالہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر معین شاداب نے انجام دیے۔ سلیم صدیقی کے شعری مجموعے کے حوالے سے کہا کہ اپنی شاعری میں انھوں نے غم جاناں کو بہت خوبصورتی سے غم زمانہ میں تبدیل کیا ہے اور اس سے ایک پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر

سراج الدین قریشی نے شعری مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ شاعر اور ادیب تمام تر دشواریوں کے باوجود زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ غریب نواز فاؤنڈیشن کے صدر مولانا انصار رضا، روزنامہ 'ہمارا سماج' کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر خالد انور نے سلیم صدیقی کی صحافت اور شاعری پر گفتگو کی۔ صدارتی تقریر میں شاہد علی ایڈوکیٹ نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے بات کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2017

محبت میں ڈوبا لڑکا

نئی دهلی: دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے اسمبلی سکریٹریٹ میں اسمبلی اسپیکر کے رامنواس گوئل کی

زیر صدارت منعقدہ تقریب میں جھجھر (ہریانہ) کے گریجوی نہرو کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر امت بھاردواج کے شعری مجموعہ 'محبت میں ڈوبا لڑکا' کا رسم اجرا کیا۔ کتاب کے رسم اجرا کے موقعے پر اپوزیشن لیڈر وجیندر گپتا، اسمبلی سکریٹری پرسنا کمار سوریہ دیورا سمیت ممبران اسمبلی اور افسران موجود تھے۔ اس موقعے پر نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا کہ زندگی کی شاعری کسی اصول کو نہیں مانتی۔ کتاب میں انتہائی معاشرے کی بنیاد پر لکھی گئی نظمیں ہیں کہ کیسے قصبے سے آیا ہوا آدمی محبت میں صرف ڈوبا ہے، ٹوٹا نہیں۔ اسمبلی اسپیکر رامنواس گوئل نے کہا کہ جدید دور میں ادب میں جس پر سب سے زیادہ برا اثر پڑا ہے وہ شاعری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کویتاؤں کی درس و تدریس صرف اسکول اور کالج سطح کے کورس تک محدود رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود شاعری لکھنا اور اس کو شائع کروا پانا قابل ستائش کام ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 اگست 2017

مجھے کچھ کہنا ہے

نئی دهلی: این سی آر اولڈ فرید آباد کے سیکٹر 16 میں واقع QRG اسپتال کے آڈیٹوریم ہال میں ابھینندن ساہتیہ اور کلا سنگم کے زیر اہتمام امردیپ اوبرائے کے دیوناگری میں شائع ہوئے شعری مجموعے 'مجھے کچھ کہنا ہے' کا جشن اجرا عمل میں آیا، اور اردو و ہندی شعرا و شاعرات پر موقوف بہترین مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت تنظیم کے صدر مکیش گمبھیر نے کی اور نظامت ابھینندن کی جنرل سکریٹری معروف اردو دوست شاعرہ کویتری نیتا راکیش نے بحسن خوبی انجام دی۔ اس موقعے پر فرید آباد سے باہر کے شعرا اور اہم شخصیات کا پھولوں سے خیر مقدم کیا گیا اور تنظیم کے کارکنان و پروگرام کا خاص حصہ بنے کپل ملک و مہمانان و دیگر کو مومنٹو پیش کیے گئے۔ جن شعرا و شاعرات نے اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں رئیس مظفر نگری، ثروت جمال لکھنوی، قمر بدر پوری، حبیب سیفی، مکیش گمبھیر، امردیپ اوبرائے، درد دہلوی، مجیب قاسمی، سلیم سہانوی، راکیش نمت، سنیتا رینا، دیویا، نیتا راکیش، مدھوکر، جیوراتا، انواندو، پردیپ پراگ، ایم ایل گرگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کا آغاز یوم آزادی پر مبنی گیت، یہ میرا ہندوستان ہے، سے کیا گیا۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مدعوئین میں اشونی پربھاکر CEO، ڈاکٹر شرد کوشک ڈائرکٹر این جی ایف کالج پلول، اور رئیس مظفر نگری سابق کمشنر کمرشیل ٹیکس یوپی شامل ہوئے جنھوں نے مجموعہ کلام پر اظہار خیال کیا اور ابھینندن کی جانب سے ہونے والی ادبی و ثقافتی و تہذیبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اگست 2017

فلک نشیں

بنگلور: ہوٹل سویری میں قاری فضل الرحمٰن کے شعری مجموعہ 'فلک نشیں' کی رسم اجرا تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ مجموعۂ کلام کے رسم اجرا کی مناسبت سے آل انڈیا مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر کرناٹک کے وزیر برائے شہری ترقیات اور حج آر روشن بیگ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قاری فضل الرحمٰن انجم باپوڑی کی شاعری ہمارے عہد کی کڑواہٹوں کو مسکراہٹوں کی راہوں پر لے جانے کی راہیں دکھاتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک دانشورانہ سنجیدگی ہے جو افراد سازی میں نمایاں کردار ادا کرسکتی ہے۔

مسٹر روشن بیگ نے مزید کہا کہ اردو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور مشاعرے اردو ادب کا گہوارہ، اس شیریں زبان کی بقا ہمارا فریضہ ہے۔ انھوں نے 'فلک نشیں' کی تخلیقات کی ستائش کی اور کہا کہ یہ شاید پہلی ایسی شعری کتاب ہوگی جس میں غزل غلو سے پاک ہے اور معشوق کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتی ہے۔ پروگرام کی صدارت حافظ کرناٹکی اور نظامت سہیل نظامی نے کی۔ پروگرام کا اہتمام کونک مارٹ نے کیا جب کہ کنوینر محمد رفیع دھاروا ڑ کررہے۔ حاضرین نے دوران پروگرام قاری فضل الرحمٰن انجم کی گلپوشی کرکے ان کے نئے مجموعہ کلام کے اجرا کی مبارکباد دی۔ جبکہ ڈاکٹر اظہار افسر نے سپاس نامہ پیش کیا۔ پروگرام میں کثیر تعداد میں شائقین اور سامعین موجود تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 اگست 2017

یہ ہے انشائیہ

ناگپور: 'انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں انشائیہ نگار اظہار خیال کرتے ہوئے، کسی مجذوب کی طرح اپنے خیالات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے لیکن وہ اپنے موضوع

سے جڑا رہتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں سماج کی عکاسی اور دل کو چھو لینے والی اس کی انوکھی سوچ، ہمیں زندگی کے بارے میں نئے انداز سے غور کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

نامور محقق، ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے، ان خیالات کا اظہار، معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ کی نئی کتاب' یہ ہے انشائیہ' کی رسم اجرا کے موقع پر کیا ہے۔ بزم اردو ناگپور کے تعاون سے، اس تقریب کا انعقاد عمل میں آیا، جس کی صدارت کے فرائض مشہور محقق و ناقد ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے انجام دیے۔ افسانہ نگار، ڈاکٹر اظہر ابرار نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ' اس سے قبل محمد اسد اللہ کی کتاب انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب میں' شائع ہو چکی ہے جس میں انھوں نے اس صنف پر تحقیق کرکے انشائیہ کے خدو خال واضح کیے جسے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ 'یہ ہے انشائیہ'، میں منتخب انشائیہ نگاروں کی تخلیقات ، مغربی اور مراٹھی انشائیوں کے تراجم اور انشائیہ سے متعلق تنقیدی مضامین و مباحث شامل ہیں، یہ دونوں کتابیں انشائیہ نگاری کے فروغ کے سلسلے میں اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ چوپال کے طرز پر منعقد کی گئی کسی مجلس میں انشائیوں سے متعلق کتاب کا اجراء، ایک انوکھا خیال ہے، یہ انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔

جاوید حسین نے رسم شکریہ ادا کی اور ڈاکٹر اظہر ابرار نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز: توصیف احمد، بزم اردو، ناگپور، مہاراشٹر 11 ستمبر 2017

مجلّہ نقوش کہکشاں

نئی دھلی: مشرقی دہلی کے سیلم پور اسمبلی حلقے کی سماجی و ادبی اور فلاح و بہبودی تنظیم عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے نو سال مکمل ہونے پر سالانہ رپورٹ کی شکل میں نقوش کہکشاں کے نام سے مجلّہ منظر عام پر آیا ہے، سکریٹری ریاض احمد شمسی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مطابق عوامی ایکتا نے جن دوسری تنظیموں کی عوامی تحریکوں کے ساتھ مل کر سماجی اور فلاح و بہبود کے کام ملک کے دیگر صوبوں میں انجام دیے ان کا بھی تفصیلی ذکر مع تصویروں کی زبانی شامل ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ گذشتہ روز دہرادون میں نقوش کہکشاں کے تازہ انشو کی رسم رونمائی کی تقریب میں حصہ لینے والوں کے اسمائے گرامی میں ڈاکٹر سید فاروق، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کلکتہ، ڈاکٹر عمید الدین تمل ناڈو، اور سرپرست اعلیٰ عوامی ایکتا ویلفیئر ڈاکٹر سید احمد خان کے ساتھ جنرل سکریٹری حکیم عطاء الرحمٰن اجملی قابل ذکر ہیں جنھوں نے مفصل انداز میں سال گذشتہ کی کارگزاریوں کا تذکرہ کیا۔ تنظیم کے قیام کا مقصد تعلیم، صحت اور معاشرے کے خدمت ہے، اسی جذبے کی قدر کرتے ہوئے ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر ظفر محمود نے اپنا بیش قیمتی تعاون دیا۔ جہاں تک بذریعہ اردو تعلیم کو عام کرنے اور بچوں میں تعلیم کا جذبہ پیدا کرنے نیز اردو کے فروغ کی بات ہے تو اوریکل پبلک اسکول محمودیہ ماڈرن پبلک اسکول، ایم آر ڈی میموریل اسکول، مجیدیہ ماڈل اسکول اور سینٹ مورل کڈس اسکول قابل ذکر ہیں جن کے تعاون سے عوامی ایکتا اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے سرگرم عمل ہے، اور پڑھو آگے بڑھو کے مشن پر گامزن ہے، معاونین میں قاری محمد آصف، مولانا جاوید صدیقی، محمد تہمیر شامل ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 اگست 2017

بکھری اکائیاں

دربھنگہ: المنصو ر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام دمری منزل، ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلکس، سبھاش چوک لال باغ دربھنگہ میں یوم آزادی کے موقعے پر رسم اجرا و طرحی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر اور منور عالم راہی نے مشترکہ طور پر کی۔

پروگرام میں بہ حیثیت مہمان خصوصی رہبر چندن پٹوی اور پروفیسر علاء الدین حیدر وارثی شامل ہوئے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'بکھری اکائیاں' کا اجرا

جبکہ مہمان کے طور پر ڈاکٹر محمد امتیاز اور ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی شامل ہوئے۔ مہمانوں کے ہاتھوں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'بکھری اکائیاں' جس کا انگریزی ترجمہ Assortment of Short Stories کے نام سے محمود احمد کریمی نے کیا ہے، کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ اس موقع پر محمود احمد کریمی نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اب تک تین کتابوں کا انگریزی ترجمہ کر چکا ہوں اور چوتھی کتاب بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے جو جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے اس موقعے پر کہا کہ المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر کی کاوشوں سے آج دربھنگہ شہر کو عالمی اعتبار سے پہچان ملی ہے۔ ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر نے اس موقعے پر کہا کہ نئی کتابوں کے مترجم محمود احمد کریمی صاحب کی ترجمہ شدہ کتاب Assortment of Short Stories ابھی چند دنوں قبل منظر عام پر آئی ہے۔ یہ ایسا ترجمہ ہے جو محمود احمد کریمی کی تازہ فکر اور سچائی کے رنگ کو واضح کرتا ہے۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، دربھنگہ، 16 اگست 2017

ہنسی کے بول گپے

دیوبند: دیوبند اپنی صحافتی اور ادبی خدمات کے لیے دنیائے ادب میں خاص پہچان رکھتا ہے، یہاں کے ادیبوں اور قلم کاروں نے ہر پڑاؤ پر اپنی خدمات اور کاموں کا احساس دلایا ہے۔ پورے ملک میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے نئی نسل کے شاعر ڈاکٹر صادق دیوبندی کی نئی کتاب 'ہنسی کے بول گپے' کی رسم اجرا، شعرا، فضلا، ادیبوں اور معززین شہر کی موجودگی میں انجام پائی۔ رسم اجرا کے موقعے پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے اردو اکادمی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ دیوبند کی تحریری و قلمی خدمات کا جلی عنوان ڈاکٹر صادق دیوبندی کی تخلیق ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات میں ہنسنا بہت آسان ہے لیکن ہنسانا بہت مشکل کام ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر نواز دیوبندی، شمیم مرتضیٰ فاروقی، ارون اگروال، ڈاکٹر شمیم دیوبندی، ماسٹر ممتاز احمد، ضیاء الدین انصاری، ناظم اشرف کرتپوری، سید وجاہت شاہ، کے پی انمول اور ڈاکٹر ندیم احمد کو اعزاز سے نوازا گیا۔ پروگرام کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کی اور نظامت کے فرائض معروف قلم کار کمل دیوبندی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 اگست 2017

سہ ماہی اسباق

سولاپور: بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ جلسۂ تہنیت و مشاعرے میں معروف افسانہ نگار، صحافی و اسکالر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی (نیویارک) کے ہاتھوں سہ ماہی اسباق پونہ کے گوشۂ جنید شیخ کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ شیخ جنید عبدالقیوم، سوشل اردو ہائی اسکول میں معاون معلم ہیں اور سائنسی قلم کار ہیں۔ مسلم سائنسدانوں کی سائنسی خدمات اور انسانی جسم کے اہم اندرونی اعضاء۔ ان کی یہ کتابیں منظر عام پر آگئی ہیں۔

پریس ریلیز: شیخ جنید، سولاپور، مہاراشٹر، 5 اگست 2017

وفیات:

چندر کانت دیوتالے

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ہندی کے شاعر چندر کانت دیوتالے کا 15 اگست کو انتقال ہوگیا۔ وہ 81 سال کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی

اہلیہ کا انتقال کچھ سال پہلے ہوگیا تھا۔ وہ گذشتہ ماہ سے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل تھے۔ مدھیہ پردیش کے بیتول ضلع کے جول کھیڑا میں 7 نومبر 1936 میں پیدا ہوئے۔ مسٹر دیوتالے 1960 کی دہائی میں 'اکویتا تحریک' کے ساتھ ابھرے تھے اور 'لکڑ بگھا ہنس رہا ہے'

سے معروف ہوئے۔ ہندی میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے 'لبرٹی' پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ اندور میں ایک کالج سے استاد کے طور پر ریٹائرڈ ہونے کے بعد فری لانس لکھ رہے تھے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ مدھیہ پردیش اعلیٰ اعزاز اور میتھلی شرن گپت ایوارڈ ملا تھا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 اگست 2017

پروفیسر یوسف تقی

کلکتہ: اردو کے ایک اہم شاعر، معتبر ناقد و محقق اور کلکتہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر یوسف تقی کا 3 ستمبر 2017 کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال

ہوگیا۔ ان کی عمر 74 برس تھی۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا اور کلکتہ کی علمی و ادبی اور سماجی و تہذیبی محفلیں سونی ہوگئیں۔ بحیثیت استاد انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی وفکری آبیاری کی اور ان کی نگرانی میں طلبا و طالبات کی کثیر تعداد پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سرفراز ہوئی ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے اردو ادب میں ان کی شناخت مستحکم رہی ہے۔ اردو کے معتبر محققوں اور اہل نظر نے ان کے کارہائے نمایاں کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔ ان کی تحقیقی کتابوں میں 'مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعرا'، 'مثنوی جہاں شاہ و جہاں بانو'، 'مطالعۂ غزلیات طپش'، 'ترقی پسند تحریک اور اردو نظم'، 'بنگال میں اردو ناول'، 'تحمیص و تجزیہ'، 'ل۔احمد اکبرآبادی' وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور کئی کتابیں اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'خشک ٹہنی زرد پتے' کے نام سے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں زوجہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 4 ستمبر 2017

پروفیسر اسلم پرویز

نئی دهلی: دہلی کے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں برسوں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے والے پروفیسر اسلم پرویز 6 ستمبر کو اپنی رہائش گاہ ترکمان گیٹ پر انتقال کرگئے۔ انھیں دہلی گیٹ واقع جدید قبرستان انجمن اسلام میں سپرد خاک کردیا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی نشا اور ایک بیٹا نوید ہیں۔ موصوف نے ایم اے تک کی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی تھی۔ بعدازاں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی زیر نگرانی 'بہادر شاہ ظفر' پر نہایت پرمغز مقالہ تحریر کیا جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اس کے علاوہ 'انشاء اللہ خاں انشا'، مجموعہ 'گنجینۂ معنی کا طلسم' اور متفرق مضامین کا ایک مجموعہ 'تحریریں'، 'پہلا ورق' اور شعری مجموعہ 'چندن کا پیڑ' شائع ہوکر منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ 85 برس کے بزرگ اسلم پرویز کا شمار اردو کے معروف ادیبوں و شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے رسالہ سہ ماہی 'اردو ادب' کے اداریوں کے ذریعے اردو کی نئی نسل کی آبیاری کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے اردو زبان و ادب پر اہم تحقیق کو اپنی نگرانی میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اپنی تحریروں سے اردو ادب کی دنیا میں منفرد مقام قائم کیا۔ مرحوم کی تدفین بعد نماز مغرب دہلی گیٹ کے قبرستان میں عمل میں آئی جس میں اردو کی بڑی ہستیاں و شاگرد موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 ستمبر 2017

خراج عقیدت:

عتیق مظفر پوری کی دوسری برسی

نئی دهلی: اردو صحافت کے موجودہ حالات پر فکر کرنے اور ان کو بہتر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ اردو اور اردو صحافت کو زندہ رکھنے کے لیے سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار فتح پوری شاہی جامع مسجد کے امام ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے معروف صحافی اور شاعر عتیق مظفر پوری مرحوم کی دوسری برسی کے موقعے پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام 'ملک کی ترقی میں اردو صحافت کا رول' کے عنوان سے منعقد مذاکرہ کے دوران کیا۔ بحیثیت صدر اپنی تقریر میں ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے اردو صحافت اور اردو زبان کو درپیش مختلف مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر مہمانانِ خصوصی کے طور پر آل انڈیا امام آرگنائزیشن کے چیف امام مولانا ڈاکٹر عمیر الیاسی، ڈاکٹر تسلیم رحمانی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین حاجی اشراق خان کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عتیق مظفر پوری مرحوم کے ساتھ دلی کی صحافت کا ایک دور وابستہ ہے۔ ان کے حوالے سے اس دور کی صحافت کو یاد کرنے اور آج کی صحافت کس طرف جارہی ہے پر بات کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مولانا عمیر الیاسی نے عتیق مظفر پوری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انسان چلا جاتا ہے لیکن اس کی یادیں باقی رہتی ہیں۔ وہ اپنے کاموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تسلیم رحمانی نے کہا کہ صحافی ہوتے ہوئے سماجی طور پر متحرک ہونا مشکل ہے لیکن عتیق مظفر پوری میں یہ خوبی تھی۔ اس ملک میں اردو صحافت سے ہی صحافت کا آغاز ہوا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند دہلی کے ناظم اعلیٰ مولانا جاوید صدیقی قاسمی نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر جاوید رحمانی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اگست 2017

ڈاکٹر شمیمہ رضوی کی 8ویں برسی

لکھنؤ: مسیحا اردو سوسائٹی، احباب فاؤنڈیشن، علامہ شبلی نعمانی میموریل ہیلپ لائن، ووکیشنل انڈسٹریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، ایکتا سیوا کمیٹی، انت سیوا کمیٹی کے زیر اہتمام ایک یادگاری پروگرام کا انعقاد بیاد ڈاکٹر شمیمہ رضوی کی آٹھویں برسی کے موقعے پر اکادمی آف ماس کمیونکیشن

(سابق اردو اکادمی) کی بلڈنگ قیصر باغ میں کیا گیا۔ پروگرام میں افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الدین خان نے ڈاکٹر شمیمہ رضوی کے بارے میں گفتگو کی۔ جلسے کی صدارت پدم شری پروفیسر آصف زمانی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، شعبہ اردو کے صدر پروفیسر سید شفیق اشرفی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر شمیمہ رضوی پر اظہار خیال کرنے والوں میں معروف ومشہور سماجی کارکن وسیم حیدر، محمد خالد، امیر الدولہ پبلک لائبریری کی سابق لائبریرین ڈاکٹر نصرت ناہید، لکھنؤ یونیورسٹی کی لکچرر ڈاکٹر شبانہ اعظمی، نمایاں ادیب تلکج مشرا، ممتاز افسانہ نگار راجیو پرکاش ساحر، قاری سید شاہ فیصل وغیرہ شامل ہیں۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان مسیح نے کی۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آصف زمانی نے کہا کہ اس غم کے موقعے پر خوشی ہورہی ہے کہ 6 سوسائٹیز نے مشترکہ طور پر اس جلسے کا اہتمام کیا۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر سید شفیق اشرفی نے کہا کہ شمیمہ رضوی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 21 اگست 2017

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات
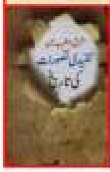
مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

مصنف: ایس۔ایم۔خان
مترجم: سید وجاہت مظہر
صفحات: 166
قیمت: 125 روپے

قدیم علم الامراض
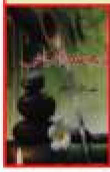
مصنف: ملک وامق امین
صفحات: 131
قیمت: 50 روپے

کردار اور افسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)

مصنف: عبدالقادر سروری
صفحات: 118
قیمت: 75 روپے

اصولِ افسانہ نگاری

مصنف: اویس احمد عزیز
صفحات: 86
قیمت: 65 روپے

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہارگلشن کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ ومولفہ: پنڈت برج کشن کول
وپنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 537،454
قیمت: 275، 300 روپے

دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں (مونوگراف)

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج (مونوگراف)
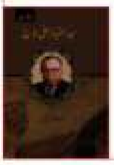
مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری (مونوگراف)

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

حسن نعیم (مونوگراف)

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 143
قیمت: 85 روپے

آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)

مرتب: یعقوب یاور
صفحات: 460
قیمت: 215 روپے

فدائے لکھنؤ

مصنف: پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور
صفحات: 182، قیمت: 100 روپے

رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 84
قیمت: 22 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October-2017, Vol.19, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025